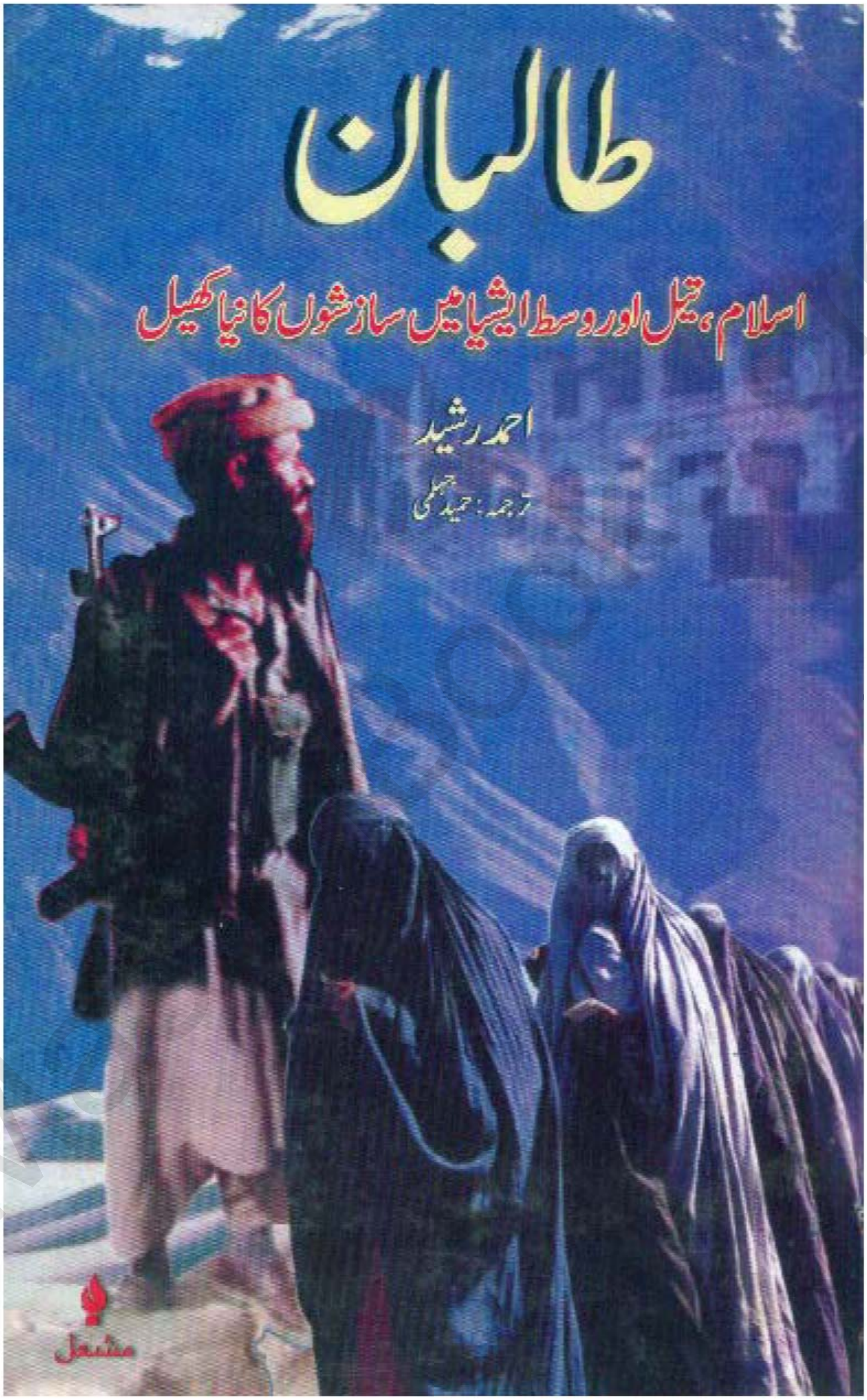
طالبان
اسلام، تیل اور وسط ایشیا میں سازشوں کا نیا کھیل
احمد رشید
ترجمہ: حمید جہلمی
مشعل

طالبان

اسلام، تیل اور وسط ایشیا میں سازشوں کا نیا کھیل

احمد رشید
ترجمہ: حمید جہلمی

کاپی رائٹ اردو© 2011 مشعل
کاپی رائٹ انگلش © احمد رشید، 2000

یہ کتاب آئی بی ٹورس اینڈ کمپنی لمیٹڈ، لندن کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے۔ کتاب کا انگریزی نام
Taliban: Islam, Oil and the New Great Game in Central Asia
ہے اور اسے آئی بی ٹورس اینڈ کمپنی لمیٹڈ، نے شائع کیا ہے۔

ناشر: مشعل
آر بی ۵، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ 54600، پاکستان
فون و فیکس: 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

ترتیب

پیش لفظ 7

نقشے 13

دیباچہ 15

حصہ اول: طالبان تحریک کی تاریخ 31

قندھار 1994 33

طالبان کے ماخذ

ہرات 1995 51

اللہ کے ناقابل تسخیر سپاہی

کابل 1996 65

دین داروں کا رہبر

مزار شریف 1997 83

شمال میں قتل عام

بامیان 1998-99 99

کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ

حصہ دوئم: اسلام اور طالبان 115

MashalBooks.org

اسلام کے لئے چیلنج 117

طالبان کی نئی طرز کی بنیاد پرستی

خفیہ سوسائٹی 133

طالبان کی سیاسی اور فوجی تنظیم

ایک نایاب جنس 145

عورتیں، بچے اور طالبان کلچر

منشیات اور طالبان کی معیشت 161

عالمی جہاد 176

عرب، افغان اور اسامہ بن لادن

حصہ سوئم: سازشوں کا نیا کھیل 193

آمر اور تیل کے ٹھیکے دار 195

طالبان، وسطی ایشیا، روس، ترکی اور اسرائیل

طالبان کا رومانی پیکر 213

پائپ لائنوں کے لئے جنگ 1994۔96ء

طالبان کا رومانی تصور 231

پائپ لائنوں کے لئے جنگ اور امریکہ اور طالبان 199۔99ء

MashalBooks.org

آ قا یا مظلوم 249
پاکستان کی افغان جنگ

شیعہ بمقابلہ سنی 265
ایران اور سعودی عرب

حرف آخر 279
افغانستان کا مستقبل

ضمیمہ 1 292
1966ء میں کابل پر قبضے کے بعد عورتوں اور دیگر ثقافتی مسائل

کے بارے میں طالبان کے فرامین

ضمیمہ 2 297
طالبان کا ڈھانچہ

ضمیمہ 3 304
طالبان کے سلسلہ وار واقعات

ضمیمہ 4 320
سازش کا نیا کھیل

MashalBooks.org

انتساب

اپنی والدہ کے نام
میں وہ دیکھا جیسے دیکھنا
انہوں نے سکھایا
اور
انجلیز کے نام

MashalBooks.org

پیش لفظ

مجھے یہ کتاب لکھنے میں ۲۱ برس لگے ہیں۔ میں اتنا ہی عرصہ افغانستان کے احوال کے بارے میں رپورٹنگ کرتا رہا ہوں۔ سچی بات ہے کہ افغانستان میں جنگ نے میری زندگی کے اتنے ہی برس لے لئے، خود پاکستان میں اتنا کچھ ہو رہا تھا، جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔ پھر وسطی ایشیا تھا، سوویت یونین ختم ہو رہا تھا، غرض لکھنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ لیکن افغانستان میری توجہ کا مرکز بنا رہا، آخر کیوں؟ زمانہ امن یا حالت جنگ، دونوں ہی میں افغانستان اور افغان عوام کو غیر معمولی اہمیت اور حیثیت حاصل رہی۔ افغان عوام اس صدی میں ایک بہت ہی بڑے المیے سے دوچار ہوئے، طویل خانہ جنگی نے افغانوں پر بڑی مصیبتیں ڈھائی ہیں۔ ان کی روداد اور کردار، تضادات کا مجموعہ ہے، وہ بہادر ہیں، باوقار ہیں، ذی شان ہیں، فیاض ہیں، مہمان نواز ہیں، خوش خلق ہیں، وجیہ اور خوبرو ہیں، لیکن ان میں ان سب کے برعکس کچھ خصلتیں بھی ہیں۔ اس سلسلے میں افغان مردوں اور عورتوں میں چنداں فرق نہیں، سختی پر اتر آئیں تو خون آشام ہونے میں انہیں دیر نہیں لگتی اور اس حالت میں کوئی بھی ناپسندیدہ حرکت کر سکتے ہیں۔ ایرانیوں، منگولوں، انگریزوں اور روسیوں نے افغانستان اور افغانوں کو سمجھنے میں صدیاں بتا دیں لیکن نہیں سمجھ سکے۔ اس سعی اور کاوش کے سبب سے ہی ''افغان بینی'' نے فن کا

MashalBooks.org

درجہ حاصل کر لیا۔ کچھ برسوں سے پاکستان نے بھی ایسی ہی روش اختیار کر رکھی ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ باہر کی کوئی طاقت، افغانوں کو زیر کر سکتی ہے اور نہ انہیں اپنا تابع بنا سکتی ہے۔ بیسویں صدی کے دوران افغانستان نے دو بڑی طاقتوں، سوویت یونین اور برطانیہ کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ گزشتہ ۲۱ برس کے دوران افغانوں کو جنگ و جدل کے سبب سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا، پندرہ لاکھ افغان لقمہ اجل بنے اور افغانستان تباہ ہو گیا لیکن کوئی طاقت اسے اپنے زیر نہیں کر سکی۔

افغانستان سے میرے تعلق خاطر میں مقدر کا بھی دخل ہے۔ کئی بار میں صحیح وقت پر، صحیح جگہ جا پہنچا۔ ۱۹۷۸ء میں میں نے کابل میں کئی ٹینکوں کو بڑی گھن گرج کے ساتھ، صدر محمد داؤد کے محل کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہ صدر داؤد کے خلاف بغاوت اور افغانستان کی تباہی کا آغاز تھا۔ ایک برس بعد میں قندھار کے ایک بازار میں چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ سوویت ٹینک آ گئے۔ سوویت یونین اور مجاہدین میں جنگ چھڑ گئی، میں اس کی رپورٹنگ میں لگ گیا۔ اسی عرصے میں میرے اہل خاندان نے مجھ سے افغانستان پر کتاب لکھنے کو کہا۔ کئی اور بھی صحافی افغانستان پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ میں نے ہاتھ روکے رکھا۔ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ سوال یہ تھا کہ کہاں سے شروع کروں؟ ۱۹۸۸ء میں اقوام متحدہ نے جنیوا میں مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔ جو پایان کار افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء پر منتج ہوا۔ اسی دوران میں نے افغانستان پر کتاب لکھنے کا ارادہ باندھا۔ اس وقت اس بدقسمت ملک کی ابتلاء اور آزمائش کی منظر کشی کرنے کے لئے کم وبیش دو سو صحافی موجود تھے۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھئے کہ مجھے اقوام متحدہ امریکہ، سوویت یونین، پاکستان، ایران اور افغانستان کے سفارتی نمائندوں کے درمیان ہونے والے خفیہ مذاکرات کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں، جو مجوزہ کتاب کے لئے اچھا خاصا مواد بن سکتی تھیں، لیکن افغانوں سے میرے تعلق خاطر نے میرا ہاتھ روکے رکھا، جنیوا میں طے پانے والے معاہدوں کے نتیجے میں افغانستان

میں امن کی بحالی اور قیام کی نوبت اس لئے نہ آ سکی کہ افغان خوں ریز اور بے مقصد خانہ جنگی میں ایسے الجھے کہ اب تک اس سے نہیں نکل سکے۔

میں افغانستان سے نکلا اور وسطی ایشیا جا پہنچا، میں افغانوں کے اجداد سے ملنے، ان کے اطوار وخواص جاننے اور گرد و پیش پر ان کے اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ، سوویت یونین کا شیرازہ بکھرتا دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے وسطی ایشیا کی ریاستوں کے بارے میں کتاب بھی لکھی، مگر میرا دل افغانستان میں اٹکا ہوا تھا۔ سو میں اس کی طرف لوٹ آیا۔

۱۹۹۲ء میں جب نجیب اللہ کی حکومت ختم ہوئی اور کابل پر مجاہدین کا قبضہ ہوا تو میں وہیں تھا، کئی بار گولیاں میرے کانوں کے پاس سے سنسناتی گزر گئیں، یہ سب کچھ کتاب کا موضوع بن سکتا تھا۔ افغانستان کی ابتداء کے حوالے سے میں نے ماسکو، واشنگٹن، روم، جنیوا، پیرس، لندن، اشک آباد، تاشقند اور دوشنبے کا سفر کیا۔ اسی دوران افغانستان میں طالبان ابھرے۔ ان کا برق آسا عروج حیران کن تھا۔ طالبان کی طرفہ حیثیت اور ان کے بارے میں ثقہ معلومات کی کمی نے مجھے تحریک کی کہ میں افغانستان کی پچھلے ۲۱ برس کی تاریخ اور اس سے اپنی وابستگی کا قصہ بیان کروں۔

میں واحد پاکستانی صحافی ہوں جس نے افغانستان کے بارے میں پوری سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ لکھا، افغانستان میں جنگ لگی تو وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا محور بن گیا تھا، وہ صدر جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کی بقاء کا وسیلہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۲ء سے میرا یقین تھا کہ اسلام آباد نے افغانستان کے متعلق جو پالیسی وضع کر رکھی ہے، وہ آگے چل کر پاکستان کی قومی سلامتی، ملکی سیاست اور اسلامی بنیاد پرستی سے متعلق مسائل پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ آج جب پاکستان، سیاسی، اقتصادی اور سماجی تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے،، منشیات، ناجائز اسلحے، بدعنوانی، کرپشن اور تشدد کے کلچر نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ افغانستان میں رونما ہونے والے واقعات

کا اس پر اور زیادہ اثر ہوتا ہے۔

میں نے جو کچھ لکھا، پاکستان کے پالیسی سازوں نے شاید ہی کبھی اس سے اتفاق کیا ہو، صدر ضیاء الحق سے اختلاف کرنا آسان نہیں تھا۔ ۱۹۸۵ء میں صدر ضیاء الحق کی خفیہ ایجنسیوں نے مجھ سے کئی گھنٹوں تک پوچھ گچھ کی اور مجھے تنبیہ کی کہ میں چھ مہینوں کے لئے کچھ بھی نہ لکھوں، یہ سب کچھ میری تنقید اور حرف گیری سے بچنے کا حیلہ تھا، لیکن میں باز نہیں آیا، میں بدستور قلمی نام سے لکھتا رہا، میرا فون ٹیپ ہوتا رہا اور میری نقل وحرکت کی مسلسل نگرانی کی جاتی رہی۔

افغانستان، خود افغانوں کی طرح ایسے تضادات کا حامل ہے، جو کسی بھی رپورٹر کو صحیح نتائج اخذ کرنے نہیں دیتے، گلبدین حکمت یار نے، جو انتہا پسند مجاہدین کے قائد ہیں، مجھے کمیونسٹوں کا ہمدرد ہونے کے الزام میں موت کی سزا کا حکم سنایا۔ یہی سزا بی بی سی کے جارج آرنی کے لئے بھی تجویز کی گئی، ایک برس تک میرا نام اشتہاری مجرم کے طور پر اخبار میں چھپتا رہا۔ ایک بار کابل کے ایک بازار میں لوگوں نے میرا تعاقب کیا۔ وہ مجھے مار دینا چاہتے تھے۔ ہوا یوں کہ حکمت یار کی طرف سے چلائے گئے ایک راکٹ سے دو افغان بچے ہلاک ہو گئے۔ میں ان کے بارے میں خبر لینے گیا تھا۔ لوگوں نے مجھے حکمت یار کا ایجنٹ سمجھا۔ ان کے خیال میں، میں راکٹ سے ہونے والی تباہی کا جائزہ لینے گیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں نجیب اللہ کی بدنام خفیہ تنظیم خاد نے مجھ سے پوچھ گچھ کی، خاد سوویت یونین کی، کے۔جی۔بی کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ اس کے آدمیوں نے مجھے کابل کے ڈاک خانے میں ''ٹائم'' رسالے کا وہ شمارہ پڑھتے دیکھ لیا، جسے ضبط کرلیا گیا تھا۔ مجھے گرفتار کیا گیا۔ بڑی مشکل سے رہائی ملی۔ بعد میں جب نجیب اللہ صدر بنا تو میں نے اس کا کئی بار انٹرویو کیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے نام اس کا مصالحتی پیغام لے جا سکتا ہوں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ بے نظیر بھٹو میری نہیں سنیں گی۔ ایسا ہی ہوا۔ کئی مرتبہ کمیونسٹ دستوں اور مجاہدین کی جھڑپ میں جب گولیاں برس

رہی تھیں، میں ان کی زد میں آ گیا۔ کئی بار طالبان اور احمد شاہ مسعود کے ٹینکوں کی ایک دوسرے پر گولہ باری میں بھی گھر گیا اور بمشکل جان بچا سکا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بہادر نہیں ہوں، بعض لوگوں، خاص طور پر افغانوں کی مدد کے بغیر شاید میں افغانستان سے اپنی دلچسپی برقرار نہ رکھ سکتا۔ میرے مددگاروں میں طالبان، ان کے مخالفین، ٹیکسی ڈرائیور، دانشور، مزدور، کسان اور کئی دوسرے لوگ شامل تھے۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ افغانوں کے علاوہ مجھے سب سے زیادہ مدد پاکستان کے وزیروں، سفارت کاروں، جرنیلوں، بیورو کریٹوں اور خفیہ ایجنسیوں کے افسروں سے ملی، جو شاید مجھے اپنے اثر میں لینا چاہتے ہوں یا پھر میرے خیالات سے اتفاق کرتے ہوں۔ ان ہی میں سے کئی ایک میرے بہت پکے دوست بن گئے۔ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں اور غیر سرکاری تنظیموں نے مجھے افغانستان میں جگہ جگہ رہنے اور ٹھہرنے میں مدد دی۔ اطلاعات فراہم کیں، میری دستگیری کی، انسانی امداد میں مصروف اداروں سے رابطے کے لئے کام کرنے والے اقوام متحدہ کے دفاتر کے سربراہوں مارٹن باربر، الفریڈ وو ٹسچی سسٹری، ایرک ڈی مل اور برگٹ نیو باسر کا خاص طور پر شکر گزار ہوں۔ یہ سبھی افغانستان میں اتنا ہی عرصہ خدمات انجام دیتے آ رہے تھے جتنا عرصہ میں نے صحافی کی حیثیت سے افغانستان میں قیام کیا۔ مہاجرین کے لئے اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن سے وابستہ رابرٹ وان لیون، شمس الباری، سری وجارتنے، جیکوس موشٹ، روپرٹ کال ولی اور مانی کیوملہا کے لئے بھی میرے دل میں تشکر اور ممنونیت کا جذبہ موجود ہے۔ ورلڈ فوڈ پروگرام کے انتھک ایڈن ایڈر جتنا طالبان کے بارے میں جانتے تھے، کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا۔ افغانستان کے لئے اقوام متحدہ کے خصوصی مشن کے فرانسیس او کیولو، جیمز نگوبھی، ہیروشی ٹاکا ہاشی، آرنلڈ شیفرڈ یکر اور انڈر یوٹیسوری اور نیویارک میں اقوام متحدہ بینن سیون اور انڈریو گلی مور، ریڈ کراس کی انٹرنیشنل کمیٹی کے تھامس گرٹنر اور اولیورڈر، ایجنسی میں فریڈرک روسیو اور میری پیری کیلیے اور بچوں کو بچاؤ کے ادارے کے اینڈریو وکڈر اور

صوفی ایلیوسن میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے خصوصی نمائندے لخدار براہیمی کا ان کے نقد و نظر کے لئے سپاس گزار ہوں۔

میں نے سولہ برس تک افغانستان کے بارے میں فار ایسٹرن ریویو کے لئے رپورٹنگ کی ہے۔ میں اس رسالے کے ایڈیٹروں، خاص طور پر نیوان چنڈا کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے میری رپورٹوں کو اپنے میگزین میں نمایاں جگہ دی۔ افغانستان کی جنگ کے بارے میں رپورٹیں بھیجنے پر آمادہ رکھنے کے لئے انہوں نے مجھے سفر خرچ سمیت تمام ضروری اسباب مہیا کیے، افغان جنگ جو برسوں تک عالمی افق پر نمایاں رہی، اب ایشیا کے ایک کونے پر محض سلگ رہی ہے۔ اس کی پہلی سی آب و تاب باقی نہیں۔ رسالے کے سابق فارمین ایڈیٹر وی جی کل کرنی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ۱۹۹۷ء میں اپنا بہت کچھ داؤ پر لگا کر رسالے کے سرورق پر چھپنے والی میری رپورٹ کے بارے میں مالکوں کا شک دور کیا اور انہیں یقین دلایا کہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے درمیان تیل اور گیس کی پائپ لائن کی جنگ ''گریٹ گیم'' قرار دیئے جانے کی مستحق ہے۔ دوسرے فارن ایڈیٹر اینڈریو والر اور اینڈریو شیری نے بھی اپنے پیش رو کی روایت کو زندہ رکھا۔ ڈیلی ٹیلی گراف کے فارین ایڈیٹر نگل ویڈ، پیٹرک بشپ اور سٹیفن رابنسن بھی شکریے کے سزاوار ہیں، اس لئے کہ انہوں نے افغانستان کو بھلایا نہیں، اسے یاد رکھا اور اس کے بارے میں حقائق منظر پر لانے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ بی بی سی کی عالمی سروس، ریڈیو فرانس انٹرنیشنل اور ریڈیو آسٹریلیا کے صحافی ساتھیوں کا بھی ممنون ہوں، جنہوں نے میری رپورٹوں اور تجزیوں کی نشر و اشاعت کا اہتمام کئے رکھا۔ پاکستان میں روزنامہ نیشن کے ایڈیٹر عارف نظامی نے میرا پورا پورا ساتھ دیا، میں نے افغانستان کے بارے میں جو لکھا، انہوں نے کسی تذبذب کے بغیر چھاپا اور انہیں ہمیشہ پہلے صفحے پر نمایاں جگہ دی، وہ سرکاری افسروں کے غصے اور متشددانہ تنقید کو کبھی خاطر میں نہیں لائے۔ ہیرلڈ کی سابق ایڈیٹر شیری رحمٰن بھی میری بھیجی ہوئی رپورٹیں اور تصاویر، نمایاں طور پر چھاپتی

رہیں۔ میں برنٹ روبن کا ضرور ذکر کروں گا، جن کی مدد اور بھرپور حمایت کے بغیر میں وہ کچھ نہ کر سکتا جو کر سکا ہوں۔ میں افغان دانشوروں، صحافیوں اور انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان میں اولیور رائے (OlivierRoy)، نینسی ہیچ ڈوپری، اشرف غنی، ولیم مالے، انڈرس فینجی، سیتھا ماس، اقبال احمد، پٹی گاس مین، عباس فیض، سٹیو لی وائن، ٹونی ڈیوس، ایڈورڈ گراڈٹ، سداو سکائی، ٹم میک گرک، باب نکلس برگ، ملیحہ لودھی، رحیم اللہ یوسف زئی، لیسلی کاک برن، فرانسوار شیپاؤ، جینفر گریفن اور گریچن پیٹرز، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں اسلام آباد اور کابل میں اسوسیٹڈ پریس کی بیورو چیف کیتھی گانن کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے برسوں تک افغانستان کو کوریج دی۔ وہ اپنی اس کارگزاری کی بنا پر کئی پلٹزر انعامات کی مستحق قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان کی پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ ساتھ ان کی فراخدلی، بے نفسی اور بے لوثی کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیے۔ اسلام آباد میں رائٹرز کے یکے بعد دیگرے مقرر ہونے والے سربراہوں جین میکارٹنی، الیسٹر لیون اور اینڈی ہل کا بھی بہت بہت شکریہ۔ سارہ ہنٹ ککی اور ٹارس (Tauris) کا بھی متشکر ہوں، جو افغانستان کے بارے میں رپورٹنگ کے فیصلے اور منصوبے سے کاملاً متفق تھے اور جنھوں نے رپورٹوں کی بروقت اشاعت کا بے عیب بندوبست کئے رکھا۔ یہ کتاب میری بیگم اینجلس اور دو بچوں کے صبر و تحمل، محبت اور مفاہمت کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی تھی۔ انہوں نے گھر سے میری طویل غیر حاضری اور کوچہ گردی کو برداشت کیا اور افغانستان کے لئے میرے جذبات کو سمجھا اور ان کی قدر کی۔

احمد رشید (لاہور)

دیباچہ

افغانستان کے پاکباز شجاع

یہ موسم بہار کی ایک گرم سہ پہر تھی۔ قندھار کے دکاندار اپنی دکانیں بند کر رہے تھے، اگلے روز چھٹی تھی۔ تنومند اور باریش قبائیلی پٹھان، کالی پگڑیاں باندھے، تنگ اور گرد آلود گلیوں میں سے ہوتے ہوئے شہر کے فٹ بال سٹیڈیم کی طرف جا رہے تھے۔ سٹیڈیم مین بازار کے عقب میں تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹے بچے، جن میں اکثریت یتیموں کی تھی، شور مچاتے، اچھلتے کودتے، بھاگم بھاگ گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ لگتا تھا وہ کوئی بہت بڑا تماشہ دیکھنے جا رہے ہیں۔

یہ 1997ء اور مارچ کا مہینہ تھا۔ گزشتہ ڈھائی برس سے قندھار پر طالبان کا قبضہ تھا۔ انہوں نے اسے اپنا دارالحکومت قرار دے دیا تھا۔ افغانستان کا دوتہائی رقبہ، طالبان کے زیرنگیں آ چکا تھا اور اب وہ باقی ماندہ علاقے فتح کرنے کے لئے جہد آزما تھے۔ 1980ء کے عشرے میں بہت کم طالبان سوویت سرخ فوج سے لڑے تھے، ان کی جنگ صدر نجیب اللہ سے تھی، جو افغانستان سے 1989ء میں سوویت فوج کے انخلاء کے بعد بھی چار برس سے اقتدار پر قابض تھا۔ طالبان پاکستان میں قائم افغان مہاجر کیمپوں کے سیکڑوں، دینی مدرسوں میں دینی تعلیم پا رہے تھے۔ ان کی اکثریت کو سوویٹ فوجوں سے نبرد آزما ہونے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ 1994ء کے اواخر میں وہ اچانک، ڈرامائی طور پر منظر پر نمودار ہوئے۔ ان کے دم قدم سے قندھار اور گرد ونواح

MashalBooks.org

کے علاقوں میں قدرے امن وسلامتی کی فضا قائم ہوئی، انہوں نے باہم لڑتے جھگڑتے قبائلی گروہوں کو کچل ڈالا اوران کی پیشوائی کرنے والوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ انہوں نے لوگوں سے اسلحہ لے لیا۔ سڑکیں جو عرصے سے بند چلی آ رہی تھیں، پھر سے کھول دیں۔ جس کے سبب پاکستان، افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا کے درمیان جائز اور ناجائز تجارت ہونے لگی، اس سے جو مالی اسباب میسر آئے، وہ اقتصادی ضرورتیں پوری کرنے کا وسیلہ بنے۔ طالبان کی اکثریت کا تعلق، نسلی لحاظ سے، پٹھان قبیلوں سے ہے جو افغانستان کی دو کروڑ کی آبادی کا 40 فیصد ہیں۔ پشتون قوم پرستی کو انہی کے سبب فروغ ملا۔ پشتونوں نے افغانستان پر 300 برس تک حکومت کی تھی، حالیہ برسوں میں بھی دوسرے چھوٹے نسلی گروپوں نے ان پر فوقیت حاصل کی۔ طالبان کی فتوحات سے پشتونوں کو امید لگی کہ شاید وہ افغانستان میں پھر سے غلبہ پا سکیں گے۔

طالبان نے اسلامی شرعی قوانین کی تشریح اور نفاذ کے لئے سخت اقدامات کیئے، جس پر افغانوں سمیت پوری اسلامی دنیا ششدر رہ گئی۔ طالبان نے لڑکیوں کے تمام سکول بند کر دیئے، عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے باہر جانے اور خریداری کرنے کی کم ہی اجازت دی جانے لگی۔ موسیقی، ٹی وی، ویڈیو، تاش، پتنگ بازی اور اکثر و بیشتر کھیلوں سمیت ہر طرح کی تفریح ممنوع قرار دے دی گئی۔ طالبان کی اسلامی بنیاد پرستی اس درجہ متشددانہ اور انتہا پسندانہ تھی کہ اس سے امن، برداشت، دوسرے مذہبی اور نسلی گروہوں کے ساتھ رواداری برتنے سے متعلق اسلامی تعلیمات کی نفی ہوتی دکھائی دینے لگی۔ اس سے پاکستان اور وسطی ایشیا میں بنیاد پرستی کی نئی انتہا پسندی نے جنم لیا، جو روایتی اسلامی انداز، معاشرتی ڈھانچوں اور مروجہ ریاستی نظام سے مفاہمت کرنے کی روادار نہیں تھی۔

چند ہفتے پہلے طالبان نے قندھار میں فٹ بال کھیلنے پر سے پابندی اٹھالی تھی۔ اقوام متحدہ اور دوسرے اداروں نے موقعہ غنیمت جانا اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سٹیڈیم

MashalBooks.org

میں بمباری کے سبب سے، ٹوٹ پھوٹ جانے والی نشستوں اور سٹینڈ پھر سے تعمیر کر دیئے۔ جمعہ کے روز سٹیڈیم کے افتتاح کی تیاری جمعرات کی سہ پہر کو ہونے لگی، (لیکن اس کے لئے فٹ بال کا میچ نہیں ہونا تھا، ایک مجرم کو گول کے پولوں سے باندھ کر سرعام گولیوں کی باڑ مار دینی تھی)۔ اسی کا تماشہ دیکھنے لوگ سٹیڈیم کی طرف جا رہے تھے۔

میں اقوام متحدہ کے ایک طیارے کے ذریعے پاکستان سے اسی وقت قندھار پہنچا تھا۔ خوفزدہ غیر ملکی امدادی کارکنوں نے رندھی ہوئی آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ کسی مجرم کو سرعام گولی ماری جا رہی ہے، ان کا کہنا تھا کہ اگر یہی کچھ ہوتا رہا تو اقوام عالم کے لئے افغانستان میں منصوبوں کے نفاذ اور تکمیل کے لئے امداد فراہم کرنا مشکل ہوگا۔ ایک مغربی کارکن نے کہا کہ ہم نے سٹیڈیم کی تعمیر نو کے لئے طالبان کو جو امداد دی ہے اس کا کیا جواز پیش کر سکیں گے؟

وہ میرے ساتھ ایک خاتون صحافی گریٹ چن پیٹرز کو دیکھ کر اور زیادہ مضطرب ہو گئے تھے، وہ اونچے لمبے قد کی تھی۔ اس کے بال سرخ، پیشانی کشادہ اور جسم متناسب تھا۔ اس نے تنگ شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ وہاں خیمہ نما کھلی شلوار، گھٹنوں سے نیچے تک پہنچے والا کرتہ اور سر ڈھانپنے کے لئے ایک بڑی سی چادر کا رواج تھا۔ یہ لباس پہن کر بھی امریکی خاتون اپنے خدوخال اور قامت، جسامت کو چھپا نہیں سکتی تھی، وہ طالبان کے مقررہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ طالبان کا کہنا تھا کہ عورتیں نظر نہ آئیں اور نہ ان کی آواز سنائی دے۔ اگر وہ ایسا کریں گی تو مردوں کو گناہ کی ترغیب دیں گی اور انہیں اسلام کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹکا دیں گی۔ طالبان لیڈروں کو عورتوں کا ڈر تھا یا وہ ان کی نسوانیت سے نفرین تھے، جس کی وجہ سے وہ خاتون صحافیوں کو انٹرویو دینے سے اکثر انکار کر دیا کرتے تھے۔ 1994ء کے موسم سرما سے لے کر جب طالبان پہلے پہل قندھار پر قبضہ کرنے کے لئے سامنے آئے اور پھر شمال کی طرف پیش قدمی کرتے ستمبر 1996ء میں کابل پر غلبہ پانے لگے، اس وقت تک میں طالبان کے بارے میں

رپورٹنگ کرنے کی غرض سے درجن سے زیادہ بار قندھار، ہرات اور کابل گیا۔ مجھے یہ کرید تھی کہ طالبان ہیں کون؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ ان کی مدد کرنے والے کون ہیں؟ اور وہ اسلام کی ایسی انتہا پسندانہ اور متشددانہ تشریح اور توجیہہ کرنے پر کیوں کر قادر ہو سکے ہیں؟ ایک اور پہلو نے بھی جو حیران کن بھی تھا اور خوفناک بھی، مجھے لرزا دیا۔ جنگ کے دوران میں نے بے شمار انسانوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا، مگر اس کے باوجود میرے لئے ایک انسان کو گولی مار دیئے جانے کا تماشہ دیکھنا مشکل تھا۔ ہزاروں لوگوں کے ساتھ مل کر اس سانحے کو تفریح کا وسیلہ جاننا اور اسے اسلامی انصاف کا اظہار سمجھنا اور بھی زیادہ مشکل تھا۔

ہمیں سٹیڈیم میں داخل ہونے سے روکا گیا لیکن بعد میں مجھے اس شرط پر کہ میں خاموش رہوں گا اور کسی سے بات نہیں کروں گا، سٹیڈیم میں آنے دیا گیا۔ گریٹ چن پیٹرز آنکھ بچا کر سٹیڈیم میں داخل ہو گئی لیکن مسلح طالبان محافظوں نے جلد ہی اسے کلاشنکوفوں کے کندوں سے دباتے ہوئے باہر دھکیل دیا۔ سٹیڈیم میں اسی ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی، نصف سہ پہر تک تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں، لوگ فرش پر بھی بیٹھے تھے، بچے کچھ دیر تو بے قابو رہے اور کھیلتے کھیلتے آگے تک چلے گئے لیکن محافظوں نے انہیں بھی پیچھے ہٹنے اور اپنی جگہ سے نہ ہلنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ شہر کے تمام مرد وہاں موجود تھے۔ عورتوں کو کسی عوامی اجتماع میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ اچانک شور شرابہ تھم گیا، دو درجن کے لگ بھگ طالبان کالی پگڑیاں باندھے، شلوار قمیص پہنے، میدان میں اترے، انہوں نے لڑکے بالوں کو پیچھے ہٹایا اور لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔ اب چاروں طرف سناٹا تھا، اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ طالبان کے قدموں کی چاپ تھی۔ اس اثناء میں دو دروازوں والی ڈاٹسن پک اپ گاڑیاں میدان میں آ گئیں۔ ایک پک اپ پر لاؤڈ سپیکر نصب تھا۔ اس طرح کے لاوڈ سپیکر پاکستان اور افغانستان کی ہزاروں مساجد میں موجود ہیں، ایک سفید ریش بزرگ نے گاڑی میں

کھڑے ہو کر تقریر کرنا شروع کر دیا۔ وہ طالبان کی سپریم کورٹ کے جج قاضی کلیم اللہ فیروزی تھے۔ انہوں نے طالبان کی تحریک کے مقاصد بیان کیئے، اسلامی سزا کے اثرات نتائج کی وضاحت کی، جس مقدمے کا فیصلہ ہونے والا تھا، اس کی پوری روداد سنائی، ایک شخص عبداللہ افغان نے، جس کی عمر 20 برس سے کچھ ہی زیادہ ہوگی، قندھار کے نواح میں اپنے گاؤں کے ایک کاشت کار عبدالولی کے گھر سے کوئی دوائی چرانا چاہی۔ عبدالولی نے مزاحمت کی تو عبداللہ نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور فرار ہو گیا۔ عبدالولی کے رشتہ دار اس کی تلاش میں رہے، آخر ایک روز اسے پکڑ کر طالبان کے پاس لے آئے کہ وہ انصاف کے تقاضے پورے کریں۔

عبداللہ پر پہلے قندھار کی اسلامی ہائی کورٹ میں مقدمہ چلا، اسے موت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ اس نے سپریم کورٹ کی سزا کے خلاف اپیل کی، لیکن وہ مسترد ہوگئی اور موت کی سزا بحال رہی۔ طالبان کی عدالتوں میں کوئی وکیل پیش نہیں ہوتا، ملزموں کو خود اپنا دفاع کرنا اور صفائی پیش کرنا ہوتی ہے۔ طالبان کے مطابق اسلامی شرع میں مقتول کا خاندان قاتل کو سزائے موت دینے کے لئے کہتا ہے۔ مقتول کا خاندان منصف کے کہنے پر قاتل کو معاف کر دے تو قاتل کو مقتول کے ورثا کو خون بہا دینا پڑتا ہے۔ اسلامی شریعت کی جو تشریح طالبان کرتے ہیں اس کے مطابق سزا اور جزاء کا فیصلہ ہوتا ہے یا پشتون ولی کی روایات کے پیش نظر کیا جاتا ہے اور انہی کے مطابق طے کیا جاتا ہے کہ مجرم قابل معافی ہے یا نہیں؟ اس دوران مقتول کے 20 مرد رشتہ دار قاضی کے سامنے پیش ہوئے، قاضی نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور ان سے کہا کہ وہ مجرم عبداللہ کو معاف کر دیں اور بدلے میں خون بہا لے لیں۔ ''اگر تم نے اسے معاف کر دیا تو تمہیں دس مرتبہ مکہ معظّمہ جانے کا موقعہ ملے گا، تمہیں بیت المال سے بھاری معاوضہ ملے گا۔ یہ ہمارے قائدین کا فیصلہ ہے''۔ مقتول کے رشتہ داروں نے انکار میں سر ہلا دیئے۔ طالبان نے ہجوم کی طرف اپنی بندوقیں تان کر اعلان کیا کہ جو اپنی جگہ سے

ہلے گا، اسے گولی مار دی جائے گی، مجمع خاموش ہو گیا۔ عبداللہ اس دوران ایک دوسری پک اپ میں بیٹھا رہا۔ طالبان محافظ اس کی نگہداشت پر مامور تھے۔ اسے گاڑی سے نیچے اتارا گیا۔ اس کے سر پر زرد رنگ کی ٹوپی تھی، اس نے زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ اسے سٹیڈیم کے دوسرے سرے پر لگے گول پوسٹ تک چلنے کو کہا گیا، ڈر کے مارے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں، بیڑیاں بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ جب وہ گول تک پہنچا تو اسے گھٹنوں کے بل بیٹھنے اور اپنا منہ ہجوم کی طرف سے پھیر لینے کو کہا گیا۔ ایک محافظ نے اس کے کان میں کہا کہ وہ اپنی آخری دعا کر سکتا ہے۔ ایک دوسرے محافظ نے مقتول کے ایک رشتہ دار کو کلاشنکوف دی، اس نے بڑی تیزی سے کلاشنکوف بھری اور مجرم کی پشت پر یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیئے۔ عبداللہ پیٹھ کے بل پیچھے گرا تو گولیاں چلانے والے نے اس کے تڑپتے ہوئے جسم کے پاس جا کر اس کی چھاتی پر تین اور فائر کئے۔ چند لمحوں بعد مجرم کی نعش ایک گاڑی میں ڈال کر لے جائی گئی۔ ہجوم خاموشی کے ساتھ منتشر ہو گیا۔

جب ہم بازار پہنچے تو چائے خانوں میں کیتلیوں سے بھاپ نکل رہی تھی، سیخوں پر کباب لگائے اور چولہوں میں کوئلے دہکائے جا رہے تھے۔ خوف و ہراس، مکمل تھکاوٹ، برسوں کی بے اندازہ تباہی اور پندرہ لاکھ افغانوں کی ہلاکت نے لوگوں کو طالبان کے طرز انصاف کو قبول کرنے پر آمادہ یا مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے دن قندھار کے قریب ایک گاؤں میں ایک عورت کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس نے ایک مرد کے ساتھ، جو اس کا رشتہ دار نہیں تھا، افغانستان سے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تھی۔ طالبان نے چوروں کا ایک ہاتھ، ایک پاؤں یا دونوں کاٹ ڈالنے کی سزا مقرر کر رکھی ہے۔ ستمبر 1996ء میں جب طالبان نے کابل پر قبضہ کیا تو ابتداء میں انہیں نجات دہندہ جان کر ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن جب طالبان نے صدر نجیب اللہ پر برسر عام جسمانی تشدد کیا اور پھر اسے پھانسی پر لٹکا دیا تو بہت سے کابلی اور باہر کی دنیا والے سخت

مایوس ہوئے، نجیب اللہ سابق کمیونسٹ تھا، وہ چار برس تک اقوام متحدہ کی حفاظت میں رہا تھا۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اسلامی دنیا میں کسی سیاسی تحریک نے اتنی توجہ حاصل نہیں کی، جتنی توجہ افغانستان میں طالبان کو ملی، طالبان نے بعض افغانوں کے دلوں میں یہ امید پیدا کی تھی کہ سادہ منش اسلامی طلباء افغانستان میں امن بحال کریں گے اور باہم مصروف پیکار گروہوں کو ختم اور بے اثر کر دیں گے۔ جنہوں نے اپریل 1992ء میں کابل کی کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹے جانے کے بعد لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ بعض کو ڈر تھا کہ کچھ وقت گزر جانے پر طالبان کی تحریک میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جنگی جنون میں مبتلا ایک اور دھڑا بے یار و مددگار اور مایوس افغان عوام پر ایک آمرانہ نظام مسلط کر دے گا۔

پشتون طالبان ایک کثیر القومی ریاست میں نسلی تعلقات کا مسئلہ پیدا کرنے کے علاوہ خاندان، قبیلے اور جاگیردارانہ نظام کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کو زیر بحث لانے کے محرک ہوئے ہیں۔ اس طرح ایک قدامت پسند معاشرے میں تجدید اور اقتصادی ترقی کا سوال بھی سامنے آیا ہے۔ سیاسی نظم و نسق، ان کی قیادت اور مسائل و معاملات کے بارے میں حد سے بڑھتی ہوئی ان کی رازداری کے باعث طالبان کے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ طالبان پریس ریلز جاری نہیں کرتے، اپنی پالیسی کے بارے میں بیان نہیں دیتے، باقاعدگی سے پریس کانفرنسیں نہیں کرتے، ٹیلی ویژن اور فوٹو گرافی پر پابندی کے باعث کوئی نہیں جانتا کہ ان کے رہنما کیسے دکھائی دیتے ہیں۔ طالبان کے رہنما ملا محمد عمر سربستہ راز ہیں۔ جس طرح کمبوڈیا میں کھیمر روج، پردہ افغا میں رہے، کچھ اسی طرح طالبان بھی ہیں، ان کی سیاسی تحریک سے دنیا ناواقف ہے۔ بہرحال طالبان نے اس خطے میں اسلامی مقاصد کی ترویج و تکمیل کی کوششوں کا آغاز کیا ہے۔ شاید یہ اسی کا ردعمل ہے کہ ایران، ترکی، بھارت، روس، وسطی ایشیا کی

چار جمہوریتوں، ازبکستان، قازقستان، کرغیزستان اور تاجکستان نے طالبان کے مخالف شمالی اتحاد کو اسلحے اور مالی امداد دینا شروع کر دی ہے، مقصد طالبان کی پیش قدمی روکنا ہے، اس کے برعکس پاکستان اور سعودی عرب نے طالبان کی حمایت کی ہے۔ غرض سرد جنگ کے بعد کے زمانے میں اس خطے میں بدترین قسم کی محاذ آرائی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ 1998ء کے موسم گرما میں طالبان کی فتوحات اور ملک کے 90 فیصد رقبے پر ان کے تسلط نے علاقائی اختلافات کو شدید تر کر دیا ہے۔ ایران کی جانب سے افغانستان پر حملہ کرنے کی دھمکی اور پاکستان پر طالبان کی حمایت کرنے کا الزام اس کا ثبوت ہے۔ علاقائی کشمکش میں ایک عنصر، وسطی ایشیا کے تیل اور گیس کے وسیع ذخائر پر تصرف اور اجارہ حاصل کرنے کی کوششوں کا بھی ہے۔ توانائی کے یہ وسائل ابھی تک پوری طرح استعمال میں نہیں آ سکے، علاقے کے ملکوں اور مغرب کی آئیل کمپنیوں کے درمیان سخت مقابلہ شروع ہے کہ ان میں سے کون تیل اور گیس کی یورپی اور ایشیائی منڈیوں تک ترسیل کے لئے پائپ لائنیں بچھانے کا حق اور اختیار حاصل کر سکتا ہے۔ جس طرح انیسویں صدی میں روس اور برطانیہ کے درمیان، وسطی ایشیا اور افغانستان پر غلبہ پانے کی کشمکش نے گریٹ گیم کی صورت اختیار کر لی تھی، اسی طرح کی گریٹ گیم وسطی ایشیا کے توانائی کے ذخائر پر اجارہ داری کے لئے شروع ہو چکی ہے۔ 1995ء کے اواخر سے امریکی انتظامیہ ترکمانستان سے طالبان کے زیر اثر افغانستان کے راستے پاکستان تک پائپ لائن بچھانے کے لئے امریکی تیل کمپنی یونوکال کی بھرپور حمایت کرتی آ رہی ہے۔ لیکن اس نئی گریٹ گیم میں ایک اور غیر متوقع کھلاڑی بھی شریک ہو گیا ہے۔

سٹیڈیم میں ایک قاتل کو موت کی سزا دیئے جانے کے اگلے روز میں قندھار کے گورنر محمد حسن کا انٹرویو لینے گیا۔ مسلح طالبان محافظوں کی موجودگی میں سڑک سے گزرتا جب گورنر کی رہائش گاہ پر پہنچا تو گورنر کے دفتر سے سنہری بالوں والے ایک خوش پوش تاجر کو برآمد ہوتے دیکھا، اس کے ساتھ اسی طرح کے دو اور تاجر تھے، جس کے ہاتھوں میں

MashalBooks.org

خاصے بھرے ہوئے بریف کیس تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ قندھار کی گرد آلود گلیوں میں اسلامی گوریلوں سے نہیں، وال سٹریٹ سے کوئی معاہدہ کر کے نکلے ہیں۔ وہ ارجنٹائین کی آئیل کمپنی بری داس کارپوریشن کے چیئرمین ٹارلوس بل گرونی تھے، وہ 1994ء سے متذکرہ گیس پائپ لائن بچھانے کے لئے طالبان اور شمالی اتحاد سے خفیہ مذاکرات کر رہے تھے۔ بری داس کا یوتو کال سے مقابلہ تھا، اس نے کیلیفورنیا کی ایک عدالت میں یوتو کال کارپوریشن کے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ وسط ایشیاء سے افغانستان کے راستے پائپ لائین بچھانے کی تجویز اس کی تھی۔ جسے یوتو کال نے چرا لیا۔ میں ایک برس سے یہ جاننے کی کوشش میں تھا کہ آخر ارجنٹائین کی کمپنی کو دنیا کے اس دور افتادہ اور پرخطر علاقے (افغانستان) میں بھاری سرمایہ کاری کرنے کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت پیش آئی! لیکن بری داس اور یوتو کال دونوں نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ بری داس کارپوریشن کے چیئرمین نہیں چاہتے تھے کہ کوئی صحافی انہیں قندھار کے گورنر کے دفتر سے نکلتے دیکھ پاتا۔ چنانچہ اس نے مجھ سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ان کا طیارہ ان کے انتظار میں کھڑا ہے۔ انہیں شمالی اتحاد کے دارالحکومت مزار شریف جانا ہے۔

وسطی ایشیا سے گیس پائپ لائن بچھانے کی دوڑ میں تیزی آئی تو اسلامی دنیا اور مغرب دونوں ہی اس مخمصے میں پڑ گئے کہ آیا طالبان مستقبل کی اس اسلامی بنیاد پرستی کی نمائندگی اور ترجمانی کرتے ہیں جس کے تحت ساتویں صدی کا جارحانہ عرب معاشرے کی طرح کا افغان معاشرہ تعمیر کیا جائے گا۔ افغانستان سے منشیات کی وسیع برآمد اور افغانستان کی طرف سے اسامہ بن لادن اور اس کی طرح کے دوسرے متشدد عناصر کی پشت پناہی نے بھی مغرب کو ڈرا رکھا تھا۔

بعض ماہرین کا خیال تھا کہ طالبان صدیوں پہلے کے اسلامی معاشرتی ضابطوں کی کارفرمائی پر جو اصرار کر رہے ہیں تو اس سے بعض امریکی دانشوروں کی یہ پیشین گوئی تو

MashalBooks.org

درست ثابت نہیں ہو رہی ہے کہ سرد جنگ کے بعد ایک نئی جنگجو اسلامی دنیا مغرب کا مقابلہ کرے گی اور نئی طرز کی سرد جنگ شروع ہو جائے گی۔ تہذیبوں کے درمیان تصادم کی نوبت آ جائے گی۔

افغانستان کے لئے اس طرح کی صورت حال نئی نہیں، ان سے پہلے افغانستان میں بے شمار فاتح مبلغ، اولیاء اور فلسفی بھی گزرے ہیں جو پرانی تہذیبوں کو مٹاتے اور نئی تہذیبوں کو جنم دیتے رہے ہیں۔ طالبان اسی طویل سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ قدیم زمانے کے بادشاہوں کے خیال میں افغانستان کا علاقہ دنیا کا مرکز ہے۔ یہ خیال کسی نہ کسی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے افغانستان کو ایشیا کا دل کہا ہے، جبکہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے برطانوی وائسرائے لارڈ کرزن نے بھی افغانستان کو ایشیاء کا وسط قرار دیا تھا۔

دنیا کے بعض ملکوں پر یہ بات صادق آتی ہے کہ تاریخ، سیاست اور لوگوں کی خاصیت کے تعین میں جغرافیائی حالات نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ افغانستان اپنے محل وقوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ وہ ایران، بحیرہ عرب، ہندوستان، وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے درمیان واقع ہے۔ چھ ہزار سال قبل اس کے گرد کے پہاڑی دروں سے گزر کر آریہ آئے۔ افغانستان کے دور دور تک پھیلے ہوئے کوہستانی سلسلوں، صحرائی خطوں اور بے آب و گیاہ علاقوں نے دنیا کے بہترین لڑاکا اور جانباز پیدا کئے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے کوہستانی مناظر، سرسبز و شاداب وادیوں اور پھل دار درختوں نے شاعروں کا دل لبھایا اور انہیں مشق سخن کرنے کی تحریک کی ہے۔

کئی برس ہوئے ایک معمر اور سہانے افغان مجاہد نے مجھے وہ اساطیری کہانی سنائی تھی کہ اللہ نے افغانستان کو کس طرح بنایا۔ اس نے کہا کہ جب اللہ باقی دنیا تخلیق کر چکا تو اس نے دیکھا کہ ملبے کا ایک انبار پڑا ہے۔ اللہ نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور ایسی چیزوں کو جو کسی اور کام نہیں آئی تھیں، اٹھا کر زمین پر پھونک دیا اور یوں افغانستان بن

گیا۔

موجودہ افغانستان کا رقبہ 245,000 مربع میل ہے۔ بلند و بالا کوہ ہندوکش کے ساتھ افغانستان شمال اور جنوب میں تقسیم ہوگیا ہے۔ بیسویں صدی میں اس کے قبائل میں باہم تال میل جاری رہا۔ تاہم ہندوکش کے جنوب میں اکثریت پشتونوں کی ہے۔ فارسی بولنے والے بھی کچھ قبیلے ہیں۔ شمال میں فارسی اور ترک زبان بولنے والے ہیں۔ ہندوکش میں فارسی بولنے والے ہزارہ اور تاجک قبائل ہیں۔ انتہائی شمالی کونے میں پامیر کے پہاڑ ہیں۔ مارکو پولو نے انہیں دنیا کی چھت کہا تھا۔ افغانستان کی سرحدیں تاجکستان، چین اور پاکستان سے ملتی ہیں۔ پامیر کے دشوار گزار پہاڑوں کی وجہ سے ان کے مرتفع علاقوں اور برف پوش وادیوں میں بسنے والوں کے درمیان تال میل قائم نہیں ہوسکا۔ ہندوکش کی جنوبی ڈھلان کی طرف کابل ہے۔ اس کے گرد ونواح کا علاقہ زرعی اعتبار سے بڑا زرخیز ہے۔ مغربی اور جنوبی افغانستان، ایرانی سطح مرتفع کے سرے پر ہے۔ افغانستان کا یہ حصہ پتھریلا اور آبی اور زرعی وسائل سے بڑی حد تک تہی دامن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آبادی بھی بہت کم ہے۔ یہ صحرا کہلاتا ہے۔ لے دے کے ہرات کا علاقہ ہے، جسے صحرا میں نخلستان کہا جاسکتا ہے۔ ہرات گزشتہ تین ہزار برس سے تہذیبی مرکز چلا آ رہا ہے۔ ہندوکش کے شمال میں وسطی ایشیا کا وہ سنگلاخ خطہ شروع ہوتا ہے جو ہزار میل دور سائبیریا تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ علاقائی اور موسمی شدت کا اثر ہے کہ شمال میں بسنے والے ترک باشندے نہایت سخت کوش اور بڑے جنگجو ہیں۔ مشرقی افغانستان میں کوہ سلیمان کا سلسلہ اور کچھ دوسرے کم اونچے پہاڑ ہیں۔ انہی کے ساتھ پاکستان کی سرحد ہے۔ ان کے دونوں طرف پشتون قبائل آباد ہیں۔ اس پہاڑی سلسلے میں کئی درے ہیں۔ درہ خیبر بھی انہی میں سے ہے، جس سے گزر کر فاتحین ہندوستان کے سرسبز میدانوں تک پہنچ رہے ہیں۔ افغانستان کا صرف دس بارہ فیصد رقبہ قابل کاشت ہے۔ اکثر کھیت پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر ہیں۔ انہیں زیر کاشت لانا اور ان

سے پیداوار حاصل کرنا خاصا محنت طلب کام ہے۔ 1970ء کے عشرے تک خانہ بدوشی یہاں کے لوگوں کی گزر بسر کا واحد ذریعہ تھی۔ کوچی خانہ بدوش ہر سال چراگاہوں کی تلاش میں اپنی بھیڑ بکریاں لے کر ہزاروں میل کا سفر کرتے۔ پاکستان ایران اور افغانستان کا رخ کرتے۔ 1980ء میں سوویت یونین سے جنگ میں کوچی کلچر بھی تباہ ہوا اوران کا ذریعہ معاش بھی ختم ہوگیا۔ تاہم مویشی پالنا یہاں کے غریب کاشت کاروں کی گزر بسر کا واحد سہارا ہے۔ کل کے افغان خانہ بدوش آج کے تاجر اور ٹرک ڈرائیور ہیں، وہ افغانستان کے طول وعرض میں ان راستوں پر ٹرک چلا رہے ہیں، جو بالعموم سمگلنگ کا ذریعہ ہیں۔ طالبان کے لئے مالی اسباب کی فراہمی میں بھی ان کا اہم کردار ہے۔

تاریخ کے آغاز سے سب راستے اور شاہراہیں وسطی افغانستان میں ہی تھیں۔ چاروں جانب سے خشکی میں گھرا ہوا یہ علاقہ ایشیا اور مختلف خطوں اور علاقوں کے بسنے والوں کی گزرگاہ رہا ہے۔ مغرب میں ایرانی اور شمال میں ترک سلطنتوں کے لئے میدان جنگ بھی بنتا رہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آثار قدیمہ سے اس کا دامن بھرا ہوا ہے۔ ان دونوں قدیم تہذیبوں کے لئے اپنی عظمت کی بقاء اور فتوحات جاری رکھنے کے لئے افغانستان پر تسلط جمانا ناگزیر تھا۔ بعض اوقات افغانستان دونوں سلطنتوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کا بھی وسیلہ بن جایا کرتا، پھر یوں بھی ہوتا کہ جب انہیں ہندوستان پر حملہ آور ہونا ہوتا تو وہ اپنی افواج لے کر افغانستان ہی سے گزرتے۔ شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق کی طرف جانے کے لئے وہ اپنے لشکروں کو افغانستان کے راستے بھجواتے۔ اس کی سرزمین میں زرتشی، مانی اور بدھ مذاہب پروان چڑھے۔ مزارشریف کے چند میل کے فاصلے پر بلخ کے کھنڈر صاف دکھائی دیتے ہیں۔ یونیسکو کے مطابق یہ دنیا کا قدیم ترین شہر تھا۔ یہاں بودھ، ایرانی اور ترک فنون لطیفہ اور فن تعمیر نے بڑا فروغ حاصل کیا۔ افغانستان کے راستے بدھ مت چین اور جاپان پہنچا۔ شاہراہ ریشم

تجارت کا وسیلہ رہی۔ فاتحین جلتے بجھتے شہابیوں کی طرح اس زمین پر سے لپکتے گزرتے رہے۔

329 قبل مسیح مقدونیہ (یونان) سے سکندر اعظم نے افغانستان اور وسطی ایشیاء فتح کیا اور پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ یونانی، ہندوکش کے سلسلہ کوہ کے نواح میں ایک نئی جاندار بودھ یونانی سلطنت قائم کر گئے اور ایک نئی تہذیب کو جنم دے گئے۔ یہ یورپی اور ایشیائی تہذیبوں اور تقاضوں کے درمیان پہلا رابطہ تھا۔ 654 عیسوی میں عرب افواج افغانستان سے گزرتی وسطی ایشیا کی سرحد تک جا پہنچیں۔ ان کے توسط سے اس علاقے میں اسلام پھیلا، یہ مساوات اور انصاف کا داعی تھا اور اپنی تعلیمات کے سبب سے بڑی تیزی سے پورے علاقے میں مقبول ہو گیا۔ 74ھ سے 999ء تک افغانستان، ایرانی فنون اور ادبیات کے حوالے سے نئی ایرانی تحریک احیائے علوم کی آماجگاہ بنا۔ غزنویوں نے 1977ء سے 1186ء تک حکومت کی۔ شمال مغربی ہندوستان پنجابی اور مشرقی ایران پر ان کی فرمانروائی رہی۔

1219ء میں چنگیز خان اٹھا، اس کے لشکر افغانستان پر چڑھ دوڑے، انہوں نے بلخ اور ہرات ایسے شہر تاراج کیے اور انسانی نعشوں اور سروں کے مینار بنائے۔ تباہی اور غارت گری کے ساتھ منگولوں نے کچھ نہ کچھ دیا بھی، ہزارہ انہی کی یادگار ہیں۔ منگولوں اور مقامی لوگوں کے درمیان ازدواجی رشتے بھی قائم ہوئے۔ اس سے اگلی صدی میں چنگیز خاں کی اولاد میں سے تیمور نے روس اور ایران پر اپنی سلطنت قائم کی۔ موجودہ دور کے تاجکستان کا سمرقند، اس کا پایہ تخت تھا۔ تیمور نے 1381ء میں ہرات فتح کیا۔ اس کے بیٹے شاہ رخ نے 1405ء میں ہرات کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ تیموری اور ترک لوگ وسط ایشیاء میں ترک خانہ بدوشوں کا کلچر، ایرانی تہذیب کے قریب لے آئے۔ اس کے نتیجے میں ہرات، دنیا کے نہایت تہذیب یافتہ اور عمدہ شہروں میں شمار ہونے لگا۔

وسط ایشیا اور ایران کی تہذیب و ثقافت نے مستقبل کے افغانستان پر گہرا نقش مرتب

کیا۔ ایک صدی بعد شہنشاہ بابر ہرات آیا۔ اس نے لکھا کہ رہائش کے لئے ہرات جیسا کوئی شہر پوری دنیا میں نہیں۔ اگلے 300 برسوں میں مشرقی افغانستان کے قبائیل وقفوں وقفوں سے ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ دہلی فتح کرنے اور ہندی افغان سلطنتیں قائم کرتے رہے۔ افغان لودھی خاندان نے 151 سے 1526 تک دہلی پر حکومت کی۔

1500ء میں تیمور کی آل اولاد سے بابر ازبکستان کی وادی فرغانہ میں اپنے گھر سے نکلا۔ 1500ء میں اس نے پہلے کابل فتح کیا اور پھر دہلی پہنچا۔ اس نے مغل خاندان کی داغ بیل ڈالی، جو انگریزوں کی آمد تک برصغیر پر حکمران رہا۔ اسی دور میں ایران کی سلطنت زوال پذیر ہوئی اور ازبک شبانی خوانین کے قبضے میں چلا گیا۔ سولہویں صدی تک مغربی افغانستان ایک بار پھر ایران کے صفوی خاندان کی تحویل میں چلا گیا۔

حملوں کے سلسلے کے سبب نسلی، ثقافتی اور مذہبی تحلیل اور تال میل کا وہ سلسلہ قائم ہوا جس نے افغان قوم کی تعمیر وتشکیل کو بے حد مشکل بنا دیا۔ مغربی افغانستان پر فارسی یا دری بولنے والوں کا غلبہ رہا۔ (افغانستان میں بولی جانے والی فارسی اپنے لہجے کے فوق کی بنا پر دری کہلاتی ہے)۔ وسطی افغانستان کے ہزارہ قبائل دری بولتے ہیں، ایرانیوں کے اثر ونفوذ کے باعث انہوں نے شیعہ مسلک اپنا لیا۔ ہزارہ سنی علاقے کا سب سے بڑا شیعہ قبیلہ ہیں۔ مغرب کی جانب تاجک بھی دری بولتے ہیں۔ انہیں ایران کی قدیم تہذیب کا نمائندہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ شمالی افغانستان میں ازبک، ترکمان، کرمیز اور دوسرے لوگ وسطی ایشیاء کی ترک زبانیں ہی بولتے ہیں۔ جنوب اور مشرق میں پشتون قبائیل پشتو بولتے ہیں، جو انڈو پرشین زبانوں کا ملغوبہ ہے۔

جنوبی پشتونوں نے اٹھارویں صدی میں ایک ایسے وقت جب ایران میں صفوی خاندان اور ہندوستان میں مغل خاندان زوال پذیر تھا۔ جدید افغان ریاست کی بنیاد رکھی۔ پشتون قبائیل دو بڑے حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ غلزئی اور ابدالی جو بعد میں

درانی کہلائے وہ ایک دوسرے کے مقابل رہے۔

پشتون اپنا سلسلہ نسب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت قیسؓ سے ملاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ سامی ہیں۔ لیکن علم الانسیان کے ماہرین انہیں انڈویورپین سلسلے کی کڑی مانتے ہیں۔ درانی اپنا سلسلہ نسب حضرت قیس~رح~ کے بڑے بیٹے سربند اور غلزئی، ان کے چھوٹے بیٹے سے جوڑتے ہیں۔ قندھار کے کاکڑ اور پشاور کے نواح کے صافی اپنے آپ کو حضرت قیسؓ کے تیسرے بیٹے کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چھٹی صدی میں چینی اور انڈین حوالوں کے مطابق افغان اور پشتون غزنی کے مشرق میں رہتے تھے۔ ان کے قبیلوں نے پندرھویں صدی میں مغرب کی جانب قندھار، کابل اور ہرات کا رخ کیا۔ اگلی صدی تک قندھار کے گرد ونواح سے درانیوں اور غلزئیوں میں زمین کے تنازع شروع ہو گئے۔ آج غلزئی قبیلے کی زمین دریائے کابل کے جنوب میں کوہ سفید اور کوہ سلیمان کے درمیان اور مشرق میں ہزارہ جات اور مغرب میں قندھار کے نیچے واقع ہیں۔

1709ء میں میرویس نے جو قندھار میں غلزئی پشتونوں کا ہوتا کی قبیلے کا سردار تھا۔ صفوی شاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ صفوی شاہ نے سنی پشتونوں کو شیعہ مسلک اختیار کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہی اختلاف تین صدی بعد اب طالبان کی ایران اور افغان شیعوں کی مخالفت کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔

چند برس بعد میرویس کے بیٹے نے صفوی خاندان کو شکست دے کر ایران پر قبضہ کر لیا۔ 1729ء میں افغانوں کو ایران سے نکال دیا گیا۔ غلزئی طاقت کم ہوئی تو ان کے روایتی مخالف ابدالیوں نے کنفیڈریشن بنا لی اور 1747ء میں لویا جرگہ منعقد کیا، جس نے نو دن کی بحث وتمحیص کے بعد احمد شاہ ابدالی کو بادشاہ چن لیا۔ قبائلی سرداروں نے احمد شاہ ابدالی سے اپنی وفاداری کے اظہارء کے لئے اس کی پگڑی میں گھاس کی پتیاں اڑسیں۔ اس کے بعد سے لویا جرگہ نے روایتی قانونی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی،

جس کی تائید سے ہی نئے حکمران چنے جاتے تھے۔ اس طرح نسلی بادشاہت کا دور ختم ہو گیا۔ اب بادشاہ کا بیٹا بادشاہ نہیں بن سکتا۔ حکمران اپنی قانونی حیثیت منوانے کے لئے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انہیں لویا جرگہ میں شامل قبائیل نے چنا ہے اور کاروبار حکومت چلانے کا اختیار دیا ہے۔ احمد شاہ نے ابدالی کنفیڈریشن کے نام کو درانی میں بدل دیا اور یوں تمام پشتون قبائیل کو متحد کیا اور فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ بہت جلد اس علاقے پر قابض ہو گیا جس میں آج کا جدید پاکستان قائم ہے۔

1761ء میں احمد شاہ درانی نے ہندو مرہٹوں کو شکست دی۔ تخت دہلی اور کشمیر پر قبضہ کیا اور پہلی افغان سلطنت قائم کی۔ احمد شاہ درانی کو افغان قوم کا باپ سمجھا جاتا ہے۔ ان کا جسد خاکی قندھار میں، جو ان کا پایہ تخت تھا، ایک مقبرے میں مدفون ہے۔ افغان ان کی قبر پر فاتح خوانی کے لئے آتے رہتے ہیں۔ بعض افغانوں کے نزدیک اس کا درجہ ولی کا ہے۔ احمد شاہ کے بیٹے تیمور شاہ نے 1772ء میں قندھار کی بجائے کابل کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس طرح اس کے لئے کوہ ہندوکش کے شمال اور دریائے سندھ کی مشرق کی جانب کے لئے فتح کئے جانے والے علاقوں کی نگرانی کرنا آسان ہو گیا۔ 1780ء میں درانیوں نے وسط ایشیا کے سب سے اہم اور بڑے حاکم امیر بخارہ سے ایک معاہدہ طے کیا، جس کی رو سے دریائے آمو، وسطی ایشیاء اور نئی افغان ریاست کے درمیان سرحد تسلیم ہوا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ نئے افغانستان کی شمالی سرحد کا تعین ہوا۔ اگلی صدی میں درانیوں کے اندرونی اختلافات نے انہیں کمزور کر دیا۔ جس کے نتیجے میں دریائے سندھ کے مشرقی جانب کے علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ تاہم ایک یا دوسرا درانی قبیلہ آئندہ دو سو برس تک افغانستان میں برسر اقتدار رہا۔ 1973ء میں محمد داؤد خان نے ظاہر شاہ کو معزول کر دیا اور افغانستان کو جمہوریہ قرار دے دیا۔ اس عرصے میں غلزئی اور درانی پشتونوں میں مخاصمت جاری رہی۔ جس نے افغانستان پر سوویت حملے کے بعد شدت اختیار کر لی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ طالبان منظر پر آئے۔

کمزور اور باہم دست وگریباں درانی بادشاہوں کو دو سلطنتوں سے بچنے کا مرحلہ درپیش رہا۔ یعنی مشرق میں انگریز اور شمال میں روسی۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے وسطی ایشیاء میں بڑھتے ہوئے روسی اثر ورسوخ سے ڈرتے ہوئے اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں روسی افغانستان پر تسلط جمانے کے بعد برطانیہ کی ہندوستانی سلطنت کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ افغانستان پر قبضہ کرنے کی ٹھانی اور اس مقصد کے لئے تین بار کوشش بھی کی، لیکن انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ جنگ کرنے کے بجائے افغانوں کو خرید لینا زیادہ آسان ہے۔ انگریزوں نے نقد رقوم دینا شروع کر دیں۔ قبائلی سرداروں کو ساتھ ملایا اور افغانستان کو اپنا خاموش تابع فرمان بنالیا۔ اس کے بعد روسیوں اور انگریزوں کے درمیان سازشوں کا نیا کھیل یا ''گریٹ گیم'' شروع ہو گئی۔ داؤ پیچ آزمائے جانے لگے۔ رشوت دینے کا سلسلہ قائم کر دیا گیا۔ جب ضرورت سمجھی تو فوجی دباؤ ڈالنے کے طریقے بھی آزمائے جانے لگے۔ اس روس اور برطانیہ دونوں طاقتوں نے ایک دوسرے سے محفوظ فاصلے پر رہنے کے لئے افغانستان کو دونوں ملکوں کے درمیان ایک غیر جانبدار ملک بنانے پر اکتفاء کیا۔

برطانیہ نے درانیوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے کے لئے انٹیلی جینس کے افسروں کو مامور کیا، جن کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ افغان بادشاہ کمزور رہیں اور اپنی مالی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے انگریزوں کے دست نگر رہیں۔ اسی دوران شمال میں غیر پشتون گروہوں نے کابل کی مرکزی حکومت کے اثر سے نکلنے کے لئے زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ شمال مغربی ہندوستان کے انگریزوں کے تسلط میں چلے جانے کے نتیجے میں پشتون بھی کمزور ہو گئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ پشتون برطانوی ہند اور افغانستان کے درمیان منقسم ہو گئے۔ 1891ء میں برطانیہ نے ڈیورنڈ لائین کے ذریعے جسے باقاعدہ سرحد کا درجہ دیا گیا، پشتونوں کو باہم بانٹ دیا گیا۔

دوسری اینگلو افغان جنگ کے بعد انگریزوں نے کابل کے تخت پر امیر عبدالرحمٰن کے دعوے کی حمایت کی، انہیں فولادی امیر کہا جانے لگا۔ 1880ء سے 1901ء تک مقتدر رہے۔ انگریزوں نے افغان ریاست کو مضبوط اور مرکزی حکومت کو موثر بنانے کے لئے امیر عبدالرحمٰن کو مدد دی۔ انہیں ایک موثر انتظامیہ چلانے اور فوج منظّم کرنے کے لئے انگریزوں کی طرف سے مالی امداد بھی مہیا ہوتی رہی اور فوجی امداد بھی۔ انہوں نے بغاوت پر آمادہ پشتون قبائل کو دبانے کے علاوہ شمال میں ہزارہ اور ازبک قومیتوں کی خودمختاری کو بے رحمی سے ختم کرنے کے لئے سخت اقدامات کئے۔ امیر عبدالرحمٰن نے جو طریقے اور حربے استعمال کئے ایک صدی بعد وہی حربے طالبان آزما رہے ہیں۔ اس نے انیسویں صدی میں نسل کشی کا سلسلہ قائم کیا۔ غیر پشتون مخالفوں کو قتل کیا اور پٹھانوں کو شمال میں زمین آباد کرنے کے لئے بھیجا تا کہ دوسری نسلی اقلیتوں کے درمیان اس کے اپنے وفادار لوگ موجود ہوں۔

امیر عبدالرحمٰن نے اپنے دورِ حکومت میں غیر پشتونوں کی 40 بغاوتیں کچل دیں۔ افغانستان کی پہلی ظالم خفیہ پولیس منظّم کی۔ 1980ء کی دہائی میں کمیونسٹ حکومت نے اسی طرز پر ''خاد'' منظّم کی۔ ان اقدامات سے افغانوں کا باہم ادغام ہوا اور افغان ریاست کو استحکام حاصل ہوا۔ 1997ء کے بعد مختلف قبائل میں جو خون ریزی ہوئی اس کا رشتہ امیر عبدالرحمٰن کی پالیسیوں سے جا ملتا ہے۔ ان کے جو دوسرے اثرات بالواسطہ طالبان پر مرتب ہوئے ہیں ان میں افغانستان کو مغرب سے کاٹنا اور جدید رجحانات سے بچا کر رکھنا شامل ہے۔ تعلیم سے متعلق رویہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ پشتون ملاؤں کے ذریعے انتہا پسندی کو رواج دینا اور حکمرانی کے لئے لویا جرگہ کی بجائے امارت کا قدیم تصور اپنانا بھی اسی کا اثر ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں امیر عبدالرحمٰن کے بعد ان کے جتنے بھی جانشین آئے وہ بڑی حد تک جدت پسند تھے۔ انہوں نے 1919ء میں برطانیہ سے مکمل آزادی حاصل

MashalBooks.org

کر لی، ملک کا پہلا آئین بنایا اور شہروں میں پڑھا لکھا اور روشن خیال طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دو افغان بادشاہ قتل ہوئے اور وقفوں سے قبائلی بغاوتیں بھی ہوتی رہیں، جو افغان حکمرانوں کی ان مشکلات کی عکاس تھیں، جو انہیں مختلف نسلوں پر مشتمل قبائلی معاشرے کو ایک جدید ریاست میں ڈھالنے کے ضمن میں پیش آئیں۔

درانی خاندان، شاہ ظاہر شاہ کی معزولی کے ساتھ ختم ہوا۔ انہیں ان کے عم زاد اور داماد سردار محمد داؤد نے تخت سے اتارا اور جلا وطن کر دیا۔ شاہ ظاہر شاہ روم میں جا بسے، افغانستان کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا اور سردار داؤد نے صدر کا منصب سنبھال لیا۔ اسلامی بنیاد پرستی کی تحریک کچلنے کے سلسلے میں انہیں فوج کے بائیں بازو کے افسروں اور ببرک کارمل کی پرچم پارٹی کی حمایت حاصل رہی۔ 1975ء میں مخالف تحریک کے لیڈر فرار ہو کر پاکستان چلے گئے۔ جہاں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ان کی پیٹھ تھپکی اور انہیں سردار داؤد کی مخالفت کرتے رہنے پر اکسایا۔ ان لیڈروں میں گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود شامل تھے۔ بعد میں انہوں نے ہی مجاہدین کی قیادت کی۔ سردار داؤد نے ریاستی ڈھانچے کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے سوویت یونین کی طرف رجوع کیا۔ سوویت یونین نے سرد جنگ کے عروج کے زمانے میں 1965ء سے 1978ء تک افغانستان کو 26ء1 ارب امریکی ڈالر کی مالی امداد اور 25ء1 ارب امریکی ڈالر کی فوجی امداد دی۔ اسی عرصے میں امریکہ نے افغانستان کو مجموعی طور پر 533 ملین امریکی ڈالر کی امداد فراہم کی۔ 1950ء کے عشرے کے بعد امریکہ کی افغانستان سے دلچسپی ختم ہوگئی۔ داؤد کے اقتدار سنبھالنے کے بعد افغانستان کا بیرونی امداد پر انحصار بڑھ گیا۔ 40 فیصد ریاستی مصارف غیر ملکی مالی امداد سے بھی پورے ہونے لگے۔ سردار داؤد اپنے پیش روشاہی حکمرانوں کی طرح ریاستی ادارے قائم کرنے میں ناکام رہے۔ ان کی بجائے مرکز کا زیر انتظام ایک ڈھیلی ڈھالی بیوروکریسی کے

سہارے کام چلایا جانے لگا۔ اس میں عوام کو بہت کم نمائندگی حاصل تھی۔ البتہ لویا جرگہ موجود رہا۔ جس کے ارکان نامزد کئے جاتے تھے۔ پانچ برس بعد اپریل 1978ء میں فوج کے مارکسی رجحان رکھنے والے افسروں نے جن کی سوویٹ یونین میں تربیت ہوئی تھی اور جنہوں نے 1973ء میں سردار داؤد کو اقتدار میں لانے میں مدد دی تھی، خونی فوجی انقلاب بپا کر دیا۔ سردار داؤد اور ان کے خاندان کے افراد قتل کر دیئے گئے۔ صدارتی محل کے محافظ بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ کمیونسٹ دو مخالف دھڑوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک خلق تھا اور دوسرا پرچم۔ افغانستان کی پیچیدہ قبائلی معاشرے کے بارے میں ان کی لاعلمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیہی علاقوں میں ان کے خلاف بغاوتیں سر اٹھانے لگیں۔ ملاؤں اور خواتین نے کمیونسٹوں کو دیرپا قرار دے کر ان کے خلاف جہاد شروع کر دیا جو کمیونسٹ برسر اقتدار تھے، وہ بھی باہمی تشدد اور تصادم میں الجھ گئے۔ ''خلق'' سے تعلق رکھنے والے کمیونسٹ صدر نور محمد ترکئی قتل ہوئے، ان کے بعد حفیظ اللہ امین نے اقتدار سنبھالا لیکن انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔ دسمبر 1979ء میں سوویٹ فوج نے افغانستان پر حملہ کیا اور پرچم پارٹی کا لیڈر ببرک کارمل کو صدر بنا دیا گیا۔

چند ہی ماہ میں افغانستان، سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ کا مرکز بن گیا۔ مجاہدین کو امریکہ کی مدد اور پشت پناہی حاصل ہوگئی۔ ان کے نزدیک سوویت حملے کا مقصد مجاہدین کو بے دست و پا کرنا اور ان کے مذہب کی جگہ ایک بیرونی نظریہ اور معاشرتی نظام قائم کرنا تھا۔ امریکہ، چین اور عرب ملکوں نے مجاہدین کی مالی اور فوجی امداد کرنا شروع کی تو ان کی تحریک کو نئی تقویت حاصل ہوگئی۔ اس کشمکش میں پندرہ لاکھ افغان مارے گئے۔ 1989ء میں جب افغانستان سے سوویت فوجیں نکلیں تو اس وقت تک مجاہدین کی دوسری نسل تیار ہو چکی تھی، جو طالبان کہلاتی ہے۔

قندھار: 1994

طالبان کے ماخذ

قندھار کے طالبان گورنر ملا محمد حسن رحمانی کی عادت ہے کہ وہ اپنے سامنے رکھی میز کو پاؤں سے دھکیلتے رہتے ہیں۔ گفتگو ختم ہونے تک وہ میز کو کوئی بارہ مرتبہ ادھر ادھر دھکیل چکے ہوتے ہیں۔ انہیں شائد کوئی نفسیاتی عارضہ ہے یا وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کی ایک ٹانگ ابھی محفوظ ہے یا پھر وہ ہمہ وقت ٹانگ کی ورزش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دوسری ٹانگ نقلی ہے اور لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ لکڑی کی ٹانگ کا پالش اتر گیا ہے۔ دفتر کی باہر کی زمین پتھریلی اور ناہموار ہے۔ اسی پر چلنے کا نتیجہ ہے کہ نقلی ٹانگ کا رنگ روغن باقی نہیں رہا۔ اس پر لکیریں پڑ گئی ہیں اور جگہ جگہ سے لکڑی کے ریشے اکھڑ گئے ہیں۔ ملا محمد حسن کی عمر 40 برس کے لگ بھگ ہے۔ ان کا شمار طالبان کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ تحریک میں ملا عمر کے بعد دوسرا درجہ انہی کا ہے۔ ان کی ٹانگ 1989ء میں قندھار کے محاذ پر کٹی۔ یہ افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء سے کچھ ہی پہلے کی بات ہے۔ اس کے باوجود کہ افغانستان کے لاکھوں افراد کو مصنوعی اعضاء لگ چکے ہیں۔ ملا محمد حسن نے پرانی بے ڈول سی مصنوعی ٹانگ ہی کو اپنا سہارا بنائے رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ کی انگلی کی ایک پور بھی بم کا ٹکڑا لگنے سے کٹ چکی ہے۔ طالبان کے قائدین پوری دنیا میں جسمانی طور پر سب سے زیادہ معذور ہیں۔ اس پر انہیں ایک طرح سے فخر بھی ہے۔ دیکھنے والوں کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ان کی جسمانی معذوری پر افسوس کا اظہار کریں یا ہنس دیں۔ 1989ء میں ملا عمر کی ایک آنکھ

ضائع ہوگئی تھی، یہ ان کے قریب ایک راکٹ پھٹنے سے ہوا۔ وزیر انصاف ندر الدین ترابی اور سابق وزیر خارجہ محمد غوث کی بھی ایک، ایک آنکھ ہے، یعنی یک چشم ہیں۔ کابل کے میئر عبدالمجید کی ایک ٹانگ اور ہاتھ کی دو انگلیاں نہیں ہیں۔ دوسرے لیڈروں کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ ان میں بعض فوجی کمانڈر بھی شامل ہیں۔ طالبان کا اصل زخم گزشتہ بیس برس میں پندرہ لاکھ افغان باشندوں کی ہلاکت اور ملک کی ہمہ گیر تباہی ہے۔ سوویت یونین مجاہدین کو بے اثر کرنے کی غرض سے ہر سال 5 ارب ڈالر دیتا رہا۔ اس نے کل 45 ارب ڈالر دیئے لیکن بے سود۔ 1980ء اور 1992ء کے دوران امریکہ نے مجاہدین کو چار سے پانچ ارب ڈالر دیئے۔ سعودی عرب کے علاوہ دوسرے عرب اور یورپی ملکوں نے دس ارب ڈالر، زیادہ تر جدید فوجی ساز و سامان کی صورت میں دیئے۔ ان کے استحصال سے بڑے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔

طالبان رہنماؤں کے زخم 1980ء کے عشرے میں قندھار کے گرد و نواح پر لڑی جانے والی خون ریزی کی یاد دلاتے ہیں۔ جنوب اور قندھار میں بسنے والے درانی پشتونوں کو سی آئی اے اور مغربی ذرائع سے مقابلتاً کم امداد ملی ہے وہ بھی طبی سہولتوں کی شکل میں، مشرق اور کابل میں رہنے والے غلزئی پشتونوں کو ان سے کہیں زیادہ امداد دی گئی۔ امداد پاکستان کی آئی ایس آئی کے ذریعے تقسیم ہوئی جس نے قندھار کو دور افتادہ اور درانی پشتونوں کو مشکوک سمجھ کر چنداں اہمیت نہ دی۔ یہی سبب ہے کہ قندھار میں زخمی ہونے والوں کو علاج کے لئے دور دراز کے نہایت صبر آزما اور تکلیف دہ سفر کے بعد جو اونٹوں کے ذریعے کرنا پڑتا ہے، کوئٹہ بھیجا جاتا ہے۔ قندھار میں آج بھی ابتدائی طبی امداد کا کوئی تصور اور انتظام نہیں ہے۔ ڈاکٹر اور سرجن نایاب ہیں۔ ریڈ کراس نے جو چند ہسپتال قائم کر رکھے ہیں بس ان میں چند ڈاکٹر موجود ہیں۔

1979ء میں اتفاق سے میں قندھار میں تھا۔ جہاں میں نے پہلے سوویت ٹینک کو آتے دیکھا۔ سوویت ٹینکوں کے نوعمر ڈرائیور وسطی ایشیاء کی سوویت ری پبلک

ترکمانستان سے ہرات آئے تھے۔ وہاں سے انہیں اپنے ٹینک قندھار لانے کے لئے پختہ سڑک مل گئی تھی جو 1960ء کے عشرے میں سوویت یونین نے ہی بنائی تھی۔ سوویت سپاہیوں کی اکثریت کا تعلق وسطی ایشیاء کی جمہوریتوں سے تھا۔ وہ اپنے ٹینکوں سے نکلے، اپنی وردیوں کو جھاڑا اور بغیر چینی کے سبز چائے کا ایک پیالہ پینے کے لئے قریبی چائے خانے میں چلے گئے۔ قندھار اور وسطی ایشیاء میں سبز چائے پینے کا رواج ہے۔ بازار میں افغان کھڑے دیکھتے رہے۔ 27 دسمبر کو سوویت کی سپیشل فورسز نے صدارتی محل پر ہلہ بول دیا۔ صدر حفیظ اللہ امین کو قتل کر دیا۔ کابل پر قبضہ کیا اور ببرک کارمل کو افغانستان کا صدر بنا دیا۔

قندھار کے گرد و پیش میں جو مزاحمت شروع ہوئی درانی قبائیل نے کی تھی۔ یہ قبائیلی سرداروں اور علماء کا سوویت یونین کے خلاف مشترکہ جہاد تھا۔ اس کی اساس اسلامی نظریہ نہیں تھا۔ پشاور میں مجاہدین کی سات پارٹیاں تھیں۔ پاکستان نے انہیں قبول کر رکھا تھا۔ انہیں سی آئی اے کی امداد میں سے ایک حصہ مل رہا تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان سات پارٹیوں میں سے کسی کی قیادت بھی کسی درانی کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ قندھار میں انہیں اثر ونفوذ حاصل تھا۔ جنوب میں زیادہ مقبول وہ پارٹیاں تھیں جنھوں نے روابط کو اہم سمجھا تھا۔ مثال کے طور پر مولوی محمد نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی اور مولوی یونس خالص کی حزب اسلامی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے یہ دونوں لیڈر پشتون علاقے میں خاصے مقبول تھے۔ انہوں نے اپنے مدرسے کھول رکھے تھے۔

جنوبی علاقے کی پارٹی کے کمانڈروں کے نزدیک وفاداری جانچنے کا ایک ہی معیار تھا کہ پشاور سے کون سا لیڈر انہیں مالی اور فوجی امداد دیتا ہے۔ ملا عمر یونس خالص کی حزب اسلامی میں شامل ہو گئے اور ملا حسن حرکت انقلاب میں۔ حسن نے بتایا کہ میں ملا عمر کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن ہم مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے اور مختلف گروہوں میں شامل تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ باہم مل کر بھی لڑے، پیر سید احمد گیلانی کا نیشنل اسلامی

فرنٹ بھی مقبول تھا۔ اسی نے سابق درانی شاہ ظاہر شاہ کے واپس آنے اور افغان مزاحمت کی قیادت کرنے کی تحریک کی تھی، جس کی پاکستان اور امریکہ نے سخت مخالفت کی۔ سابق شاہ روم میں رہتے تھے اور وہ قندھاریوں میں بہت مقبول تھے۔ جن کا خیال تھا کہ شاہ واپس آئے تو درانی قبائیل کو پھر سے اہمیت حاصل ہو جائے گی۔

پشتون مجاہدین کی قیادت کے اندرونی تضادات جنگ کے جاری رہنے کے ساتھ ہی پشتونوں کو کمزور کرنے کا موجب بنے۔ علماء اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کے نصب العین اور اعمال و احکام کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، انہوں نے شاید ہی کبھی روایتی افغان قبائیلی انتظامات سے اختلاف کیا ہو۔ جرگہ بھی ایک ایسا ہی ادارہ ہے، جو انہیں قبول ہے۔ نسلی اقلیتوں کو بھی وہ بخوشی برداشت کر لیتے ہیں، وہ افغانستان میں انقلاب لانے کے لئے قبائیلی ڈھانچے کی نفی کرنا ضروری جانتے ہیں۔ ان کی انتہا پسندی اقلیتی قبائیل کو شک میں ڈالنے کا سبب بن جاتی ہے۔

حرکت انقلاب اسلامی کوئی منظّم جماعتی ڈھانچہ نہیں۔ اسے کمانڈروں اور قبائیلی سرداروں کا ڈھیلا ڈھالا اتحاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی نے ایک ایسی مضبوط تنظیم قائم کر رکھی ہے، جس میں پڑھے لکھے شہری پشتون شامل ہیں۔ جنگ سے پہلے افغان معاشرے میں اسلام پسندوں کی کوئی جگہ اور مقام نہیں تھا، لیکن سی آئی اے سے روپیہ پیسہ اور ہتھیار ملنے اور پاکستان کی حمایت حاصل ہونے سے انہوں نے ایک شاندار اور مربوط شکل اختیار کر لی ہے۔ روایت پسند اور اسلام دوست 1994ء تک اس بے رحمی سے باہم لڑتے رہے کہ قندھار میں روایتی لیڈرشپ تقریبا" ختم ہوگئی۔ نتیجے میں انتہا پسند اسلام پسندوں (طالبان) کو کھیل کھیلنے کے لئے وسیع میدان مل گیا۔

(قندھار کی جنگ کا فیصلہ اس کی اپنی خصوصی تاریخ کی بنا پر ہوا، قندھار، افغانستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ 1979ء میں جنگ سے پہلے کے اعداد و شمار کے مطابق اس کی

MashalBooks.org

آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی۔ آج یہ بڑھ کر دگنی ہوگئی ہے۔ پرانا شہر 500 قبل مسیح میں بسا تھا اور تب سے قائم ہے۔ اس کے 35 میل کے فاصلے پر منڈی گاک نامی گاؤں ہے۔ یہ تین ہزار برس قبل مسیح سے آباد چلا آ رہا ہے۔ یہ وادی سندھ کی تہذیب کا حصہ تھا۔ قندھار قدیم تجارتی راستوں کے سنگم پر واقع تھا، اسی وجہ سے اس کے باسی تجارت سے وابستہ ہے، مشرق کی جانب درہ بولان سے گزر کر وہ سندھ، بحیرہ عرب اور ہندوستان تک پہنچے تھے۔ مغرب میں ہرات اور ایران ان کی منزل تھی۔ ایران اور ہندوستان کے درمیان سامان تجارت ہی نہیں، فنون اور دستکاریوں کا بھی تبادلہ ہوتا تھا۔ قندھار کے بازار صدیوں سے مشہور چلے آتے ہیں۔ درانی خاندان کے بانی، احمد شاہ درانی نے 1761ء میں اس شہر کی جتنی توسیع کی تھی، نیا شہر بڑی حد تک اسی میں محدود ہے۔ درانیوں نے قندھار ہی سے افغان ریاست کی داغ بیل ڈالی اور پھر 300 برس تک اس پر حکمرانی کی۔ اسی طفیل قندھاریوں کو پشتونوں میں خصوصی حیثیت حاصل رہی۔ کابل کے بادشاہوں کے لئے قندھار وطن کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے یہاں کے رہنے والوں کو فوج میں بھرتی نہ ہونے کی رعایت دے رکھی تھی۔ احمد شاہ کا مزار بڑے بازار کے وسط میں ہے، جہاں ہزاروں افغان آتے ہیں اور قوم کے بانی سے اپنی عقیدت کا اظہار اور اس کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔

احمد شاہ کے مزار کے پاس ایک درگاہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ رکھا ہوا ہے۔ اسی سبب سے اس درگاہ کو پورے افغانستان میں مقدس ترین سمجھا جاتا ہے۔ اس جبہ کی خاص وقت ہی زیارت کی جاتی ہے۔ مثلاً 1929ء میں جب امان اللہ نے پشتون قبائیل کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تو اسے جبہ کی زیارت کی عام اجازت دی گئی یا 1935ء میں شہر میں ہیضہ پھوٹ پڑنے پر دافع بلیات کے لئے اسے منظر عام پر لایا گیا۔ 1996ء میں ملا عمر نے اپنے آپ کو خدا کی طرف سے مامور امیر المومنین قرار دیتے وقت بھی اس جبہ کی عام زیارت کرائی۔

قندھار کی شہرت کا ایک سبب اس کے پھولوں کے باغات ہیں۔ یہ شہر دراصل چاروں طرف پھیلے ہوئے صحرا میں نخلستان کا درجہ رکھتا ہے۔ گرمیوں میں یہ علاقہ تنور کی طرح تپنے لگتا ہے۔لیکن قندھار کا موسم معتدل رہتا ہے۔

قندھار کے سرسبز کھیت اور پھل دار درختوں کو اپنے دامن میں سمیٹے باغات، یہاں کے رہنے والوں کے لئے آرام اور عافیت کا وسیلہ ہیں۔ یہاں کے انگور، خربوزے، انجیر، ناشپاتیاں، انار ہندوستان اور ایران تک جاتے ہیں اور وہاں بہت مرغوب سمجھے جاتے ہیں۔ قندھاری اناروں کا ذکر ایرانی شعر و ادب میں صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے۔ گزشتہ صدی میں یہاں کے انار دہلی میں وائسرائے ہند کے دستر خوان پر موجود رہے۔ قندھار کے ٹرک ڈرائیور عرصے سے دہلی اور کلکتہ تک پھل لے جانے کا ذریعہ رہے اور اب وہ طالبان کے لئے مالی امداد کا وسیلہ ہیں۔ پہلے باغات کو سیراب کرنے کے لئے ایک نہایت پیچیدہ لیکن موثر نظام قائم تھا، سوویت فوجوں اور مجاہدین میں جنگ چھڑی تو اس علاقے میں وسیع پیمانے پر بارودی سرنگیں بچھا دی گئیں۔ کاشتکار اور باغبان سب کچھ چھوڑ کر پاکستان بھاگ گئے۔ قندھار کے اردگرد آج بھی ہزاروں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا شہر سرنگوں کے باب میں اس کا حریف ہو۔ شہر کے نواح کے ہموار اور مسطح علاقے، باغات اور نہروں نے مجاہدین کے لئے پناہ گاہ کا کام دیا۔ وہ دیہی علاقے پر قبضہ کرنے اور سوویت فوج کو شہر تک محدود رکھنے میں کامیاب رہے۔ سوویت فوج نے ہزاروں درخت کاٹ پھینکے اور آبپاشی کا نظام تباہ کر ڈالا۔ 1990ء میں جب مہاجر واپس اپنے گھروں میں آئے تو انہیں زندہ رہنے کے لئے پوست کی کاشت کرنا پڑی جو طالبان کے لئے سرمائے کی فراہمی کا بھی ذریعہ ثابت ہوئی۔

1989ء میں سوویت فوجوں کے انخلاء کے بعد صدر نجیب اللہ کے خلاف طویل جدوجہد کا آغاز ہوا۔ 1992ء میں صدر نجیب معزول اور محروم اقتدار ہوئے اور کابل

مجاہدین کے قبضے میں چلا گیا۔ بعد کی خانہ جنگی کی بنا یہ حقیقت تھی کہ کابل پر ان پشتون پارٹیوں کو غلبہ حاصل نہ ہو سکا، جن کا مستقر پشاور تھا۔ ان کی بجائے برہان الدین ربانی اور کمانڈر احمد شاہ مسعود کی مقابل، بہتر منظم تاجک فوجوں اور شمال سے جنرل رشید دوستم کے ازبک دستوں نے کابل میں قدم جما لئے۔ یہ پشتونوں کے لئے بہت بڑا نفسیاتی دھچکا تھا۔ 300 برس میں یہ پہلا موقع تھا کہ دارالحکومت ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، جلد ہی حکمت یار نے پشتونوں کو اکٹھا کیا، کابل کا محاصرہ کر لیا اور اس پر بڑی تندی سے گولہ باری شروع کر دی۔ اس لئے افغانستان میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔

1994ء میں طالبان کے منظر پر آنے سے پہلے افغانستان کے حصے بخرے ہونے کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ ایک طرف قبائلی سردار تھے جو اتحاد بناتے، بگاڑتے، وفاداری بدلتے اور باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ کابل کے نواح اور شمال مشرقی علاقے پر صدر برہان الدین ربانی کی تاجک حکومت کی عمل داری تھی۔ مغرب کی طرف کے تین صوبوں پر (ہرات جن کے وسط میں تھا) اسماعیل خان کے کنٹرول میں تھا۔ مشرق میں پاکستان کی سرحد کے پاس کے تین پشتون صوبے مجاہدین کی شوریٰ کے پاس تھے۔ شوریٰ کا مرکز جلال آباد تھا۔ کابل کے شمال اور مشرق کا ایک چھوٹا سا علاقہ گلبدین حکمت یار کے زیر اثر تھا۔ شمال میں ازبک جنرل رشید و دوستم چھ صوبوں پر حاوی تھا۔ جنوری 1994ء میں اس نے صدر برہان الدین ربانی کی حکومت سے اتحاد ختم کر دیا اور کابل پر حملہ کرنے کی غرض سے گلبدین حکمت یار سے اتحاد قائم کر لیا۔ وسطی افغانستان کے صوبہ بامیان پر ہزارہ قبیلے کا غلبہ تھا۔ جنوبی افغانستان اور قندھار درجنوں سرداروں میں بٹا ہوا تھا۔ جنہوں نے مقامی آبادی میں لوٹ مار شروع کر رکھی تھی۔ پشتونوں کا ڈھانچہ بکھرا ہوا اور معیشت انتشار کا شکار تھی، مرکزی قیادت پر کوئی اتفاق نہیں تھا۔ پاکستان جس طرح گلبدین حکمت یار کی مدد کرتا آیا تھا، اس طرح درانیوں کی فوجی امداد کرنے پر تیار نہیں تھا۔ جنوب کی جانب کے پشتونوں میں باہم لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔

MashalBooks.org

قندھار متحارب گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اسی لئے بین الاقوامی امدادی ادارے کسی قسم کی امداد فراہم کرنے سے جھجکتے تھے۔ قندھاریوں کے لیڈروں نے ہر چیز پاکستانی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔ حتیٰ کہ ٹیلی فون کے تار کھمبوں سے اتار کر بیچ ڈالے تھے۔ درخت کاٹ دیئے، فیکٹریاں، مشینری اور روڈ رولر تک بیچ کھائے۔ جنگی سرداروں نے لوگوں کو ان کے گھروں اور کھیتوں سے نکال دیا اور یہ گھر اور کھیت اپنے حامیوں میں تقسیم کر دیئے۔ جنگی سردار من مانی کرتے، اپنی جنسی اور نفسیاتی تسکین کے لئے نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اغوا کر لیتے، بازاروں میں سوداگروں کو لوٹ لیتے اور گلی کوچوں میں لڑنے جھگڑنے اور خون بہانے میں لگ جاتے۔ پاکستان سے مہاجروں کی آمد شروع ہوئی تو نئے مہاجر قندھار سے کوئٹہ جانے لگے۔ یہ صورت حال کوئٹہ اور قندھار کے بااثر ٹرانسپورٹروں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اس کے باعث کاروبار میں خسارے سے دوچار تھے۔ میں نے 1993ء میں کوئٹہ سے قندھار کی طرف 130 میل کا سفر کیا تو کم و بیش 20 مختلف گروپوں نے ہمیں روکا۔ انہوں نے زنجیریں ڈال کر راستہ بند کر رکھا تھا۔ وہ گزرنے کے لئے ٹول ٹیکس مانگتے تھے۔ ٹرانسپورٹ مافیا کے لئے راستے کی یہ بندشیں بے حد ناگوار تھیں۔ وہ کوئٹہ، ایران اور ترکمانستان کے درمیان آزادانہ نقل و حمل اور بلا روک ٹوک سمگلنگ کے لئے چاہتے تھے کہ راستے کھلے رہیں۔ لیکن اب انہیں دشواری پیش آ رہی تھی۔

جب مجاہدین نے نجیب اللہ کی حکومت کے خلاف جنگ کی تھی، وہ بعد میں اپنے گھروں میں واپس چلے گئے یا کوئٹہ اور قندھار کے دینی مدرسوں میں تعلیم مکمل کرنے لگے تھے، ان کے لئے بھی یہ صورت حال بڑی ناگوار اور پریشان کن تھی۔ ملا حسن نے بتایا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ملا عمر، ملا غوث، ملا محمد ربانی اور میں باہم واقف ہیں۔ ہم سب کا تعلق عروض گان صوبے سے ہے اور ہم نے مل کر لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ میں کوئٹہ آتا جاتا رہا اور وہاں کے مدرسوں میں پڑھتا رہا۔ ہم جب باہم ملتے تو ڈاکوؤں

کے زیر تسلط رہنے والے لوگوں کے مصائب و آلام کے بارے میں بات چیت کرتے، ہم سب ہم خیال تھے۔ ایک دوسرے سے رفاقت کرنے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمیں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ طالبان کے یک چشم وزیر خارجہ ملا غلام غوث نے بھی کم و پیش یہی کہا کہ ہم دیر تک بیٹھے غور کرتے رہے کہ اس افسوسناک صورت حال کو کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں، کبھی سوچتے کہ ہم ناکام رہیں گے۔ لیکن ہم اتنا جانتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔ ہم یہاں تک اس لئے پہنچ پائے ہیں کہ اللہ نے ہماری مدد کی ہے۔ جنوب کے سبھی مجاہدین انہی مسائل پر غور و فکر کر رہے تھے۔ سب کسی نہ کسی حل کی تلاش میں تھے۔ وزیر صحت ملا محمد عباس بولے کہ میرا تعلق قندھار سے 85 میل شمال میں صوبہ زبول کے قصبے قلات سے ہے۔ میں نے ایک مدرسے میں داخلہ لے لیا لیکن صورت حال اس درجہ خراب اور افسوسناک تھی کہ ہماری توجہ پڑھنے سے ہٹ گئی۔ دوستوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ پہلے مجاہدین امن قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں، چند دوستوں کے ساتھ شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لئے ہرات گیا۔ یہ اجلاس اسماعیل خان نے بلایا تھا۔ اس میں بھی اصلاح احوال کے لئے کوئی حل تجویز نہ کیا جا سکا۔ حالات بدتر ہو رہے تھے۔ ہم ملا عمر سے ملنے قندھار آئے اور ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مختلف الخیال لیکن یکساں طور پر تشویش میں مبتلا افراد نے اپنے لئے ایک لائحہ عمل طے کر لیا۔ طالبان آج بھی اسی پر کاربند ہیں، ان کے اہم مقاصد میں امن کا قیام لوگوں کو غیر مسلح کرنا، شرعی قوانین نافذ کرنا، افغانستان کی سالمیت اور اسلامی کردار اور تشخص کا دفاع کرنا شامل ہے۔ مدرسوں کے کل وقتی یا جز وقتی طلبا ہونے کے ناتے انہوں نے اپنی تنظیم کو طالبان کا نام دیا۔ یہ نام رکھ لینے کے بعد وہ جماعتی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور اعلان کیا کہ اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح اور تطہیر کرنا ان کا مقصود ہے۔ ملا عمر کے گرد جمع ہونے والے نوعمر طلباء مجاہدین کے قائدین

MashalBooks.org

کی گروہ بندیوں اور مجرمانہ سرگرمیوں سے بیزار تھے۔ یہ مجاہد کبھی واجب الاحترام اور لائق تقلید گردانے جاتے تھے، لیکن اپنی خفیف حرکات کے سبب طالبان کی نظر سے گر گئے۔ طالبان نے چھاپہ مار جنگ کو صحیح رخ پر رکھنے، معاشرتی نظام کی خرابیوں کو دور کرنے اور اسلامی طرز زندگی کو بدعنوانی اور زیادتیوں کے اثرات سے پاک کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اکثر طالبان کی پیدائش پاکستان میں قائم افغان مہاجروں کے کیمپوں میں ہوئی تھی۔ انہوں نے پاکستانی مدرسوں میں تعلیم پائی اور پشاور میں موجود مجاہدین کی جماعتوں سے فوجی تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اپنے ملک افغانستان کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ وہ افغانستان کی تاریخ سے بھی ناواقف تھے۔ انہیں اپنے مدرسوں سے چودہ سال پہلے کی اسلامی معاشرت کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا، وہ اسے عمل میں ڈھانچہ اور ویسا ہی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے۔

بعض طالبان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ملا عمر کو اپنا رہنما اس لئے تسلیم نہیں کیا کہ وہ سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں یا عسکری صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، بلکہ ان کی پرہیزگاری اور اسلام سے غیر متزلزل وابستگی، اس پر مکمل ایمان کو ملحوظ رکھ کر انہیں اپنی قیادت سونپی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے انہیں ہمارے لئے منتخب کیا ہے۔ ملا حسین نے کہا کہ وہ ہمیں میں سے ہیں، ہم نے انہیں رہنمائی کے لئے چنا ہے اور انہوں نے ہمیں عوام کے مسائل حل کرنے کا اختیار دیا ہے۔ ملا عمر نے پاکستانی صحافی رحیم اللہ یوسف زئی سے کہا کہ ہم نے افغان جہاد کو مقاصد پورے کرنے اور عوام کو نام نہاد مجاہدین کے ہاتھوں ظلم و زیادتی کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے ہتھیار اٹھائے ہیں۔ ہمارا اللہ پر مکمل ایمان ہے۔ یہ ہم ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھولتے، اللہ تعالیٰ ہمیں فتح سے ہمکنار یا شکست سے دوچار کرسکتا ہے۔

آج دنیا میں ملا عمر کے سوائے شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس پر رازداری اور اخفاء کا ایسا دبیز پردہ پڑا ہو۔ ان کی عمر 39 برس ہے۔ ان کی کبھی فوٹو نہیں اتری، وہ کبھی کسی مغربی

سفارت کار یا صحافی سے نہیں ملے۔ اقوام متحدہ کے کسی نمائندے سے ان کی ملاقات اکتوبر 1998ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک طالبان کو سامنے آئے صرف چار برس ہوئے تھے۔ یہ افغانستان سے متعلق اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے لخذار براہیمی تھے۔ ان سے ملاقات کی وجہ شاید یہ تھی کہ افغانستان کو ایران کی طرف سے تباہ کن حملے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ ملا عمر قندھار میں رہتے ہیں، وہ صرف دو بار کابل گئے ہیں وہ بھی بہت مختصر سے وقفے کے لئے، ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا، افغانوں اور غیر ملکی سفارت کاروں کے لئے ہمہ وقتی مصروفیت بن گیا ہے۔ ملا عمر 1959ء کے آس پاس قندھار کے قریب کے ایک گاؤں نودہ کے ایک غریب اور بے زمین خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ پشتونوں کی غلزئی شاخ کے ''ہوتک'' قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہوتک قبیلے کے سردار میر ویس نے 1721ء میں ایران کے شہر اصفہان پر قبضہ کیا تھا اور ایران میں پہلی غلزئی افغان سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جلد ہی احمد شاہ ابدالی نے اس کی جگہ لے لی۔ ملا عمر کو کوئی قبائیلی یا سماجی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ قندھار کے معززین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس خاندان کے بارے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ 1980ء کے عشرے میں ملا عمر کا خاندان نقل مکانی کر کے صوبہ عروض گان کے علاقہ نارن کوٹ چلا گیا۔ یہ بے حد پسماندہ اور دور افتادہ علاقہ ہے، سوویت فوج شاید ہی کبھی یہاں پہنچ پائی ہو۔ ملا عمر نے ابھی نوجوانی میں قدم رکھا تھا کہ ان کے والد وفات پا گئے۔ اب ماں اور دوسرے اہل خانہ کے لئے نان نفقے کا بندوبست کرنا ان کی ذمہ داری ٹھہری۔ وہ روزگار کی تلاش میں صوبہ قندھار کے ضلع میوند کے گاؤں چلے گئے، جہاں انہوں نے مسجد کی امامت سنبھال لی اور ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا۔ ان کی اپنی تعلیم میں دو مرتبہ رخنہ پڑا۔ ایک سوویت فوج کے حملے کے باعث اور دوسرا طالبان کے قیام کے سبب ملا عمر خالص کی حزب اسلامی میں شامل ہو گئے اور 1989ء سے 1992ء کے درمیانی عرصے میں کمانڈر نیک محمد کی کمان میں نجیب اللہ کی حکومت کے خلاف مصروف پیکار رہے وہ چار مرتبہ زخمی

ہوئے۔ ایک زخم ان کی دائیں آنکھ میں لگا، جس سے ان کی یہ آنکھ مستقل طور پر ضائع ہوگئی۔ (طالبان کی کامیابی کے باوجود سنگیسر کی دوسرے پشتون علاقے آج بھی پسماندہ ہے۔ یہاں کے گھر مٹی کے بنے ہیں، انہیں مٹی اور بھوسے کے آمیزے سے لیپ کیا جاتا ہے۔ گرداگرد مٹی کی اونچی فیصل کھڑی کر لی جاتی ہے۔ یہ دفاع اور حفاظت کا روایتی پشتون انتظام ہے۔ گاؤں کی گلیاں تنگ اور گرد آلود ہیں، بارش ہو جائے تو کیچڑ سے بھر جاتی ہیں۔ ملا عمر کا مدرسہ آج بھی موجود ہے۔ مٹی کا چھوٹا سا گھروندہ جس کے کچے فرش پر بیٹھنے اور آرام کرنے کے لئے چٹائیاں ڈال دی گئی ہیں، ملا عمر کی تین بیویاں ہیں، وہ گاؤں میں ہی رہتی ہیں اور سخت پردہ کرتی ہیں۔ اس کی پہلی اور تیسری بیوی عروضگان کی رہنے والی ہیں۔ ان کی دوسری نوجوان بیوی گل جاناں سنگسیر سے ہے۔ اس سے انہوں نے 1995ء میں شادی کی تھی، ان کے پانچ بچے ہیں، جو مدرسے میں پڑھ رہے ہیں۔ وہ لمبے تڑنگے آدمی ہیں، ان کی داڑھی لمبی اور کالی ہے، سر پر کالی پگڑی باندھتے ہیں۔ ان میں شاید حس مزاح ہے ہی نہیں، کبھی کبھار ہنس بول لیتے ہیں۔ باہر کے خاص طور پر بیرونی لوگوں سے کم ہی ملتے ہیں۔ طالبان سے ملنے میں انہیں کوئی حجاب اور تکلف نہیں، وہ جب چاہیں ان سے مل سکتے ہیں۔ جب طالبان کی تحریک شروع ہوئی تو ملا عمر نماز جمعہ قندھار کی بڑی مسجد میں ادا کرتے اور لوگوں میں گھل مل جاتے تھے۔ بعد میں کم آمیز ہو گئے اور قندھار کے انتظامی دفاتر سے بہت کم باہر نکلنے لگے۔ ان کی رہائش بھی یہیں ہے۔ وہ اپنے گاؤں بھی کم ہی جاتے ہیں، جب جاتے ہیں تو جاپانی جیپ گاڑیوں کا ایک دستہ اور بیسیوں محافظ ان کے ساتھ چلتے ہیں۔

ملا عمر بہت کم بولتے ہیں، شوریٰ کے اجلاس میں زیادہ تر خاموش رہتے ہیں اور دوسروں کے خیالات غور سے سنتے ہیں۔ جھجک اور شرمیلے پن کی وجہ سے وہ اچھی تقریر نہیں کر سکتے۔ تقدس کے باوجود ان میں کوئی کرشماتی کشش نہیں۔ وہ سارا دن ایک چھوٹے سے دفتر میں بیٹھے کام نمٹانے میں مصروف رہتے ہیں۔ پہلے وہ سیمنٹ کے فرش

پر بیٹھ کر آنے والے طالبان سے بات چیت کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بستر پر اور دوسرے لوگ فرش پر بیٹھتے ہیں، یہ تبدیلی غالباً ان کے لیڈر ہونے کے اظہار کے طور پر آئی ہے۔ ان کے کئی سیکرٹری ہیں جو کمانڈروں، عام سپاہیوں، علماء اور درخواست گزاروں سے ان کی گفتگو کے اہم نکات لکھتے جاتے ہیں۔ اسی دوران ملک کے دور دراز علاقوں سے کمانڈروں کے پیغامات وائرلیس پر آتے رہتے ہیں۔ طویل بحث تمحیص کے بعد چٹوں اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر کمانڈروں کے نام ہدایات جاری ہوتی ہیں کہ فلاں جگہ حملہ کر دیں۔ اس طرح طالبان گورنروں کو کسی درخواست گزار کی داد رسی کرنے کے لئے کہا جاتا ہے یا اقوام متحدہ کے نمائندوں اور مصالحت کنندوں کو پیغام دیئے جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں غیر ملکی سفارت خانوں کو جو رسمی پیغامات بھجوائے جاتے ہیں، وہ بالعموم پاکستانی مشیر لکھواتے ہیں۔

طالبان تحریک کے شروع کے دنوں میں، مجھے ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لئے جو راہداری دی جاتی تھی وہ سگریٹ کی ڈبیوں یا گڈی کاغذ پر لکھی ہوتی تھی۔ اب باقاعدہ پیڈ استعمال کئے جانے لگے ہیں، ملا عمر کے پاس ہی ایک ٹرنک دھرا ہے جس سے حسب ضرورت نوٹوں کے تھدے نکال نکال کر کمانڈروں یا ضرورت مندوں کو دیئے جاتے ہیں۔ مزید فتوحات کے بعد ایک اور ٹرنک کا اضافہ ہو گیا ہے، اس میں امریکی ڈالر ہیں، ان ٹرنکوں کو طالبان کا خزانہ کہا جا سکتا ہے۔

اہم اجلاس میں ملا عمر کے ساتھ ان کے معتمد خاص اور ترجمان ملا وکیل احمد ہوتے ہیں۔ وکیل احمد نوجوان ہیں۔ کاکڑ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے ملا عمر کے تحت مدرسے میں تعلیم پائی، پھر ان کے ساتھی اور معاون بن گئے۔ ملا عمر کی کار چلانا، یہ دیکھنے کے لئے کھانے میں زہر تو نہیں ملا دیا گیا، ان کی ترجمانی کرنا اور گفتگو کے اہم نکات لکھے جانا، ان کے فرائض میں شامل ہے۔ انہوں نے جلد ہی ترقی کر کے بیرونی سفارت کاروں اور امدادی ایجنسیوں کے افسروں سے مذاکرات کرنے، طالبان کو

کمانڈروں سے ملنے کے لئے اور دور دراز کے علاقوں میں جانے اور پاکستانی افسروں سے بات چیت کرنے کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی ہیں۔ غیر ملکی پریس سے رابطہ کرنا اور طالبان پر سخت تنقید ہونے کی صورت میں اس کو نرمی پر آمادہ کرنا بھی انھی کے ذمے ہے۔ وکیل ملا عمر کی آنکھیں اور کان بھی ہیں اور دروازے کے رکھوالے بھی، کوئی اہم افغان ان سے ملے بغیر ملا عمر تک نہیں پہنچ سکتا۔

ملا عمر نے طالبان کے چھوٹے سے گروہوں کو کس طرح قندھار کے جنگی سرداروں کے خلاف صف بستہ کیا، اسی کے بارے میں اب طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ سب سے قابل اعتبار کہانی جو اکثر دہرائی جاتی ہے یہ ہے کہ 1994ء کے موسم بہار میں سنگیسر میں چند پڑوسی انہیں یہ بتانے آئے کہ ایک کمانڈر نے دو نوعمر لڑکیوں کو اغوا کرلیا ہے، ان کے سر مونڈ دیئے ہیں اور ایک فوجی کیمپ میں لے جا کر ان سے کئی بار بداخلاقی کی ہے۔ ملا عمر نے 30 طلبا کو ساتھ لیا اور اسی حالت میں کہ ان کے پاس صرف سولہ رائفلیں تھیں، فوجی کیمپ پر حملہ کر دیا، لڑکیوں کو چھڑا لیا اور کمانڈر کو جس نے انہیں اغوار کیا تھا اور ان کے ساتھ زیادتی کی تھی، توپ کی نالی کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دے دی۔ یہاں سے انہیں خاصی بڑی مقدار اور تعداد میں گولہ بارود اور ہتھیار ہاتھ لگے، بعد میں ملا عمر نے کہا کہ ہم ایسے نام نہاد مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے ہیں جو غلط راہ پر چلنے لگے ہیں۔ ہم عورتوں اور غریبوں کے خلاف جرائم ہوتے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے۔

چند ماہ بعد قندھار میں دو کمانڈروں میں ایک لڑکے کے سلسلے میں باہم چپقلش اور تصادم کی نوبت آ گئی، دونوں اس سے بداخلاقی کرنا چاہتے تھے۔ اس لڑائی میں کئی شہری ہلاک ہو گئے۔ ملا عمر کے گروپ نے لڑکے کو رہائی دلا دی، اس کے بعد طالبان کو عوام کی طرف سے درخواستیں موصول ہونے لگیں کہ وہ مقامی جھگڑوں سے ان کی جان چھڑائیں۔ ملا عمر ظالم کمانڈروں کے مقابلے میں مظلوم عوام کی حمایت اور مدد کرنے میں

ویسا ہی کردار ادا کرنے لگے جس طرز کا کردار ''رابن ہڈ'' سے منسوب ہے۔

ملا عمر جس کسی کی مدد کرتے، اس سے کسی صلے اور ستائش کا تقاضا نہ کرتے، صرف اتنا کہتے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام میں ان کا ساتھ دیں۔ بے لوثی اور بے ریائی کے سبب سے ان کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔

اسی اثناء میں ملا عمر کے معاون اہل کار فوجی کمانڈروں کے اطوار و رجحانات کا جائزہ لیتے رہے، ان کے بعض رفقاء اسماعیل خان سے ملنے ہرات گئے۔ ستمبر میں طالبان کے ایک بانی رکن ملا محمد ربانی نے کابل جا کر صدر برہان الدین ربانی سے بات چیت کی۔ اس وقت کابل کی حکومت بڑی حد تک سب طرف سے کٹ چکی تھی، وہ ہراس پشتون طاقت کی مدد کرنے کے لئے تیار تھی، جو حکمت یار کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہو، جو مسلسل کابل پر بمباری کرتا رہتا تھا۔ صدر ربانی نے وعدہ کیا کہ اگر طالبان حکمت یار کے خلاف ان کا ساتھ دیں تو وہ صلے میں مالی امداد فراہم کر سکتے ہیں۔

بہرحال طالبان کے پاکستان کے ساتھ قریبی روابط تھے، ان میں سے کئی ایک پاکستان میں ہی پلے بڑھے تھے، جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا فضل الرحمٰن کے مدرسوں میں پڑھتے رہتے تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن کا بلوچستان اور صوبہ سرحد کے پشتونوں میں بڑا اثر ورسوخ ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کا پاکستان کی سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے ساتھ بھی سیاسی تال میل تھا۔ حکومت، فوج اور آئی ایس آئی سے بھی تعلق رکھتے ہیں جو انہیں نئی ابھرتی ہوئی طاقت قرار دیتے ہیں۔

پاکستان کی افغان پالیسی ادلتی بدلتی رہی ہے۔ 1991ء میں سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد یکے بعد دیگرے جتنی بھی پاکستانی حکومتیں آئیں، وہ وسطی ایشیا سے تجارت کے لئے خشکی کے راستے کھولنے کے لئے بڑی بے تابی سے کوشاں رہیں، لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ افغانستان کی خانہ جنگی کے سبب سے پیش آئی، تمام راستے افغانستان ہی میں سے گزرتے ہیں۔ امن ہوتا تو ان پر نقل وحمل کا اہتمام ہو

سکتا۔ پاکستان کے ایک پالیسی ساز عملی مشکل سے دوچار رہے۔ پاکستان یا تو حکمت یار کی حمایت کرتا جو کابل میں پشتون گروپ کو اقتدار میں لانے کا وسیلہ بنتے، جس کا پاکستان کے بارے میں دوستانہ رویہ تھا یا پھر اپنی سمت بدلتا اور تمام افغان دھڑوں کے مل کر اقتدار سنبھالنے کے حق میں بات کرتا تا کہ اس طرح ایک مستحکم حکومت قائم ہو سکے اور وسطی ایشیا تک راستے کھل سکیں۔

پاکستانی فوج کا یقین تھا کہ دوسرے نسلی افغان دھڑے اس مقصد کے حصول کا وسیلہ نہیں بن سکتے، اس لئے اس نے حکمت یار کی حمایت جاری رکھی۔ پاکستان کی فوج کا بیس فیصد حصہ پاکستانی پشتونوں پر مشتمل ہے۔ آئی ایس آئی میں پشتونوں کی حامی اور اسلامی بنیاد پرست لابی اور فوج کی کوشش رہی ہے کہ افغانستان میں پشتونوں ہی کو فتح حاصل ہو۔ لیکن 1994ء تک حکمت یار واضح طور پر ناکام رہے۔ ان کی انتہا پسندی پشتونوں کو مختلف دھڑوں میں منقسم کرنے کا سبب بنی اور اکثریت ان سے متنفر ہو گئی۔ پاکستان ایک ناکام شخص کی حمایت کرنے سے تھک کر دوسرے موثر پشتون ذرائع کو تلاش کرنے لگا۔

جب 1993ء میں بے نظیر بھٹو وزیراعظم منتخب ہوئیں تو وہ وسطی ایشیاء تک راستہ کھولنے کی بڑی خواہش مند تھیں۔ سب سے چھوٹا راستہ پشاور سے کابل تک کا تھا جو کوہ ہندوکش میں سے گزرتا ہے اور کابل سے ازبکستان میں ترمیز اور تاشقند تک جاتا ہے۔ لیکن کابل کے گرد جنگ کے باعث یہ راستہ بند تھا۔ ایک متبادل تجویز سامنے آئی جسے پاکستانی ٹرانسپورٹروں اور سمگلنگ مافیا کی پرزور حمایت حاصل تھی، جمعیت علمائے اسلام اور پشتون فوجی اور سیاسی شخصیات بھی اس کے حق میں تھیں۔ شمالی راستے کی بجائے ایک دوسرا راستہ بھی ہے جو کوئٹہ سے قندھار اور ہرات سے ہوتا ہوا ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد تک پہنچتا ہے۔ جنوب میں کوئی لڑائی نہیں ہو رہی تھی۔ درجن بھر کمانڈر تھے جنہیں بھاری رشوت دے کر راستے میں پڑی زنجیریں کھولنے پر آمادہ کیا جا

سکتا تھا۔ستمبر 1994ء میں پاکستان کے سرویرز اور آئی ایس آئی کے افسروں نے چمن سے ہرات تک سفر کیا اور سڑک کا جائزہ لیا۔اسی مہینے بےنظیر بھٹو کے پشتون وزیر داخلہ نصر اللہ بابر بھی چمن گئے۔ قندھار کے قبائیلی سرداروں نے اس منصوبے سے متعلق بدگمانی کا اظہار کیا، انہیں شک تھا کہ پاکستانی انہیں کچلنے کے لئے فوجی مداخلت کریں گے۔ایک کمانڈر امیر لالائی نے نصیر اللہ بابر سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ پاکستان ہماری سڑکیں تعمیر کرنے کی پیش کش کر رہا ہے،لیکن میرا خیال نہیں کہ ہماری سڑکیں بن جانے سے امن بحال ہو جائے گا، جب تک ہمسایہ ممالک ہمارے داخلی معاملات میں مداخلت کرتے رہیں گے، امن قائم نہیں ہوگا۔ پاکستانیوں نے قندھار کے قبائیلی سرداروں اور ہرات میں اسماعیل خان سے بات چیت جاری رکھی اور انہیں ترکمانستان تک ٹریفک کھولنے اور جاری رکھنے کی اجازت دینے کے لئے کہتے رہے۔

20 اکتوبر 1994ء کو نصر اللہ بابر چھ مغربی سفیروں کو ساتھ لے کر قندھار اور ہرات گئے۔اس پارٹی میں ریلوے، سڑکوں، ٹیلی فون اور بجلی کے محکموں کے اعلیٰ افسر بھی شامل تھے۔ بابر کا کہنا تھا کہ وہ کوئٹہ سے ہرات تک سڑک کی تعمیر نو کے لئے بین الاقوامی ایجنسیوں سے 300 ملین ڈالر کی امداد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ 28 اکتوبر کو بےنظیر بھٹو اسماعیل خان اور جنرل رشید دوستم سے ملیں اور انہیں جنوبی راستہ کھولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔انہیں بتایا گیا کہ اس راستے پر آنے جانے والے لوگوں کو بہت کم جگہوں پر محصول ادا کرنا پڑے گا اور ان کی حفاظت کی ضمانت دی جائے گی۔اس ملاقات سے قبل ایک بہت بڑے واقعہ نے قندھار کے قبائیلی سرداروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ 12 اکتوبر 1999ء قندھار اور پاکستانی مدرسوں کے دوسو طالبان پاکستان کے سرحدی شہر چمن کے بالکل سامنے سپین بالڈاک کی چوکی پر جمع ہوئے، یہ جگہ ٹرکوں کے پڑاؤ اور تیل لینے کے اڈے کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں حکمت یار کے آدمیوں کا قبضہ تھا۔افغان ٹرک یہاں سے ان پاکستانی ٹرکوں میں آیا ہوا سامان لیتے، جنہیں افغانستان کی سرحد عبور کرنے کی

اجازت نہیں تھی۔ پاکستان سے قبائیلی سرداروں کے فوجی جتھوں کے لئے تیل بھی اسی جگہ پہنچایا جاتا، ٹرانسپورٹ مافیا کے لئے اس جگہ پر قبضہ برقرار رکھنا ضروری تھا۔ اس کے لئے انہوں نے ملاعمر کو لاکھوں پاکستانی روپے دیئے اور وعدہ کیا کہ وہ طالبان کو وظائف بھی دیا کریں گے۔ بس وہ اتنا کریں کہ راستے میں سے رکاوٹیں اور زنجیریں ہٹا دیں۔ ڈاکوؤں کو بھگا دیں اور ٹرکوں کو بحفاظت نقل وحمل کی ضمانت دے دیں۔

طالبان نے حکمت یار کی چوکی پر تین طرف سے حملہ کر دیا، حکمت یار کے آدمی اپنے پیچھے سات لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے، کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ طالبان کا صرف ایک شخص ہلاک ہوا۔ پاکستان نے سپین بالڈاک کے باہر اسلحے کے بڑے ذخیرے پر قبضہ کرنے میں طالبان کی مدد کی۔ یہ اسلحہ 1990ء میں پاکستان کی سرحد کے پار افغانستان میں لے جایا گیا تھا۔ حکمت یار کے آدمی اس کی حفاظت پر مامور تھے، جنیوا معاہدے کی رو سے پاکستان افغانوں کے لئے اپنے علاقے میں اسلحہ نہیں رکھ سکتا تھا، اس لئے اسے یہ ذخیرہ افغان علاقے میں منتقل کرنا پڑا تھا۔ یہاں سے طالبان کو 18000 کلاشنکوفیں، درجنوں گولے، بھاری مقدار میں گولہ بارود اور کئی گاڑیاں ملیں۔

سپین بالڈاک پر قبضہ ہو جانے سے قندھار کے قبائیلی سرداروں کو تشویش ہوگئی۔ انہوں نے طالبان کی پشت پناہی کرنے پر پاکستان کی مذمت کی۔ قبائیلی سردار خطرے کے پیش نظر باہم متحد ہونے کی بجائے آپس میں پہلے ہی کی طرح لڑتے جھگڑتے رہے۔ نصیر اللہ بابر بے صبر ہو رہے تھے۔ انہوں نے 30 ٹرکوں کا ایک تجرباتی قافلہ ترتیب دیا اور دوائیں لے کر اشک آباد کا سفر کیا۔ میں نے بابر سے کہا کہ ہمیں دو ماہ انتظار کر لینا چاہیے، کیونکہ قندھار کے قبائیلی سرداروں سے ہمارا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ لیکن بابر قافلہ لے جانے پر مصر تھے۔ قبائیلی کمانڈروں کو شک تھا کہ ٹرکوں کا یہ قافلہ آئندہ آنے والی پاکستانی فوج کے لئے اسلحہ لے کر جا رہا ہے۔

29 اکتوبر 1994ء کو نیشنل لاجسٹک سیل (این ایل سی) کے ٹرکوں کا یہ قافلہ کوئٹہ سے

روانہ ہوا۔ (نیشنل لاجسٹک سیل آئی ایس آئی نے 1980ء کی دہائی میں بنایا تھا تا کہ افغان مجاہدین کو امریکی اسلحہ پہنچایا جائے)۔ اس کے ساتھ 80 سابق فوجی ڈرائیور، جنوب میں آئی ایس آئی کے نہایت معتمد فیلڈ افسر کرنل امام اور ہرات میں پاکستان کے قونصل جنرل بھی تھے۔ دو نوجوان طالبان کمانڈر ملا بور جان اور ملا ترابی بھی ہمراہ تھے۔ (بعد میں انہی دو کمانڈروں نے کابل پر پہلے حملے کی قیادت کی، جس میں ملا بور جان جاں بحق ہو گئے) قندھار سے بارہ میل باہر قندھار کے ہوائی اڈے کے قریب تخت پل پر کمانڈروں کے ایک گروپ نے قافلہ کو روک لیا۔ ان میں امیر لالائی، منصور اچکزئی اور استاد حلیم شامل تھے۔ ٹرکوں کو قریبی گاؤں کے پاس جو پہاڑیوں کی ڈھلان پر ہے، ٹھہرنے کا حکم دیا گیا۔ چند ماہ بعد جب میں اس علاقے میں گیا تو وہاں بچا کھچا راشن اور بجھی ہوئی لکڑیاں پڑی تھیں۔

کمانڈروں کا مطالبہ تھا کہ انہیں روپیہ اور ٹرکوں میں لدے ہوئے مال کا ایک حصہ دیا جائے۔ علاوہ ازیں پاکستان طالبان کی امداد کرنا چھوڑ دے۔ کمانڈروں کی کرنل امام سے بات چیت کے دوران اسلام آباد نے تین دن تک قافلہ کے اغوا کی خبر کی اشاعت پر پابندی لگائے رکھی۔ ایک پاکستانی افسر نے بتایا کہ ہم نے قافلہ کی رہائی کے لئے کئی امکانات کا جائزہ لیا۔ ہمیں تشویش تھی کہ اغوا کندوں کا سربراہ منصور کہیں ٹرکوں پر اسلحہ رکھ کر پاکستان کو بدنام نہ کرنے لگے۔ ایک تجویز یہ تھی کہ سپیشل سروسز گروپ (پاکستانی فوج کمانڈرز) حملہ کرے یا پیراشوٹ کے ذریعہ فوج اتار دی جائے۔ یہ طریقہ نہایت خطرناک تھا، اس لئے ہم نے طالبان سے کہا کہ وہ قافلہ کو رہائی دلائیں۔ 3 نومبر 1994ء کو طالبان قافلہ کو روکنے والوں پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھے، کمانڈروں نے سوچا کہ حملہ پاکستانی فوج نے کیا ہے اور وہ بھاگ نکلے۔ طالبان نے صحرا میں منصور کا تعاقب کیا، اسے اور اس کے دس محافظوں کو پکڑ کر گولی مار دی۔ منصور کی لاش ٹینک کی توپ کے ساتھ لٹکا دی تا کہ لوگ اسے دیکھ سکیں۔

MashalBooks.org

اسی شام طالبان نے قندھار کی طرف پیش قدمی کی، جہاں دو دن کی لڑائی میں انہوں نے کمانڈروں کی فوج کو ختم کر دیا۔ سب سے اہم کمانڈر ملا نقیب اپنے ڈھائی ہزار آدمیوں کے ساتھ شہر میں تھا، اس نے مزاحمت نہیں کی۔ بعد میں اس کے بعض معاونین نے دعویٰ کیا کہ ملا نقیب نے اس شرط پر آئی ایس آئی سے بھاری رشوت لے لی تھی کہ اس کی کمان بحال رکھی جائے گی۔ طالبان نے اس کے آدمیوں کو اپنی صفوں میں شامل کر لیا اور اسے اس کے گاؤں بھیج دیا کہ جائے اور خاموشی سے زندگی گزارے۔ طالبان کو سوویت فوج کے پیچھے چھوڑے ہوئے درجنوں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، اسلحہ اور ایئر پورٹ پر کھڑے چھگ 21 طیارے ہاتھ لگے۔

چند ہفتوں میں اس گمنام طاقت نے (جو طالبان کہلاتی تھی) افغانستان کے دوسرے سب سے بڑے شہر پر قبضہ کر لیا، اس لڑائی میں ان کے ایک درجن آدمی ہلاک ہوئے۔ اسلام آباد میں کسی غیر ملکی سفیر اور تجزیہ نگار کو شک بھی نہیں تھا کہ طالبان کو پاکستان کی طرف سے خاصی امداد مل رہی ہے۔ قندھار پر طالبان کا قبضہ ہونے پر پاکستان کی حکومت اور جمعیت العلمائے پاکستان نے خوشیاں منائیں۔ نصر اللہ بابر نے طالبان کی کامیابی کو اپنے کھاتے میں ڈالا اور صحافیوں کی نجی محفل میں بتایا کہ طالبان ''ہمارے لڑکے'' ہیں۔ تاہم طالبان نے پاکستان کے اثر سے آزاد ہونے کا اعلان کیا اور کہا کہ وہ کسی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں ہیں۔ 16 نومبر 1994ء کو ملا غوث نے کہا کہ پاکستان طالبان کو نظر انداز کر کے آئندہ کوئی قافلہ افغانستان نہ بھیجے۔ اس کے علاوہ کسی قبائلی سردار سے کوئی نجی معاہدہ بھی نہ کرے۔ طالبان پاکستانی ٹرکوں کے ذریعے مال اسباب افغانستان بھیجنے کی اجازت انہیں دیں گے۔ افغانستان کے ٹرانسپورٹ مافیا کا بھی یہی مطالبہ تھا۔ طالبان نے سڑکوں پر سے زنجیریں اور رکاوٹیں ہٹا دیں۔ افغانستان میں داخل ہونے والے ٹرکوں کے لئے سپین بالڈک کے مقام پر ایک ٹول سسٹم قائم کیا اور سڑکوں پر حفاظتی مقصد سے گشت کا انتظام کر دیا۔ ٹرانسپورٹ مافیا بہت برافروختہ ہوا۔

MashalBooks.org

دسمبر میں پچاس پاکستانی ٹرکوں کا قافلہ ترکمانستان سے کپاس لے کر کوئٹہ پہنچا، افغان علاقے سے گزرنے کے لئے طالبان کو دو لاکھ روپے ٹول ٹیکس کے طور پر دیئے گئے۔

اسی اثناء میں ہزاروں نوجوان افغان پشتون، جو بلوچستان اور صوبہ سرحد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، طالبان میں شامل ہونے کے لئے قندھار پہنچنے شروع ہو گئے۔ جمعیت علماء اسلام کے مدرسوں سے پاکستانی رضا کار بھی ان میں آن شامل ہوتے، وہ افغانستان میں نئی اسلامی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ دسمبر 1994ء تک 12 ہزار افغان اور پاکستانی طلباء قندھار میں آ کر طالبان میں شامل ہو چکے تھے۔

اس صورت حال کی وضاحت کے لئے پاکستان پر بین الاقوامی اور اندرونی دباؤ پڑنے لگا۔ بے نظیر بھٹو نے فروری 1995ء میں باقاعدہ اعلان کیا کہ پاکستان طالبان کی مدد اور پشت پناہی نہیں کر رہا۔ انہوں نے منیلا کے دورے میں کہا کہ افغانستان میں نہ ہمارا کوئی پسندیدہ ہے اور نہ ہی ہم افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ طالبان کا ساتھ دینے کے لئے سرحد عبور کر کے جانے والوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ میں صدر برہان الدین ربانی کے لئے جنگ کرنے کی ہرگز روادار نہیں۔ اگر افغان سرحد پار جانا چاہتے ہیں تو میں انہیں باز نہیں رکھ سکتی۔ البتہ انہیں واپس آنے سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے خاندان یہاں ہیں۔

جلد ہی طالبان نے شرعی قوانین کی ایسی سخت تعبیر وتشریح شروع کر دی، جیسی اس سے پہلے اسلامی دنیا میں کہیں بھی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے لڑکیوں کے سکول بند کر دیئے، عورتوں کا گھروں سے باہر کام کرنا ممنوع قرار دے دیا، ٹی وی سیٹ توڑ ڈالے، کئی کھیلوں اور تفریحات پر پابندی لگا دی، تمام بالغ مردوں سے کہا گیا کہ وہ لمبی داڑھیاں رکھیں۔ اگلے تین مہینوں میں طالبان نے افغانستان کے 31 صوبوں میں سے 12 پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ سڑکیں ٹریفک کے لئے کھول دیں اور لوگوں سے ہتھیار لینے شروع کر دیئے۔ طالبان نے کابل کی طرف پیش قدمی کی تو جنگی سردار بھاگنے لگے یا

سفید جھنڈے لہرا کر ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے لگے۔ ملا عمر اور ان کی طالبان فوج
آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

MashalBooks.org

ہرات 1995

اللہ کے ناقابل تسخیر سپاہی

مارچ 1995ء میں دشت مینگو (موت کے صحرا) کے شمالی سرے پر قندھار کو ہرات سے ملانے والی 350 میل طویل سڑک پر سفید گرد کے جھکڑ چل رہے تھے۔ یہ سڑک 1950ء میں روسیوں نے بنائی تھی۔ یہ دنیا کے گرم ترین اور بے آب و گیاہ صحرا میں سے گزرتی ہے۔ برسوں کی جنگ میں یہ سڑک ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس پر بھاری ٹینک چلتے رہے تھے، بمباری ہوتی رہی تھی، اس پر جو پل بنے تھے ٹوٹ چکے تھے۔ ان رکاوٹوں کے باعث اس پر ٹریفک کی رفتار بمشکل 20 میل فی گھنٹہ رہ گئی تھی۔
طالبان کی جنگی ویگنیں ہرات پر قبضہ کرنے کی غرض سے مسلح نوجوانوں کو لے کر جاتی تھیں اور اسماعیل خان کے فوجیوں میں سے زخمی ہونے والوں اور قیدیوں کو لاتی تھی۔ دو دروازوں والی یہ جاپانی پک اپ تھی جو بیچ سے کھلی ہوتی تھیں۔ اس وقت تک اسماعیل خان ہرات پر قابض تھا۔

پہلے تین مہینوں میں قندھار پر قبضہ کر لینے کے بعد طالبان نے افغانستان کے 31 میں سے 12 صوبوں پر قبضہ کر کے خانہ جنگی میں ٹھہراؤ کی کیفیت ختم کر دی۔ وہ شمال میں کابل کے نواح اور مغرب میں ہرات کے قرب و جوار تک پہنچ گئے۔ قندھار میں طالبان فوجی اپنے کمانڈروں کی موجودگی میں بات کرنے سے جھجکتے تھے۔ ان سے کچھ معلوم کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ پک اپ میں سفر کیا جائے۔ ایک گاڑی میں بارہ بارہ طالبان گھس کر بیٹھے ہوتے، رہی سہی کسر گولہ بارود، راکٹ، گرینڈ لانچر اور گندم کے تھیلوں کی وجہ سے نکل جاتی۔ ایسی حالت میں وہ اپنی زندگی کے حالات اور واقعات

کے بارے میں باتیں کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتے۔

انہوں نے بتایا کہ جب سے قندھار پر قبضہ ہوا ہے افغانی اور پاکستانی مدرسوں کے 20 ہزار طلباء مہاجر کیمپوں سے نکل کر سرحد پار کر کے ملا عمر کے ساتھ آ ملے ہیں۔ شمال کی طرف پیش قدمی کے دوران مزید ہزاروں افغان پشتون ان میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان میں اکثریت 14 سے 24 برس کی عمر کے نوجوانوں کی ہے ان میں سے بہت کم نے پہلے کبھی کسی لڑائی میں حصہ لیا ہوگا۔ البتہ پشتون ہونے کے حوالے سے وہ بندوق چلانا ضرور جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی بلوچستان اور صوبہ سرحد کے مہاجر کیمپوں میں گزاری تھی۔ وہ سرحد کے قریب قائم مدرسوں میں دینی تعلیم پاتے رہے تھے۔ یہ مدرسے افغانوں یا پاکستانی بنیاد پرستوں نے قائم کر رکھے ہیں۔ یہاں بہت کم پڑھے لکھے مدرس ہیں۔ انہیں اور ان طلباء کو ریاضی، سائنس، تاریخ اور جغرافیہ کا کوئی علم نہیں۔ طالبان میں سے بہت سوں کو نہ اپنے ملک کی تاریخ کا علم ہے اور نہ ہی وہ سوویت یونین کے خلاف جنگ کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ طالبان اور ان مجاہدوں میں بعد المشرقین ہے، جنہیں میں 1950ء کے عشرے میں ملا تھا۔ وہ اپنے خاندان اور قبیلے کے بارے میں جانتے تھے، ان کھیتوں اور وادیوں کا ذکر بڑی وارفتگی سے کرتے تھے جنہیں وہ چھوڑ آئے تھے، اور افغان تاریخ کی حکایتیں اور واقعات دلچسپی سے سناتے تھے۔ ان لڑکوں کا تعلق ایک ایسی نسل سے ہے جس نے زمانہ امن میں اپنا ملک نہیں دیکھا اور نہ حملہ آوروں سے جنگ کے دوران انہیں افغانستان جانے کا موقعہ ملا۔ وہ اپنے قبیلوں، اپنے بزرگوں، اپنے ہمسایوں اور اپنے علاقوں اور دیہات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ کس طرح مل جل کر گاؤں میں رہتے ہیں۔ اس کا انہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ جنگ نے انہیں جو کچھ دیا وہ بس اسی کے بارے میں جانتے ہیں۔

وہ ماضی سے ناواقف ہیں۔ مستقبل ان کے لئے کیا لا رہا ہے؟ وہ اس کی پیش بینی

کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے لئے جو کچھ ہے وہ حال ہے، انہیں جنگ نے یتیم کر دیا ہے۔ ان کی جڑیں نہیں، وہ ہمہ وقت مضطرب اور پریشان رہتے ہیں۔ ان کے پاس روزگار نہیں، وہ اقتصادی محرومی کا شکار ہیں، وہ جنگ کی تعریف کرتے ہیں کہ اسی کے سبب سے انہیں کوئی مشغلہ ملا ہوا ہے۔ انہیں خود شناسی بھی نہیں۔ ان کی دلچسپی اور وابستگی اسلام سے ہے۔ وہ اپنے ہر دکھ کا مداوا اور ہر مشکل کا حل اسی میں دیکھتے ہیں۔ اس ضمن سے انہیں گاؤں کے مدرسے اور اس کے استادوں کی باتیں یاد کرتے اور دہراتے رہنے میں سکون ملتا ہے۔ وہ کچھ بھی کرنا نہیں جانتے، وہ اپنے آباء واجداد کے روایتی پیشوں سے بھی نابلد ہیں۔ کاشتکاری کس طرح کی جاتی ہے؟ مویشی کیسے پالے جاتے ہیں؟ دستکاریاں کیسے ہوتی ہیں؟ انہیں کارل مارکس کے بقول، افغانستان کے افکار رفتہ پرولتاری کہا جا سکتا ہے، وہ طالبان کے لیڈروں کی برادری میں خوش دلی سے شامل ہو گئے، کیونکہ وہ اور کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ان میں اکثریت یتیموں کی تھی۔ جنہوں نے ماؤں اور بہنوں اور خالہ زاد اور چچا زاد بہنوں کی صورت میں کوئی صورت دیکھی ہی نہیں تھی۔ کچھ نے زندگی مدرسوں میں تعلیم پاتے یا مہاجر کیمپوں میں پرورش پاتے گزاری تھی۔ وہ بھی اس حالت میں کہ وہاں مرد اور عورتیں الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ کیمپوں میں خواتین رشتہ داروں کے آنے جانے کو بہت محدود کر دیا گیا تھا۔ قدامت پسند پشتون قبائلی معاشرے میں دیہات یا خانہ بدوشی کی صورت میں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے قریبی رشتہ دار مرد اور عورتیں آپس میں ملتے جلتے تھے۔ لیکن ان لڑکوں نے بڑی کٹھن زندگی گزاری۔ انہیں عورتوں کی رفاقت کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

جن ملاؤں نے انہیں پڑھایا تھا وہ اس پر زور دیتے تھے کہ عورت ترغیب دیتی ہے اور اللہ کی راہ سے ہٹاتی ہے اور احکام الہیٰ کی پابندی کرنے سے روکنے کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ جب طالبان قندھار میں داخل ہوئے تو انہوں نے عورتوں کو گھروں کے اندر پابند

کر دیا۔ گھروں سے باہر ہر کام کرنے سے روک دیا، سکول جانے اور خریداری کے لئے بازار جانے سے منع کر دیا۔ مدرسوں میں پڑھنے والوں کی اکثریت کو ان پابندیوں پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ ان اقدامات میں انہیں کوئی خلاف معمول بات نظر نہیں آئی۔ وہ آدھی نوع انسان سے، جس سے وہ واقف ہی نہیں ہوئے تھے، خائف رہنے لگے۔ انہیں اسی میں آسانی دکھائی دی کہ عورتوں کو گھروں میں پابند کر دیا جائے اور ملاؤں کے فتوؤں کو، جن کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں کان اور آنکھیں بند کر کے حرف آخر تسلیم کر لیا جائے۔ عورتوں کا استحصال طالبان اور سابق مجاہدین کے عقیدے اور بنیاد کی پرکھ اور تفہیم کا معیار بن گیا۔

مردوں کی برادری اور اخوت نہ صرف نوجوانوں کے لئے لڑائی کا دینی جواز بلکہ مکمل ضابطہ حیات اور بامعنی اور بامقصد زندگی کے تعین کا وسیلہ بنی، طالبان براہ راست ان فوجی اور دینی ضابطوں پر کاربند ہو گئے جو اسلام کے خلاف لڑی جانے والی صلیبی جنگوں کا محور تسلیم کئے جاتے تھے۔ ڈسپلن برقرار رکھنا، جوش و جذبے اور بے رحمی سے اپنے مقاصد حاصل کرنا۔ ابتدائی چند مہینوں میں طالبان کو یکے بعد دیگرے فتوحات حاصل ہوئیں، ان سے خیال عام ہوا کہ وہ مسخر نہیں کئے جا سکے۔ اللہ کے سپاہی ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ ابتدائی ایام میں ہونے والی ہر کامیابی سے ان کے مقصد کی سچائی کی تصدیق ہوتی رہی کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور انہوں نے اسلام کی جو تشریح کی ہے وہی صحیح ہے۔

نئی نفری ملنے کے بعد طالبان شمال میں عروضگان اور زابل کے صوبوں کی طرف بڑھنے لگے اور ایک گولی چلائے بغیر ان پر قابض ہو گئے۔ پشتون کمانڈروں نے اپنے خامیوں کی غیر یقینی وفاداری کی آزمائش کرنے کی بجائے سفید جھنڈے لہراتے ہوئے اپنی اطاعت گزاری کے ثبوت کے طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

جنوب سے طالبان نے غفارا خونزادہ کے دستوں کے خلاف یلغار کی۔ اس کا قبیلہ

صوبہ ہلمند پر قابض تھا۔ یہاں پر پوست کے کھیت 1980ء کے پورے عشرے میں اس کے تصرف میں رہے۔ طالبان کو یہاں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن منشیات کے چھوٹے سمگلروں کو اخونزادہ کے خلاف اٹھنے پر آمادہ کر کے اور دوسروں کو رشوت دے کر طالبان دسمبر 1995ء تک صوبے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے مغرب کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور قندھار، ہرات پر سے ہوتے ہوئے ان تین مغربی صوبوں کی سرحد تک جا پہنچے جن پر اسماعیل خان کا کنٹرول تھا۔اس عرصے میں وہ پشتون پٹی کو کاٹتے ہوئے کابل کی طرف بڑھے۔ یہاں ان کا مقابلہ کرنے کی بجائے لوگوں نے شکست تسلیم کرنے میں عافیت سمجھی۔جنوب کے پشتون علاقے میں افراتفری کا عالم تھا۔ یہاں جو چند ایک چھوٹے چھوٹے کمانڈر تھے انہوں نے طالبان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب ان کا بڑے جنگی سرداروں اور سیاسی اور نسلی اثر و رسوخ رکھنے والے ان عناصر سے معاملہ تھا جو باقی ماندہ ملک کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔ جنوری 1995ء میں تمام مخالف گروپوں نے کابل میں صدر ربانی کی حکومت کے خلاف اتحاد کر لیا۔حکمت یار شمال میں ازبک سردار جنرل رشید دوستم اور وسطی افغانستان کے ہزارہ قبیلے سے مل گئے،جس کا کابل کے ایک حصے پر قبضہ تھا۔

پاکستان نے اس نئے اتحاد قائم کرنے میں معاونت کی، کیونکہ ابھی تک حکمت یار کے بارے میں اس کے دل میں نرم گوشہ تھا۔ پاکستان نے سال کے اوائل میں حکمت یار کو کابل پر حملہ کرنے کے لئے بھاری تعداد میں راکٹ فراہم کئے۔ طالبان جس تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، اس نے اسلام آباد کو بھی حیران کر دیا۔ اگر چہ بے نظیر بھٹو کی حکومت طالبان کی پوری حمایت کر رہی تھی،لیکن آئی ایس آئی کو ان کی صلاحیتوں کے بارے میں شک ہی رہا۔اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ مفید تو ہوں گے لیکن جنوبی علاقے کے کناروں تک محدود رہیں گے۔

حکمت یار کو جنوب سے اٹھنے والے مخالف پشتون طالبان کے پھیلتے جانے پر سخت

تشویش تھی۔ اس نے طالبان کو روکنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ کابل پر راکٹوں سے بڑا وسیع حملہ کر دیا، جس سے سینکڑوں افراد ہلاک ہوئے اور شہر کے کئی حصے تباہ ہو گئے۔ 2 فروری 1995ء کو طالبان نے کابل سے 35 میل جنوب میں وردک پر قبضہ کر لیا اور یوں پہلی مرتبہ کابل کے گرد حکمت یار کے اڈوں کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا۔ طالبان بجلی کی سی تیزی سے بڑھتے گئے۔ 10 فروری 1995ء کو سخت لڑائی کے بعد میدان شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں دوسو افراد ہلاک ہوئے۔ حکمت یار شمال کی جانب سے سرکاری فوجوں اور جنوب کی طرف سے طالبان میں گھر گیا، جس سے اس کے دستوں کا حوصلہ پست ہو گیا۔

14 فروری 1995ء کو طالبان نے چارسیاب میں حکمت یار کا ہیڈکوارٹر فتح کر لیا، جس سے اس کی فوج میں خوف و ہراس پھیل گیا اور وہ مشرق میں جلال آباد کی طرف بھاگ نکلی۔ صدر ربانی کے دستے، احمد شاہ مسعود کی قیادت میں کابل شہر میں چلے گئے۔ طالبان نے سارے راستے کھول دیے جس سے کابل کو خوراک کی فراہمی شروع ہو گئی۔ حکمت یار نے کئی مہینوں سے کابل کا محاصرہ کر رکھا تھا، جس سے شہر میں کھانے پینے کی اشیاء کی قلت پیدا ہو گئی تھی۔ بلکہ قحط کی سی صورت تھی۔ راستے کھلنے پر کابل کے شہریوں کے طالبان کے بارے میں سارے شکوک وشبہات دور ہو گئے۔ اس عوامی اقدام سے طالبان کے وقار میں اضافہ ہو گیا۔ طالبان کی حامی ٹرانسپورٹ مافیا کا بھی ایک اہم مطالبہ پورا ہو گیا۔ اب طالبان اور احمد شاہ مسعود کا آمنا سامنا تھا۔ ایسے میں اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے اور کونسل کے سفیر محمود مظہری کی طرف سے جنگ بندی کی اپیلوں کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔ انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔

احمد شاہ مسعود کو ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔ حکمت یار کو تو بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، لیکن مسعود کو حزب وحدت کی سرکردگی میں لڑنے والی شیعہ ہزارہ قبیلے کی فوج سے نمٹنا تھا۔ کابل کے جنوبی مضافات اس فوج کے قبضے میں تھے۔ مسعود نے کچھ وقت لینے کی خاطر

چارسیاب میں طالبان کے کمانڈروں ملا ربانی بروجان اور غوث سے دو مرتبہ ملاقات کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ طالبان کو اپنے سب سے بڑے مخالف کے ساتھ گفت وشنید کرنا پڑی تھی۔ مسعود نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ آئندہ چار برس میں طالبان کو ضرور سزا دے گا۔ طالبان نے مطالبہ کیا کہ صدر ربانی اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں اور مسعود بھی شکست تسلیم کر لیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں گفت وشنید کے جاری رہنے یا ان کی حمایت حاصل کرنے کا کوئی جواز نہیں رہ جانا تھا۔ اسی عرصے میں طالبان نے ہزارہ قبیلے سے بھی بات چیت شروع کر دی۔ طالبان مسطیری بھی سے ملے اور انہیں اقوام متحدہ کی بھی کوشش میں معاونت کرنے کے لئے تین شرائط پیش کیں۔ ایک یہ کہ کابل میں طالبان کے یونٹوں پر مشتمل ایک غیر جانبدار فوج رکھی جائے۔ کابل میں اچھے مسلمانوں پر مشتمل ایک عبوری انتظامیہ قائم کی جائے اور اسی میں ملک کے تیس صوبوں کو نمائندگی دی جائے۔ طالبان کے اس اصرار پر کہ کابل میں جو حکومت بھی بنے، اسے صرف طالبان کی فوج کی حمایت حاصل ہو۔ ربانی حکومت اور اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے نے طالبان کی شرائط مسترد کر دیں۔

مسعود نے اپنے دشمنوں سے ایک ہی بار عہدہ برآ ہونے کا فیصلہ کیا۔ 6 مارچ 1995ء کو ہزارہ پر بڑی تندی، تیزی اور برق رفتاری سے حملہ کیا۔ اسی نے کابل کے جنوب میں ٹینکوں سے حملہ کر کے ہزارہ دستوں کو سخت زک پہنچائی اور انہیں کابل سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ ہزارہ فوج نے مایوسی میں طالبان سے جو بڑھتے چلے آ رہے تھے، معاملہ کر لیا۔ اس کے لئے انہیں طالبان کو بھاری اسلحہ بھی دینا پڑا اور فوجی اڈے بھی، جب یہ لین دین ہو رہا تھا تو افراتفری کا عالم تھا۔ اسی میں ہزارہ لیڈر عبدالعلی مزاری جو طالبان کی تحویل میں تھا، مارا گیا۔ ہزاروں کا کہنا تھا کہ طالبان نے عبدالعلی مزاری کو ہیلی کاپٹر سے دھکا دے کر گرایا ہے اور وجہ یہ ہوئی کہ اسے قیدی بنا کر قندھار لے جایا جا رہا تھا کہ اس نے رائفل چھیننے کی کوشش کی جس پر یہ واقعہ پیش آیا۔

مزادی کی موت حادثہ تھی یا اسے دانستہ مارا گیا؟ افغان شیعوں اور ان کے اہم پشت پناہ، ایران کی نظروں میں، طالبان ہمیشہ کے لئے مردود قرار پائے۔ ہزارہ قبیلے نے مزاری کی ہلاکت پر طالبان کو کبھی معاف نہ کیا۔ ایک برس بعد انہوں نے شمال میں ہزاروں طالبان کا قتل عام کر کے بدلہ چکا لیا۔ مختلف نسلوں اور فرقوں کے حوالے سے پشتونوں اور ہزارہ قبائیل اور سنیوں اور شیعوں کے درمیان جو دبے دبے اختلافات تھے، اب کھل کر سامنے آ گئے۔ مسعود نہیں چاہتا تھا کہ طالبان جنوبی کابل میں ہزارہ فوج کی جگہ لے سکیں۔ 11 مارچ 195ء کو اس نے طالبان پر ایک اور حملہ کیا۔ گلی کوچوں میں دست بدست لڑائی ہوئی جس میں سینکڑوں طالبان مارے گئے۔ یہ پہلی بڑی لڑائی تھی جو طالبان کو لڑنا پڑی۔ اس میں انہیں ہار ہوئی۔ مسعود کے سپاہی زیادہ تجربہ کار اور منجھے ہوئے تھے، جبکہ طالبان کا فوجی ڈھانچہ کمزور تھا۔ ان کی چالیں بھی اچھی نہیں تھیں۔ اسی بنا پر انہیں ہارنا پڑا۔

جنوب میں طالبان، پشتونوں پر اس لئے غالب رہے کہ لوگوں نے جو جنگ سے اکتا چکے تھے اور بری طرح تھک گئے تھے، طالبان کو اپنا نجات دہندہ اور امن دوست سمجھا۔ ان کے خیال میں طالبان پشتونوں کی طاقت چاہے بحال نہ بھی کر سکیں، (جسے تاجکوں اور ازبکوں نے ختم کیا تھا) مگر کم سے کم لوگوں کو ظلم سے نجات دلانے کا وسیلہ ضرور بنیں گے۔ مالی فوائد کے بدلہ ہار ماننے اور کمانڈروں کو رشوت دے کر وفاداری تبدیل کرنے پر آمادہ کرنے کو طالبان نے بعد کے برسوں کے ایک فن کا درجہ دے دیا۔ منشیات کے کاروبار، ٹرانسپورٹ اور پاکستان اور سعودی عرب سے بیرونی امداد ملنے کے سبب سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسرے جب وہ فوجی مقصد کے لئے آگے بڑھتے تو انہیں بھاری مقدار میں گولہ بارود، چھوٹے ہتھیار، ٹینک اور ہیلی کاپٹر ہاتھ آتے، اس طرح وہ مزید فوج لانے کے قابل ہو گئے، جو علاقے ان کے پاس تھے، ان میں لوگوں کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ امن و قانون نافذ کیا گیا۔ شریعت پر عمل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔

سڑکیں ٹریفک کے لئے کھل گئیں، جس کے باعث کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں فوری طور پر کمی ہوگئی۔ طویل عرصے سے مصائب برداشت کرنے والی آبادی کے لئے یہ اقدامات خوشگوار تھے۔ کابل میں طالبان کو جو شکست ہوئی اس سے ان کے وقار کو دھچکا ضرور لگا لیکن ان کے عزم و حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اب طالبان نے اپنی توجہ مغرب کی طرف کی، وہ ہرات پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ فروری 1995ء کے آخر تک انہوں نے سخت لڑائی کے بعد نیمروز اور فرح کے صوبوں پر قبضہ کرلیا۔ ان پر اسماعیل خان کا قبضہ تھا۔ طالبان نے قدم آگے بڑھائے اور ہرات کے جنوب میں سابق سوویت ہوائی اڈے شندند تک جا پہنچے۔ کابل کی حکومت طالبان کی پیش قدمی روکنے میں اسماعیل خان کی ناکامی پر سخت تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ مسعود کے طیاروں نے کابل سے اڑکر طالبان کی پہلی صفوں پر بمباری شروع کردی، ساتھ ہی اس نے دو ہزار آزمودہ جنگجو تاجک لڑاکا فوجیوں کو طیاروں کے ذریعے شندند اور ہرات کے دفاع کے لئے بھیجا۔ طالبان کے پاس فضائی طاقت نہیں تھی۔ قندھار میں اپنے اڈوں سے سامان کی نقل و حمل کا بھی کوئی مناسب انتظام نہیں تھا۔ کمان بھی کمزور تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شندند پر حملے کے دوران طالبان کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔

مارچ 1995ء کے آخر تک طالبان کو شندند سے نکال باہر کیا گیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے انہوں نے بہت سا وہ علاقہ بھی کھو دیا جو انہوں نے قبل ازیں فتح حاصل کیا تھا اور جس کے لئے انہوں نے 3000 جانیں گنوائی تھیں۔ طبی امور میسر نہ آنے اور پانی اور خوراک فراہم نہ کرسکنے کے سبب طالبان کو اپنے سینکڑوں زخمیوں کو صحرا میں بے یار و مددگار چھوڑنا پڑا۔ ایک زخمی صالح محمد نے جسے قندھار لایا جاسکا تھا مجھے بتایا کہ ہم نے اس قسم کے بدتر حالات پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ دن میں ہم پر دس پندرہ مرتبہ بمباری ہوتی۔ ہمارے پاس نہ خوراک تھی اور نہ پانی۔ میرے دوست پیاسے مر رہے تھے۔ کمانڈروں سے ہمارا پیغام رسانی کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ یہ بڑی مصیبت تھی۔

حکومت نے طالبان کو دو محاذوں پر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ طالبان کا یہ عالم تھا کہ ان کی سیاسی اور فوجی قیادت بدنظمی کا شکار تھی۔ بحال امن کے ضمن میں ان کے کردار پر حرف گیری ہونے لگی تھی۔ کئی ایک افغانوں کی نظر میں ان کی حیثیت ایک اور جنگی جماعت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھی۔ صدر برہان الدین ربانی نے وقتی طور پر کابل اور ہرات میں اپنی سیاسی اور فوجی حیثیت کو سنبھالا دیا۔ مئی 1995ء تک سرکاری فوج نے کابل کے آس پاس اور شمال کی جانب کے چھ صوبوں پر براہ راست کنٹرول کر لیا۔ جبکہ اسماعیل خان کا تین مغربی صوبوں پر کنٹرول تھا۔ طالبان نے شروع میں بارانی صوبوں پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ شکست کھانے کے بعد یہ آٹھ صوبوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔

ہرات، طالبان، پشتون ٹرانسپورٹروں اور منشیات کا کاروبار کرنے والوں کے لئے مساوی طور پر بڑی جاذبیت رکھتا تھا۔ کیونکہ ہرات ہی کے راستے ایران اور وسطی ایشیا تک رسائی ممکن تھی۔ بہت کم مجاہدین کو اسماعیل خان جیسی عزت اور شہرت حاصل تھی اور سوویت یونین کے خلاف جنگ میں ہرات کے عوام سے بڑھ کر کسی اور جگہ کے لوگوں نے قربانی نہیں دی تھی۔ جب سوویت فوج افغانستان پر حملہ آور ہوئی تو اسماعیل خان سرکاری فوج کا افسر تھا۔ وہ اسلامی اور قوم پرستانہ رجحانات رکھتا تھا۔ سوویت فوج نے ہرات پر قبضہ کیا تو روسیوں نے فارسی بولنے والے ہراتی باشندوں کو مرنجاں مرنجی جنگ وجدل سے متنفر اور نہایت مہذب قرار دیا۔ ایک صدی قبل 1837ء میں ایران کے حملے کے نتیجے میں ہراتی باشندے لڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ سوویت یونین نے ہراتیوں کی طرف سے کسی مزاحمت کا کوئی اندیشہ محسوس نہ کرتے ہوئے شہر کو افغانستان میں اپنے سب سے بڑے ہوائی اڈے کے طور پر ترقی دی اور اپنے فوجیوں کو اپنے خاندان ہرات لانے اور رکھنے کی اجازت دے دی، لیکن 15 مارچ 1979ء کو ہرات کے شہریوں نے سوویت یونین کے خلاف بے مثال بغاوت برپا کر دی۔ انہوں نے سوویت افسروں، مشیروں اور ان کے خاندانوں کو قتل کرنا شروع کیا تو اسماعیل خان نے شہر کے گیریزن

میں بغاوت کے بعد سوویت اور کمیونسٹ افغان افسروں کو موت کے گھاٹ اتارنا اور شہریوں میں اسلحہ تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ سینکڑوں روسی مارے گئے۔ ماسکو نے افغانستان کے شہروں میں اسی طرح کی بغاوتیں ہونے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے ہرات کی بغاوت کچلنے کے لئے ترکمانستان سے 300 ٹینک بھیج دیئے اور دنیا کے ایک قدیم ترین شہر پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ پندرہ سال گزر گئے ہیں۔ شہر کے وسیع علاقے چاند کی ناہموار سطح کی طرح کے دکھائی دیتے ہیں۔ افق تک ملبہ پھیلا ہوا ہے۔ چند دنوں میں 20 ہزار ہراتی باشندے مارے گئے۔ اسماعیل خان اپنی نئی چھاپہ مار فوج کے ساتھ دیہی علاقے کی طرف چلا گیا اور لاکھوں افراد ہجرت کر کے ایران چلے گئے۔ اگلے دس برسوں تک اسماعیل خان نے سوویت قابض فوج کے خلاف چھاپہ مار جنگ جاری رکھی۔ اس نے دیہی علاقے میں موثر انتظامیہ قائم کر لی۔ لوگ اس کی بے پناہ عزت کرنے لگے۔ سوویت فوجوں کے افغانستان سے نکل جانے کے بعد اسماعیل خان کو ہرات میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے میں بڑی آسانی رہی۔ یہ اس کے اس کردار کا صلہ تھا جو اس نے سوویت قبضے کے دوران ادا کیا تھا۔

ہرات افغانستان کی تاریخ اور تہذیب کا گہوارہ ہے۔ اس کی حیثیت ایک نخلستان کی سی ہے۔ اس کی بنیاد پانچ ہزار سال پرانی تھی۔ دوسو مربع میل پر پھیلی ہوئی آبپاشی اراضی جو چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ پورے ایشیاء میں سب سے زرخیز مانی جاتی رہی ہے۔ قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے ہرات کو ایشیا کے لئے دسترخوان قرار دیا ہے۔ شہنشاہ بابر نے لکھا کہ پوری دنیا میں کوئی شہر ایسا نہیں جسے رہائش کے لئے ہرات سے بہتر کہا جا سکے۔ انگریزوں نے اسے اپنے ملک کے دیہی علاقوں کی طرح خوبصورت جانا اور پسند کیا۔ پہاڑوں میں گھرے ہوئے خوبصورت میدانی علاقے میں چھوٹے چھوٹے قلعہ بند دیہات، باغات، انگوروں کی بیلوں، مکئی کے کھیتوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے، اس کے درمیان ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی ندیاں ہیں، جنھوں نے

منظر کو اور زیادہ خوبصورت اور دلآویز بنا دیا ہے۔ اس رائے کا اظہار برطانوی مہم جو اور جاسوس کیپٹن کا تلی نے 1831ء میں کیا تھا۔

یہ شہر صدیوں تک ترک اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان حد فاصل بنا رہا، یہاں کی آبادی سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں شمار ہوتی ہے۔ شہر کے مرکز میں بڑی مسجد ہے، یہ ساتویں صدی میں تعمیر ہوئی اور 1200ء میں غوری خاندان نے اسے نئے سرے سے دوبارہ تعمیر کیا۔ ازمنہ قدیم میں مسیحیت اور تصوف دونوں ہی کا مرکز رہی۔ نقشبندی اور چشتیہ مسالک کے پیروکاروں میں سے ہی وزیراعظم اور وزیر بنتے رہے۔ ہرات کے سب سے بڑے ولی خواجہ عبداللہ انصاری تھے۔ انہوں نے 1088ء میں وفات پائی۔ وہ شاعر اور فلسفی بھی تھے۔ افغانستان میں آج بھی ان کے ماننے والے موجود ہیں۔ 1222ء میں جب چنگیز خان نے ہرات فتح کیا تو اس نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار شہریوں میں سے صرف 40 کی جان بخشی، باقی سب کو تہ وتیغ کر دیا۔ دو صدیوں سے کم عرصے میں شہر پھر سے آباد ہو گیا۔ اس کی شان وشوکت لوٹ آئی۔ 1405ء میں تیمور کے بیٹے شاہ رخ اور اس کی ملکہ گوہر شاد نے سمرقند کی بجائے ہرات کو تیموری سلطنت کا مرکز بنا لیا۔ غوریوں نے خانہ بدوشوں کے کلچر کو سرزمین فارس کی خوبیوں سے آشنا کیا، انہوں نے فارس، ہندوستان اور وسط ایشیاء کے ہنرمندوں کو یہاں لا بسایا اور ان سے سینکڑوں شاندار عمارات بنوائیں۔ شاہ رخ اور گوہر شاد نے ہرات کو مسجدیں، مدرسوں، غسل خانوں، لائبریریوں اور محلات کا بڑا حسین گہوارہ بنا دیا۔ ہرات کے بازاروں میں نہایت خوبصورت قالین، زیور، اسلحے اور ٹائلیں بننے لگیں۔ فارس کا مشہور مصور بہزاد ہرات ہی کے دربار سے وابستہ تھا۔ شاہ رخ کے وزیراعظم علی شیر نوائی نے کہا تھا کہ ہرات میں قدم قدم پر شاعر ملے گا۔ علی شیر نوائی خود بڑا شاعر، ادیب اور مصور تھا، وہ ہرات میں ہی مدفون ہوا۔ اسے آج بھی ازبکستان کا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔ اس نے فارسی کی بجائے ترکی میں شاعری کی اور ادب وشعر کے فروغ کا

وسیلہ بنا۔ فارسی کے عظیم شاعر جامی بھی دربار میں رہے، ان کا مزار بھی ہرات میں ہے۔ شاہ رخ کا بیٹا الغ بیگ ماہر علم نجوم تھا۔ اس نے سمرقند میں اپنی رصدگاہ قائم کر رکھی تھی، جس کے ذریعہ وہ اجرام فلکی کا مطالعہ کیا کرتا۔ اس نے جو تقویم (کیلنڈر) اور زائچے بنائے، 1665ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے انہیں شائع کیا۔ دور حاضر کے ماہرین فلکیات نے ان کے صحیح ہونے کی تصدیق کی ہے۔

گورنر شاد خود بھی ماہر تعمیرات تھی۔ اس نے ہرات کے باہر ایک خوبصورت کمپلیکس تعمیر کرایا، جس میں مسجد، مدرسہ اور خود اس کا اپنا مزار شامل ہے۔ مقبرہ نیلے رنگ کی منقش ایرانی ٹائیلوں سے مرصع ہے۔ نیلے گنبد کے گرداگرد قرآنی آیات لکھوائی گئی ہیں۔ ملکہ کا یہ مزار اسلامی طرز تعمیر کا نادر نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ 1937ء میں بائیرن نے اسے دیکھ کر کہا تھا کہ انسان نے رنگوں کا جیسا خوبصورت امتزاج یہاں کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی، دراصل یہ اللہ کی جلالت اور خود انسان کے جوہر کا مظہر ہے۔

''گوہر شاد نے افغانستان، ایران اور وسطی ایشیاء میں تین سو عمارات تعمیر کرائیں۔ اس نے 80 برس کی عمر پائی۔ اس کے مزار پر جو کتبہ لگا ہے اس پر اسے اپنے زمانے کی بلقیس کہا گیا ہے۔ مزار کے پاس کی عمارات 1885ء میں برطانیہ نے گرا دی تھیں۔ بعد میں سوویت فوج نے علاقے کو مجاہدین کی پہنچ سے دور رکھنے کے لئے یہاں بے شمار بارودی سرنگیں بچھا دیں۔

1979ء میں جب سوویت فوجوں نے ہرات پر بمباری کی تو شہر کو اتنا نقصان پہنچا، جتنا منگولوں نے بھی نہیں پہنچایا تھا۔ 1993ء میں اسماعیل خان نے مجھے بتایا کہ ہرات دنیا میں سب سے تباہ شدہ اور بارودی سرنگوں میں گھرا ہوا شہر ہے۔ اس کی حالت بدلنے کے لئے کہیں سے بھی کوئی مدد نہیں آ رہی۔ اسماعیل خان نے اتنی تباہی میں گھر کر بھی لوگوں کو غیر مسلح کیا اور ایک موثر انتظامیہ قائم کر لی ہے۔ تین صوبوں میں صحت اور تعلیم کی سہولتوں کا بندوبست موجود ہے۔

اسماعیل خان چھوٹے قد کا تیز طرار، صحت مند شخص ہے۔ اس کے لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ اپنی 47 برس کی عمر سے بھی کم عمر دکھائی دیتا ہے۔ ہرات کے سکولوں میں 45 ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ 1993ء تک ان میں سے نصف لڑکیاں تھیں، تین صوبوں میں طلباء کی تعداد 75% ہے۔ 1993ء میں وہ مجھے لڑکیوں کا ایک سکول دکھانے لے گیا۔ یہاں 15 سو لڑکیاں پڑھ رہی تھیں۔ سکول کا نہ کوئی کمرہ تھا اور نہ ہی کوئی ڈیسک، نہ کتاب، نہ کاغذ۔ کھلے آسمان کے نیچے زمین پر بیٹھی تھیں، ان کے پڑھنے کی خواہش ہرات کی روایتی اور علم دوستی ہی کا اثر کہی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس جب طالبان نے قندھار پر قبضہ کیا تو وہاں پہلے سے موجود تمام اسکول بند کر دیئے گئے۔ صرف تین کو رہنے دیا گیا۔ بعد میں جب ہرات طالبان کے قبضے میں آیا تو یہاں کے سبھی مدرسے بند کر دیئے گئے اور لڑکیوں کا گھروں پر پڑھنا بھی منع کر دیا گیا۔

1995ء تک اسماعیل خان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے آبادی سے ہتھیار رکھوا لئے اور جبری بھرتی کے ذریعے فوج بنائی، جو مقبول نہ تھی، بدعنوانی، پست حوصلے اور وسائل کی کمی نے اسے بے معنی بنا دیا تھا۔ اسماعیل خان کو طالبان کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگوں کو پھر سے مسلح کرنا پڑا۔ سرکاری اہل کاروں میں کرپشن انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ عام لوگوں سے ان کی بدسلوکی کی شکایات عام تھیں، ہرات سے گزرنے والے ہر ٹرک سے کسٹمز والے 10 ہزار پاکستانی روپے لیتے، اس طرح ٹرانسپورٹ مافیا انتظامیہ کے خلاف ہو گیا۔ طالبان کو علم تھا کہ اسماعیل خان مسائل میں گھر گیا ہے، وہ کمزور ہے، اس کے سپاہی لڑنے پر تیار نہیں، اس لئے کہ انہیں تنخواہ نہیں مل رہی۔ عام لوگ انتظامیہ کی کرپشن سے تنگ ہیں اور اسماعیل خان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ ملا وکیل نے مجھے بتایا کہ اسماعیل خان تنہا ہو چکا ہے، وہ احمد شاہ مسعود کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔

اسماعیل خان نے خود فوجی اندازہ کرنے میں شدید غلطی کی۔ اس نے یہ سوچ کر کہ

طالبان شکست کھانے کے بعد حوصلہ ہار چکے ہیں اور بکھرنے والے ہیں، ان کے خلاف اس عالم میں حملہ شروع کر دیا کہ نہ فوج منظّم کی گئی تھی اور نہ ہی ضروری اسباب فراہم کئے گئے تھے۔ اس نے 23 اگست 1995ء کو ایک ہفتے بعد ہلمند کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا اور یوں قندھار کے لئے خطرہ پیدا کر دیا اس کی فوج نا موافق اور مخالف ماحول میں دور تک پھیل گئی۔ اس کے برعکس طالبان نے پورے موسم گرما میں پاکستان اور سعودی عرب کی مدد سے اپنی فوج کو نئے اسلحے سے لیس کیا۔ گولہ بارود فراہم کیا اور موٹر گاڑیاں تیار کیں۔ آئی ایس آئی کے مشیروں کی مدد سے نئی کمان منظّم اور قائم کر لی۔ آئی ایس آئی نے طالبان اور جنرل رشید دوستم کے درمیان ایک معاہدہ کرانے میں بھی کردار ادا کیا۔ یہ معاہدہ خفیہ رکھا گیا، اس کے تحت دوستم نے مگ لڑاکا طیارے اور ہیلی کاپٹر مرمت کرنے کے لئے اپنے ازبک ماہروں کو قندھار بھیجا۔ یہ طیارے اور ہیلی کاپٹر طالبان نے ایک سال پہلے قندھار میں ہی قبضے کے وقت پکڑے تھے۔ اس طرح طالبان کو پہلی مرتبہ فضائی طاقت حاصل ہوگئی۔ ادھر دوستم نے ہرات پر بمباری بھی شروع کر دی۔

طالبان نے اسماعیل خاں کے خطرے سے نمٹنے کے لئے جلدی سے 25 ہزار افراد کو جنگ کے لئے منظّم کیا۔ ان میں سے بہت سے پاکستانی رضا کار تھے۔ تجربہ کار سپاہیوں کو دوستم کی گاڑیوں کے ذریعے ان جگہوں پر پہنچا دیا گیا، انہوں نے اسماعیل خان کی سپلائی لائن میں رخنہ اندازی شروع کر دی۔ اگست کے اواخر میں طالبان نے گریشک کے مقام پر مداخلت کاروں پر فیصلہ کن حملہ کیا، جس کے سبب سے اسماعیل خان پیچھے ہٹ گیا۔ چند ہی دنوں میں طالبان اس کی فوجوں کو دھکیلتے ہوئے سنڈاڈ تک لے گئے۔ جسے اسماعیل خان 3 ستمبر 1995ء کو خالی کر گیا تھا۔ اس نے کسی جگہ بھی طالبان کو روکنے یا ان کی مزاحمت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ طالبان نے گاڑیوں پر بڑی سرعت سے مخالف فوج کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ اسماعیل خان اپنے کمانڈروں اور کئی سو افراد کو

لے کر ہرات سے نکل کر ایران چلا گیا۔ اگلے ہی روز حکومت کے حامی ہجوم نے پاکستان کے سفارت خانے پر حملہ کر دیا، جس میں پاکستانی سفیر زخمی ہو گیا۔ یہ سب کچھ سرکاری فوجیوں کے سامنے ہوا۔ فوجی سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن خاموش رہے۔ یہ حملہ ہرات پر طالبان کے قبضہ حملے کا ردعمل تھا۔ صدر برہان الدین ربانی نے پاکستان پر کھلا الزام لگایا کہ وہ طالبان کی مدد سے انہیں اقتدار سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں سرد مہری پیدا ہو گئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

ایران سے لگنے والی سرحد تک کے سارے مغربی علاقے پر جس میں پشتونوں کو اتنی اکثریت بھی حاصل نہیں تھی، طالبان کا کنٹرول ہو گیا۔ طالبان نے ہرات سے ویسا ہی سلوک کیا جو مقبوضہ شہروں سے کیا جاتا رہا ہے۔ سینکڑوں ہراتی شہریوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تمام سکول بند کر دیئے گئے اور طالبان نے اپنے معاشرتی ضابطے اور شرعی قوانین کا سختی سے نفاذ کرنا شروع کر دیا۔ ایسا انہوں نے قندھار میں بھی نہیں کیا تھا۔ ستمبر میں مقامی بھگوڑوں اور حامیوں کو انتظامیہ میں نمائندگی دینے کی بجائے درانی پشتونوں کو سب اختیار سونپ دیا گیا۔ ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جو فارسی بول سکتے تھے، نہ سمجھ سکتے تھے۔ ان کے لئے مقامی لوگوں سے بول چال ممکن نہ تھی۔ آئندہ چند برسوں تک کسی ایک ہراتی کا انتظامیہ میں شامل کیا جانا بھی ممکن نہ تھا۔ پڑھی لکھی مہذب شہری آبادی پر ایسے ان پڑھ پشتونوں کی حکمرانی ہو گئی تھی جو ہرات کی شان وشوکت اور تاریخی اہمیت سے یکسر نابلد تھے۔ ہراتی باشندوں کے لئے بس ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ جامی کے مزار پر جاتے اور یہ قطعہ پڑھتے، جس کا مفہوم کچھ اسطرح ہے کہ جب تمہارا چہرہ مجھ سے چھپ جائے، جس طرح چاند اندھیری رات میں چھپ جاتا ہے تو میں آنسو بہاتا ہوں، ستاروں جیسے، لیکن ان چمکتے ستاروں کے باوجود رات بدستور کالی اور اندھیاری رہتی ہے۔ ہرات کے ہاتھ سے نکل جانے سے صدر ربانی کی حکومت کے زوال کی ابتدا ہو گئی۔ اپنی کامیابیوں کے نشے میں سرشار طالبان نے اکتوبر اور نومبر کے دوران کابل پر

اس خیال سے ایک اور یلغار کی کہ شائد قدم جمانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ موسم سرما شروع ہونے والا تھا، جس میں برفباری کی وجہ سے جنگ کرنا اور جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ طالبان ہٹیلے تھے، وہ شہر فتح کرنے کے دوسرے طریقے آزمانے کا سوچنے لگے۔ وہ احمد شاہ مسعود کو کمزور کرنے کے لئے ٹینکوں سے حملہ کرنے کی بجائے اس کے اہم ساتھیوں کو رشوت دینے کا حربہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔

MashalBooks.org

کابل 1996

دین داروں کا رہبر

1996ء کے خنک موسم بہار میں سینکڑوں افغان ملا ٹرکوں، جیپوں اور گھوڑوں پر سوار قندھار آنا شروع ہو گئے۔ 20 مارچ تک 1200 پشتون دینی رہنما شہر میں اتر چکے تھے۔ انہیں سرکاری دفاتر، پرانے قلعے اور مسقف بازار میں ٹھہرایا گیا۔ ملاؤں اور علماء کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ مقامی فوجی کمانڈر روایتی قبیلوں اور خاندانوں کے لیڈر، سیاسی شخصیتیں اور شمالی افغانستان کے غیر پشتونوں کے نمائندے اس اجتماع میں موجود نہیں تھے۔ ملا عمر نے صرف مذہبی رہنماؤں کو آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچ بچار کرنے اور سب سے بڑھ کر اپنے آپ کو طالبان کے سب سے طاقتور لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کرانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ دس ماہ کے محاصرے کے باوجود طالبان کابل میں داخل نہیں ہو سکے تھے، ان کی اموات بڑھنے لگیں تھیں اور نچلی سطح پر بے چینی پیدا ہونے لگی تھی۔ سرما کے طویل مہینوں میں اعتدال پسندوں نے کابل کی حکومت سے مذاکرات کرنے کی ضرورت کا تذکرہ کرنا شروع کر دیا، لیکن سخت رویہ رکھنے والوں کی خواہش تھی کہ پورے ملک کو زیر نگیں کرنے کے لئے جدوجہد جاری رہنی چاہیے، پشتونوں میں بھی اختلاف رائے تھا۔ قندھاری گروپ جو ملا عمر کا ساتھ دے رہا تھا۔ جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ پشتون علاقوں سے تعلق رکھنے والے چاہتے تھے کہ جنگ ختم ہو، امن قائم ہو۔

ملک سے باہر رہنے والوں نے بھی محسوس کیا کہ طالبان دوراہے پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ نہ طالبان کابل لے سکتے ہیں اور نہ ہی مسعود قندھار۔ طالبان کابل لینے میں ناکام رہے تو کون سا راستہ اختیار کریں گے؟ کابل لینے میں کامیاب ہو بھی گئے تو باقی کا افغانستان ان کی طرز کے اسلامی نظام کو کیسے قبول کر سکے گا۔ دو ہفتوں تک شوریٰ کے اجلاس دن رات جاری رہے۔ الگ الگ مجالس میں سیاسی اور فوجی مستقبل سے متعلق غور وخوض ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے کیا جانا تھا کہ شریعت کے نفاذ کی موثر صورت کیا ہو سکتی ہے۔ طالبان کے علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا کیا جائے۔ شوریٰ اور ذیلی مجالس میں جتنی کچھ بھی بات چیت اور بحث وتمحیص ہوئی، راز میں رکھی گئی۔ اس عرصے میں غیر ملکیوں کی قندھار میں آمد کی ممانعت رہی۔ تاہم پاکستانی افسر شوریٰ کی کارروائی سے آگاہی کے لئے موجود رہے۔ ان میں کابل میں متعین پاکستان کے سفیر قاضی ہمایوں آئی ایس آئی کے کئی افسر ہرات میں پاکستان کے متصل جنرل کرنل امام شامل تھے۔

ملا عمر کے حامی قندھاریوں کے گروپ نے اختلافات ختم کرانے کے لئے ملا عمر کو امیر المومنین قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ اس لقب سے وہ جہاد کے غیر متنازع لیڈر اور افغانستان کے امیر بن گئے۔ (بعد میں طالبان نے افغانستان کو ''امارت افغانستان'' کا نام دیا) 4 اپریل 1996ء کو ملا عمر شہر کے وسط میں ایک عمارت کی چھت پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حبہ زیب تن کیا ہوا تھا۔ 60 برس میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہ حبہ اس کی زیارت گاہ سے باہر نکالا گیا تھا۔ جب ملا عمر نے پہنا پھر اتار کر ہوا میں لہرایا تو نیچے صحن میں جمع ملاؤں نے با آواز بلند نعرہ لگایا ''امیر المومنین'' بعد میں ملاؤں نے ملا عمر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ملا عمر نے متبرک حبہ پہن کر افغانوں ہی نہیں تمام مسلمانوں کی رہبری کا استحقاق حاصل کر لیا۔ یہ اجلاس ربانی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کے اعلان پر ختم ہوا۔ طالبان نے حلف اٹھایا کہ وہ اپنے مخالفوں سے

MashalBooks.org

مذاکرات نہیں کریں گے۔ افغانستان میں جائز حکومت کے قیام کے بعد ہی عورتوں کی تعلیم کے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔ ملا عمر اور ان کے انتہا پسند رفقاء کی جیت ہو گئی۔

لیکن بہت سے افغانوں اور مسلمانوں کے لئے یہ حرکت درست نہ تھی کہ گاؤں کا ایک کم علم ملا، جس کی کوئی قبائلی حیثیت بھی نہیں۔ اس طرح کا منصب سنبھال لے۔ 1834ء میں شاہ دوست محمد خان نے سلطنت کے خلاف جہاد شروع کرنے سے قبل یہ لقب اختیار کیا تھا، ان کے سوا کسی افغان نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ دوست محمد تو غیر ملکیوں سے لڑ رہا تھا، جبکہ ملا عمر نے اپنے ہی لوگوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے۔ اسلام میں اس طرح کا لقب حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔ ملک بھر کے علماء اتفاق رائے سے اس کا فیصلہ کریں تو یہ الگ بات ہوگی۔ طالبان کا اصرار تھا کہ شوریٰ کے اجلاس نے ابھی حل وعقد کے بارے میں قرآن کے مقررہ معیار کے عین مطابق فیصلہ کیا ہے۔ ملا عمر کو اس خطاب سے اپنے جائز امیر ہونے کی تصدیق حاصل ہوگئی اور پشتونوں کی ایک طرح کی تسکین ہوگئی کہ مجاہدین کے کسی لیڈر نے جنگ کے دوران یہ مقام نہیں پایا تھا۔ اب ملا عمر کو روزمرہ کی سیاست سے الگ تھلگ رہنے، غیر ملکی سفیروں سے نہ ملنے، طالبات کی قیادت کو وسعت نہ دینے یا مخالفوں سے ملنے کے ضمن میں بے لچک رویہ اپنانے کا اختیار اور جواز مل گیا۔ اب وہ مخالف لیڈروں سے برابر کی سطح پر بات چیت کرنے سے انکار کرنے کے لئے اپنے لقب کا سہارا لے سکتے ہیں۔ طالبان افغانستان پر کس طرح سے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں اور ملک اقتصادی اور معاشرتی تعمیر و ترقی کا کیا منصوبہ رکھتے ہیں؟ ان بے حد حساس اور اہم سوالوں کے بارے میں علماء کے اجلاس میں جان بوجھ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ کابل پر قبضہ ہو جانے کے بعد بھی ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکا۔ ملا عمر کے معاون ملا وکیل نے کہا کہ ''ہم نے اپنے حکومتی ڈھانچے کے متعلق کوئی اعلان نہیں کیا۔ اس لئے ہم ابھی یہ فیصلہ کرنے کے قابل

نہیں ہو سکے کہ ملک کا صدر کون ہوگا اور وزیراعظم کون''۔ شوریٰ سیاست اور سیاسی جماعتوں کو اجازت نہیں دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری ملازموں اور سپاہیوں کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔صرف غذا، کپڑے، جوتے اور ہتھیار دیئے جاتے ہیں۔ہم اپنا رہن سہن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کا رکھنا چاہتے ہیں۔ جہاد کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ہم رسول اللہ کا دور واپس لانا چاہتے ہیں۔ افغان عوام کی گزشتہ 14 برس سے یہی خواہش ہے۔ ایک دوسرے طالبان لیڈر نے کہا کہ ہم اپنے دشمنوں سے محبت کر سکتے ہیں لیکن انہیں شکست دینے کے بعد۔

ایک دن پیشتر طالبان کے نمائندوں نے مسطیری کو اسلام آباد میں بتایا کہ ہم صدر ربانی سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔مسطیری نے کہا کہ اگر طالبان بھی گفت وشنید پر آمادہ ہیں اور صدر ربانی بھی اس کے لئے تیار ہیں تو یہ اہم تبدیلی سمجھی جائے گی۔علماء کے اجلاس کا آخری فیصلہ مسطیری کے لئے نا قابل برداشت اور اقوام متحدہ کی بحالی امن کی کوششوں کے لئے کاری ضرب ثابت ہوا۔ مئی میں مسطیری نے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔

علماء کے اجلاس نے جو فیصلے کیئے ان کا ایک محرک تو مخالفین کو دبانے میں ہونے والی کامیابی تھی۔ دوسرے صدر ربانی کے مئوقف کے لئے بڑھتی ہوئی عالمی حمایت کی روک تھام کرنے کی ضرورت کا احساس تھا۔کابل کی فوجی کامیابیوں نے حکمت یار کو تو بے اثر کر دیا۔ ہزارہ قبائیل اور طالبان کے حملے نے حکومت کو باور کرا دیا کہ وسیع تر سیاسی قبولیت حاصل کرنے کے لئے کوشش ہونی چاہیے اور اپنی حمایت بڑھانے کی تدبیر کی جانی چاہیے۔ادھر صدر ربانی نے دوسرے جنگی سرداروں سے بات چیت شروع کر دی۔ انہیں جھانسہ دیا کہ وہ نئی حکومت بنا رہے ہیں، جس میں انہیں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جنوری اور فروری 1996ء میں صدر ربانی کے نمائندے ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے گلبدین حکمت یار سے سروبی میں، جنرل رشید دوستم سے مزار شریف میں اور حزب وحدت کے

لیڈروں نے بامیان میں ملاقات کی۔ فروری میں تمام مخالف گروہوں میں سوائے طالبان کے ایک دس رکنی کونسل بنانے پر اتفاق ہو گیا۔ کونسل کا کام کابل سے امن کی بحالی کی شرائط کے بارے میں بات چیت کرنا تھا۔

طالبان کے اس اصرار کے باوجود کہ وہ شکست تسلیم کرلے حکومت سے مذاکرات کا یہ سلسلہ جاری رکھنا طے پایا۔ چند ہفتے بعد حزب اسلامی نے حکمت یار کو صدر ربانی سے اقتدار میں شرکت کا معاہدہ طے کرنے کا اختیار دے دیا۔ پاکستان کو صدر ربانی کی کامیابیوں پر تشویش تھی۔ اس نے جنگی سرداروں کو طالبان سے مل کر، کابل کی حکومت کے مخالفت میں اتحاد قائم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ آئی ایس آئی نے حکمت یار، دوستم، جلال آباد شوریٰ کے پشتون لیڈروں اور حزب وحدت کے سربراہوں کو اسلام آباد آنے کی دعوت دی اور انہیں طالبان کا ساتھ دینے کے لئے کہا۔ ان افغان سرداروں نے صدر فاروق احمد لغاری اور فوج کے سربراہ جنرل جہانگیر کرامت سے ملاقات کی۔ 7 سے 13 فروری کے درمیان مذاکرات جاری رہے، جن میں پاکستان نے سیاسی اتحاد قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ نجی گفتگو میں کابل پر مشترکہ حملہ کرنے کا خاکہ پیش ہوا، جس کی رو سے طالبان کو جنوب سے حکمت یار کو مشرق سے اور دوستم کو شمال کی جانب سے حملہ کرنا تھا۔ نصیراللہ بابر نے طالبان کو آمادہ کرنے کے لئے 3 ملین ڈالر کے خرچ سے شمالی افغانستان میں چمن سے ترکمانستان کی سرحد پر قدر گنڈی تک سڑک بنانے کی پیش کش کی۔ طالبان نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ وزیر داخلہ نصیراللہ بابر، جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن اور آئی ایس آئی کی ذاتی اپیلوں کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ طالبان ان سرداروں سے کسی قسم کا علاقہ رکھنے پر تیار نہ ہوئے، جنہیں وہ کمیونسٹ اور بے دین کہتے اور ان کی مذمت کرتے رہے تھے۔

کابل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوششوں کے ناکام ہونے سے صدر برہان الدین ربانی کے حوصلے مزید بڑھ گئے۔ مارچ میں انہوں نے ایک ساٹھ رکنی وفد

کے ساتھ ایران، ترکمانستان، ازبکستان اور تاجکستان کا وسیع دورہ کیا، وہاں اپنے لئے بین الاقوامی حمایت اور اضافی فوجی امداد کی فراہمی پر زور دیا۔ روس اور ہندوستان نے جو کابل حکومت کی حمایت کرتے رہے تھے، اندازہ کیا کہ اندرونی باہمی کشمکش ایک نازک مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ کابل کے لئے ایک اور جنگ، علاقے میں عدم استحکام اور وسطی ایشیاء میں اسلامی بنیاد پرستی کے فروغ کا موجب ہوگی۔ ایران ہرات پر پشتونوں کا قبضہ ہو جانے پر برافروختہ تھا، اس لئے بھی کہ پشتون شیعوں کے سخت مخالف تھے۔ دوسرا انہیں علاقے میں ایران کے مخالفوں یعنی پاکستان اور سعودی عرب کی پشت پناہی حاصل تھی۔ روس، کابل کی حکومت کو طالبان کے مقابلے میں زیادہ اعتدال پسند اور لچکدار سمجھتا تھا۔ دوسرے اسے وسطی ایشیائی جمہوریتوں کی سلامتی کے سلسلے میں تشویش تھی۔ روس تاجکستان میں کمیونسٹ حکومت اور اسلامی باغیوں کے درمیان چار سالہ جنگ کے خاتمے کا خواہاں تھا۔ اس کے خیال میں اس جنگ کو افغانستان کی طرف سے بھڑکایا جا رہا تھا۔ ہندوستان کابل حکومت کی صرف اس لئے حمایت کر رہا تھا کہ پاکستان طالبان کا طرفدار تھا۔

ان تمام ملکوں نے کابل کی فوجی امداد میں اضافہ کر دیا۔ روس نے بگرام ایئرپورٹ کی سہولتوں میں اضافے کے لئے فنی امداد فراہم کی۔ روس ٹرانسپورٹ طیارے، روس، تاجکستان اور یوکرین سے اڑ کر کابل کو ہتھیار، گولہ بارود اور ایندھن پہنچاتے۔ ایران نے مشہد سے بگرام کا درمیانی فضائی پل فراہم کر دیا۔ جس کے ذریعے کابل حکومت کو اسلحہ فراہم ہونے لگا۔ پاکستانی انٹیلی جینس نے اطلاع دی تھی کہ بگرام میں رسد پہنچانے کے لئے ایک دن میں ایران کی 13 پروازیں آئیں۔ سی آئی اے کو شک تھا کہ ربانی حکومت کے شیعہ حلیفوں نے پانچ اینٹی ائرکرافٹ سٹنگر فرائل ایران کے ہاتھ بیچے ہیں اور فی مزائیل ایک ملین ڈالر وصول کئے ہیں۔ (امریکہ نے 1986۔87ء میں مجاہدین کو 900 میزائیل دیئے تھے اور 1992ء کے بعد اس نے غیر استعمال شدہ مزائیل

واپس لینے کے لئے ناکام کوشش کی تھی)۔

ایران نے بھی مشہد کے قریب 5000 سپاہیوں کی تربیت کے لئے پانچ کیمپ قائم کئے تھے۔ ان سپاہیوں کا تعلق ہرات کے سابق گورنر اسماعیل خان سے تھا۔ ایران کی طرف سے کابل حکومت کی امداد اس لحاظ سے اہم تھی کہ ایک سال قبل کابل میں ہزارہ شیعوں کا جو قتل عام ہوا تھا، اس پر ایران کو احمد شاہ مسعود پر سخت غصہ تھا۔ جسے پی کراس نے کابل کی امداد شروع کی۔ ہندوستان نے افغان کی قومی ایئر لائن آریانا کو از سر نو منظم کرنے اور مؤثر بنانے میں مدد کی اور یوں افغان حکومت کو اسلحے کی فراہمی کا لائق اعتماد بندوبست کر دیا۔ ہندوستان نے طیاروں کے فاضل پرزے، زمینی ریڈار اور پیسے بھی دیئے۔

اس کے مقابلے میں پاکستان اور سعودی عرب نے طالبان کی فوجی امداد میں اضافہ کر دیا۔ پاکستان نے طالبان کو ٹیلی فون اور وائرلیس کا نظام قائم کر دیا۔ قندھار ایئر پورٹ کی اصلاح اور تعمیر کا کام انجام دیا۔ راکٹوں سمیت فاضل پرزے فراہم کئے، سعودی عرب نے ایندھن، سرمایہ اور سینکڑوں نئی پک اپ گاڑیاں دیں۔ زیادہ تر ساز و سامان بذریعہ ہوائی جہاز قندھار کے ایئر پورٹ پر پہنچایا گیا۔ افغانستان کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت پر امریکہ نے پریشانی اور ناگواری کا اظہار کیا اور چار برس بعد ایک بار پھر افغان خانہ جنگی ختم کرانے میں دلچسپی لینا شروع کی۔ مارچ کے اوائل میں امریکی کانگرس اور خارجہ تعلقات سے متعلق سینٹ کی سب کمیٹی کے رکن ہینک براؤن چھ برس میں پہلے منتخب امریکی ترجمان تھے۔ جنرل نے کابل اور دوسرے اہم شہروں کا دورہ کیا۔ وہ تمام افغان دھڑوں کا واشنگٹن میں اجلاس طلب کرنا چاہتے تھے۔ جنوبی ایشیا کے لئے امریکی اسسٹنٹ آف سٹیٹ رابن رافیل افغانستان کے بارے میں امریکی پالیسی کا جائزہ لینے کے لئے اسلام آباد پہنچیں۔ 19 اپریل 1996ء رافیل نے پہلے کابل، قندھار اور مزار شریف کا اور بعد میں وسطی ایشیا کی جمہوریتوں کے تین دارالحکومتوں کا

دورہ کیا۔ رافیل نے کابل میں کہا کہ ہم افغان امور میں مداخلت کرنا نہیں چاہتے۔ افغانستان کے دوست کی حیثیت سے ہمارا کہنا ہے کہ افغان اپنے طور پر اکٹھے ہوں اور باہم بات چیت کے ذریعے معاملات نمٹائیں۔ہمیں خدشہ ہے کہ اگر سیاسی استحکام حاصل نہ کیا گیا تو اقتصادی بحالی کے میسر امکانات کھو جائیں گے۔ ان کا اشارہ ترکمانستان سے افغانستان کے راستے پاکستان تک گیس پائپ لائن کے مجوزہ منصوبے کی طرف تھا، جو امریکی آئیل کمپنی یونوکال کو مکمل کرنا تھا۔ امریکہ چاہتا تھا کہ اس منصوبے پر تمام افغان دھڑے متفق ہو جائیں۔اس نے پاکستان سے کہا کہ وہ ربانی حکومت سے صلح کر لے اور اسے اور طالبان کو مذاکرات کرنے پر آمادہ کرے۔ امریکہ دوسرے محاذوں پر بھی سرگرم عمل رہا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے 10 اپریل 1996ء کو افغانستان کے مسئلہ پر غور شروع کیا۔ چھ برس میں پہلی مرتبہ افغانستان پر کونسل کا اجلاس ہوا تھا۔ اس میں تجویز کیا گیا کہ افغانستان کے لئے بین الاقوامی فوجی امداد پر بندش لگا دی جائے۔ رافیل چاہتی تھی کہ اس تجویز کا سہارا لے کر علاقے کے تمام ملکوں کو افغانستان میں دخل اندازی ختم کرنے پر رضامند کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی تمام افغان دھڑوں کا اجلاس بلانے کے لئے اقوام متحدہ کی کوششوں کو زوردار بنانے کی سعی کی جائے۔

کلفٹن انتظامیہ طالبان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ رکھتی تھی، اس لئے کہ طالبان ایران کی مخالفت میں وہی رویہ رکھتے تھے، جو امریکہ کا تھا۔ دوسرے وہ وسطی ایشیا سے جنوبی پائپ لائن بچھانے کے حق میں تھے۔ اس صورت میں ایران کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ کیونکہ پائپ لائن ایران سے باہر ہی باہر گزاری جا سکتی تھی۔ امریکی کانگریس سے افغانوں کے مابین مذاکرات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صدر ربانی نے مجھے کابل میں بتایا کہ اس اتحاد میں مزید اہم مخالف شخصیات کو شامل کر کے امن کا محور قائم کیا جا سکتا ہے۔ میری دوسروں کو دعوت ہے، وہ بھی اس عمل میں شریک

ہوں تا کہ ایک عبوری حکومت کے قیام کے لئے کوئی فارمولا تلاش کیا جا سکے۔ یہ اہم کامیابی تھی، جس نے طالبان کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلامی اتحاد کے مضبوط ہونے سے پہلے صدر ربانی کے خلاف فوری کارروائی کی جانی چاہیے۔

طالبان نے ایک سال سے دارالحکومت کے باہر ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ وہ کابل پر بڑی بے رحمی کے ساتھ گولہ باری کرتے آ رہے تھے۔ اپریل 1996ء میں انہوں نے 866 راکٹ پھینکے، جن سے 180 شہری ہلاک اور 550 زخمی ہوئے۔ شہر کے بڑے حصے تباہ ہو گئے۔ یہ اسی نوعیت کے حملے تھے، جس طرح حکمت یار نے 1993۔95ء میں کئے تھے۔ جولائی 1996ء میں طالبان کے راکٹ، افغانستان کے لئے اقوام متحدہ کے مصالحت کنندہ، جرمن سفارت کار نار برٹ ہال کے قریب آ کر پھٹے۔ اس نے طالبان سے کہا کہ امن کے کسی داعی سے اس طرح کا سلوک روا نہیں، آپ کے گھر میں کوئی مہمان آئے تو آپ اس پر تھوکنا شروع نہیں کر دیں گے۔ اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ آپ کو میرے مشن سے نفرت ہے"۔

طالبان کے راکٹوں سے حملوں کے دوران شہر کے جنوب اور مغرب میں احمد شاہ مسعود کی فوج پر بھی زمینی حملے کئے جاتے رہے۔ مئی کے آخر میں کابل سے باہر، میں ایک پہاڑی پر مسعود کے دستوں کے ساتھ کھڑا دوربین لئے طالبان کی درجن پک اپ گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جو مسعود کی صفوں کو چیر کر ایک سڑک پر آگے بڑھنے کی کوشش میں تھیں۔ انہیں طالبان کے توپ خانے کا کور حاصل تھا۔ جواب میں مسعود کی روسی ساختہ ڈی 30 توپیں طالبان کی توپوں پر گولے برسا رہی تھیں۔ بمباری کی آواز سے پہاڑیاں گونج رہی تھیں اور کان پھٹے جا رہے تھے۔ میری ٹانگیں اور گھٹنے کانپ رہے تھے۔ توپچیوں کے کان بہرے ہو گئے تھے، ان کے پاس گولوں کے دھماکوں کے شور سے بچنے کا کوئی سامان نہیں تھا۔

مسعود کی صفوں کے پیچھے سے سپاہیوں کی نئی کھیپ اور گولہ بارود پہاڑی پر پہنچایا جا رہا

تھا۔ مسعود کی فوج کے ایک جرنیل نے کہا کہ ''طالبان کے پاس وافر گولہ بارود ہے، وہ ہزاروں گولے پھینکتے رہتے ہیں، لیکن ان کا نشانہ اچھا نہیں۔ البتہ وہ اپنے ٹینکوں، پک اپ گاڑیوں کا ایک سال پہلے کی نسبت بہتر استعمال کرنے لگے ہیں۔ ان کی فوجی چالیں اچھی نہیں، وہ سامنے سے حملہ کرنے پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کے پاس کمان کا بھی کوئی موثر سلسلہ نہیں''۔ طالبان ایک محاذ پر افرادی قوت اور گولہ باری کو مرتکز نہیں کر پاتے، جس کے بغیر وہ مزاحمت کو ختم کئے بغیر شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ مسعود ان کی صفوں کو مسلسل توڑتا آ رہا ہے، لیکن وہ شہر کے گرد اپنا حفاظتی حصار برقرار رکھ سکتا ہے، اپنے 25 ہزار سپاہیوں کے ساتھ جنگ کے دائرے کو وسعت دینے اور طالبان کو پیچھے دھکیلنے کا اہل نہیں۔ ایران کو کمزور اور غیر مستحکم کرنے کے لئے سی آئی اے کو 20 ملین ڈالر فراہم کئے۔ تہران نے امریکہ پر الزام لگایا کہ وہ طالبان کی مالی امداد کر رہا ہے، واشنگٹن کی طرف سے اس نوع کے الزامات کی ہمیشہ تردید ہوتی رہی تھی۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے کئی نمائندے امریکہ پر یہ زور دینے کے لئے واشنگٹن بھیجے کہ وہ کھل کر پاکستان اور طالبان کی طرفداری کرے، لیکن امریکہ نے ایران سے مخالفت کے باوجود افغانستان کی خانہ جنگی میں کسی ایک دھڑے کا ساتھ دینا منظور نہ کیا۔ رافیل نے پرزور تردید کی کہ امریکہ طالبان کی کس قسم کی مدد کر رہا ہے۔ ہم ایک دھڑے کو دوسرے دھڑے پر ترجیح دینے یا کسی ایک گروپ یا فرد کی مدد کرنے کے روادار نہیں۔

امریکہ کو یہ بھی شک تھا کہ طالبان مستقبل قریب میں کابل فتح کر سکتے ہیں۔ رافیل کے نزدیک طالبان مختلف دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں، ناتجربہ کار ہیں، مضبوط اور مئوثر قیادت سے محروم ہیں۔ انتظامی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انہوں نے اپنی خود آرائی اور خود پسندی سے تمام دوسرے دھڑوں کو ناراض کر لیا ہے۔ طالبان کی دو کمزوریاں اور مسعود کی روز افزوں طاقت سے لگتا تھا کہ توازن طالبان کے خلاف ہوتا جا رہا ہے اور وہ شاید ہی کبھی کابل پر قبضہ کر سکیں۔ انہوں نے جتنی وسعت اختیار کرنا تھی، کر لی۔ جنوب

میں ان کی حیثیت اس لئے مضبوط ہے کہ یہ علاقہ پشتونوں کا ہے۔

امریکہ دوسرے دھڑوں کے سربراہوں سے بھی مذاکرات کرتا رہا، ان دھڑوں کے کئی سربراہوں نے واشنگٹن جا کر بات چیت کی۔ سب سے پہلے جنرل رشید دوستم نے 11 اپریل 1996ء کو واشنگٹن میں امریکی افسروں سے ملاقات کی۔ تمام دھڑوں کے افغان لیڈروں یا ان کے نمائندوں نے 25 سے 27 جون تک سینیٹر ہینک براؤن کے ساتھ دوسرے کانگریس کے ارکان سے ملاقات کی جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ امریکہ میں یہ انتخابات کا سال تھا اس لئے افغانستان کے قبضے میں دوبارہ ملوث ہونے کی عدم خواہش کے باعث افغان لیڈروں کی آمد اور ان سے مذاکرات کو چنداں اہمیت نہ ملی۔ اس کے باوجود کہ افغانستان میں اسلحہ اور منشیات کی تجارت میں اضافہ امریکہ کے لئے پریشان کن تھا، اس کے مقاصد محدود تھے۔

طالبان کی مدد میں امریکہ کی عدم دلچسپی کی ایک وجہ برہان الدین ربانی کے خلاف اتحاد قائم کرنے میں پاکستان کی ناکامی تھی۔ مئی میں حکمت یار کے ایک ہزار سپاہی طالبان کے خلاف حکومت کی مدد کے لئے کابل پہنچے، جس سے پاکستان کو مزید خفت اٹھانا پڑی۔ 26 جون 1996ء کو حکمت یار 15 برس میں پہلی مرتبہ کابل آئے اور حکومت کی پیش کش پر وزیراعظم بننا منظور کر لیا۔ ان کے نو ساتھیوں نے کابینہ میں شرکت کر لی۔ طالبان نے اسی روز جوابی اقدام کرتے ہوئے کابل پر راکٹوں سے حملہ کر دیا، جس میں 61 افراد مارے گئے اور 100 زخمی ہوئے۔ صدر ربانی نے حکمت یار سے سیاسی معاملہ کرنے کے بعد جلال آباد جا کر وہاں کی شوریٰ کو حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے کسی بھی افغان لیڈر کے حق میں صدارت کا منصب چھوڑنے پر رضامندی بھی ظاہر کی اور تجویز کیا کہ ریاست کا نیا سربراہ منتخب کرنے کے لئے جلال آباد میں کل جماعتی کانفرنس منعقد کی جائے۔ اگست تک دوستم بھی جنگ بند کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے شاہراہ سالانگ کھول دی اور یوں کابل کا ملک کے شمالی

MashalBooks.org

علاقوں سے پھر سے رابطہ قائم ہو گیا۔ صدر ربانی کے معاہدوں کے نتیجے میں طالبان کی مخالف دھڑوں سے معاملہ نہ کرنے کی ضد نے پاکستانیوں کو مایوس کیا، لیکن طالبان نے پاکستان اور سعودی عرب کو کابل پر قبضہ کرنے کی ایک دوسری کوشش میں ان کی مدد کرنے پر آمادہ کر لیا۔ سعودی انٹیلی جینس کا سربراہ، شہزادہ ترکی الفیصل نے جولائی 1996ء میں اسلام آباد اور قندھار کا دورہ کیا اور آئی ایس آئی سے کابل پر قبضہ کرنے کے نئے منصوبے پر تبادلہ خیال کیا۔ دونوں ملکوں نے طالبان کی امداد بڑھا دی۔ شہزادہ ترکی کی آمد کے دو مہینے بعد طالبان نے پیش قدمی شروع کر دی۔ کابل کی طرف نہیں بلکہ مشرقی شہر جلال آباد کی طرف۔ پاکستان اور سعودی عرب نے جلال آباد شوریٰ کے سربراہ حاجی عبدالقدیر کو بھاری رشوت دے کر ہتھیار ڈالنے اور آخر میں فرار ہونے پر آمادہ کر لیا۔ بعض افغانوں کا کہنا تھا کہ اسے 10 ملین امریکی ڈالر نقد دینے کے علاوہ یہ ضمانت بھی دی گئی کہ پاکستان میں اس کے اثاثے اور بینک اکاؤنٹ منجمد نہیں کیے جائیں گے۔ طالبان نے جلال آباد پر 25 اگست 1996ء کو اچانک حملہ کیا۔ ان کی فوج جنوب سے شہر کی جانب بڑھ رہی تھی تو پاکستان نے افغان مہاجر کیمپوں سے طالبان کے ہزاروں مسلح حامیوں کو سرحد پار کر کے مشرق کی طرف سے جلال آباد پر دھاوا بدلنے کی اجازت دے دی۔ جلال آباد میں سخت خوف و ہراس پھیل گیا۔ شوریٰ انتشار کا شکار ہو گئی۔ حاجی قدیر 10 ستمبر کو بھاگ کر پاکستان چلا گیا۔ ایک دن بعد اس کا جانشین گورنر محمود اپنے چھ محافظوں سمیت پاکستان فرار ہوتے ہوئے قتل ہو گیا۔ اسی شام طالبان کا ایک دستہ ملا بورجان کی سربراہی میں جلال آباد میں داخل ہو گیا۔ مختصر سی مزاحمت ہوئی، جس میں 70 افراد ہلاک ہو گئے۔

اگلے چند دنوں میں طالبان کے دستوں نے تین مشرقی صوبوں ننگرہار، لغمان اور کنہار پر قبضہ کر لیا۔ 24 ستمبر 1996ء کی رات کو انہوں نے سروبی کی طرف پیش قدمی کی، سروبی کابل سے 45 میل کے فاصلے پر ہے اور اس کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ ان کے برق

رفتار حملے نے جو کئی سمتوں سے ہوا تھا، سرکاری فوجیوں کو حیران کر دیا اور وہ سراسیمگی کے عالم میں شہر کی طرف بھاگ گئے۔ دارالحکومت مشرق کی جانب سے بالکل کھلا تھا۔ طالبان نے اپنی صفیں ااستوار کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور اپنی تمام تر توجہ سروبی کا دفاع کرنے والوں پر مرکوز رکھی۔ طالبان کے کچھ دستوں نے جنوب کی طرف سے کابل پر چڑھائی جاری رکھی۔ فوج کے ایک حصے نے سروبی سے شمال کی طرف باگرام کے ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیا اور مسعود کا واحد فضائی رابطہ کاٹ دیا۔

انہوں نے جس تیزی سے حملہ کیا، اس پر کابل حکومت ششدر رہ گئی۔ طالبان کے دستے 26 ستمبر 1996ء کو اس وقت کابل میں داخل ہوئے، جب مسعود نے چند گھنٹے پہلے شہر خالی کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور اس کی فوجیں شہر سے نکل گئی تھیں۔ طالبان کی پیش قدمی کی رفتار سست کرنے کے لئے چند چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ ان کا ایک کام گولہ بارود کے ذخیروں کو تباہ کرنا تھا۔ مسعود اور اس کی فوجوں نے بھاری تعداد میں اسلحہ، گولہ بارود بچا لیا تھا۔ اس نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ اس حقیقت کی بنا پر کیا تھا کہ وہ چاروں سمتوں سے حملہ آور طالبان فوج سے شہر کا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کابل کے شہریوں کی حمایت سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا، وہ شہر کا دفاع کرنے کے لئے طالبان سے جنگ کرتا تو شہریوں کا خون ہوتا۔ طالبان کی فتح ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ حکومت یا اپوزیشن میں سے کسی نے بھی اتنے بڑے عرصہ جنگ میں اس سرعت رفتار سے اتنی پیچیدہ نوع کی جنگی چالیں کبھی نہیں چلی تھیں۔

طالبان نے پہلا کام یہ کیا کہ پچاس سالہ صدر نجیب اللہ کو جس نے 1986ء سے 1992ء تک حکومت کی تھی، پھانسی پر لٹکا دیا۔ نجیب اللہ نے 1992ء سے کابل کے وسطی علاقے میں اقوام متحدہ کے سفارتی احاطے میں پناہ لے رکھی تھی۔ کابل پر مجاہدین کا قبضہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے اقوام متحدہ کے ثالث نبن سیون، نجیب اللہ کو کابل سے نکال لے جانا چاہتے تھے لیکن آخری لمحے انہیں روک دیا گیا۔ اقوام متحدہ کے دفاتر کو جو

سفارتی تحفظ حاصل تھا، تمام افغان دھڑے اس کا احترام کرتے تھے۔ نجیب اللہ کی بیوی اور تین بیٹیاں 1992ء سے نئی دہلی میں مقیم تھیں۔

اقوام متحدہ کی حماقت بھی نجیب اللہ کی موت کا موجب ہوگئی، جس دن سروبی پر طالبان کا قبضہ ہوا، اسی روز نجیب اللہ نے اسلام آباد میں اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کو پیغام بھیجا تھا، جس میں نور بٹ ہال سے کہا گیا تھا کہ انہیں اور ان کے تین ساتھیوں بھائی شاہ پور احمزئی، ذاتی سیکرٹری اور محافظ کو کابل سے باہر لے جانے کا انتظام کر دیا جائے۔ صرف مسعود نے نجیب کو شہر سے باہر جانے کے لئے لفٹ دینے کی پیش کش کی تھی۔ 26 ستمبر 1996ء کی سہ پہر کو مسعود نے اپنا ایک سینئر جرنیل نجیب اللہ کے پاس یہ کہنے کے لئے بھیجا کہ وہ شہر خالی کر کے جانے والی فوج کے ساتھ چلا جائے، اس نے وعدہ کیا کہ اسے بحفاظت شمال پہنچا دیا جائے گا، لیکن نجیب نے ماننے سے انکار کر دیا وہ ایک باغیرت اور ضدی آدمی تھا۔ غالباً اسے ڈر تھا کہ اگر وہ تاجیکوں کے ساتھ فرار ہوا تو عمر بھر کے لئے پشتونوں کی نظر سے گر جائے گا۔

اقوام متحدہ نے نجیب اللہ کی حفاظت کے لئے صرف تین افغان مقرر کر رکھے تھے، انہوں نے جب شہر کے باہر سے طالبان کی گولیاں چلنے کی آواز سنی تو وہ ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ شام کو نجیب اللہ نے اسلام آباد میں اقوام متحدہ کے دفتر کو وائرلیس سے آخری پیغام بھیجا اور مدد مانگی، لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ طالبان نے پانچ افراد پر مشتمل ایک یونٹ کو نجیب اللہ کو ختم کرنے کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ اس یونٹ نے ملا عبدالرزاق کی قیادت میں رات کے ایک بجے نجیب اللہ کا کام تمام کر دیا۔ اس وقت تک طالبان شہر کے وسط تک پہنچے بھی نہیں تھے۔

عبدالرزاق ہرات کا گورنر رہ چکا تھا، بعد میں وہ کابل پر قبضہ کرنے والی فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ اس نے بعد میں تسلیم کیا کہ نجیب اللہ کو قتل کرنے کا حکم اسی نے دیا تھا۔ طالبان نجیب اللہ کے کمرے میں گئے، اسے اور اس کے بھائی کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش

MashalBooks.org

ہو گئے۔ پھر انہیں ایک پک اپ میں ڈال کر اندھیرے میں صدارتی محل میں لے جایا گیا۔ نجیب اللہ کو ایک جیپ کے پیچھے باندھ کر گھسیٹا گیا اور کئی چکر دیئے گئے اور پھر اسے گولی ماردی گئی۔ اس کے بھائی کو مار پیٹ کے بعد گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔ بعد میں دونوں لاشوں کو محل سے باہر اقوام متحدہ کے احاطے سے کچھ ہی فاصلے پر گلے میں پھندا ڈال کر ٹریفک کنٹرول کے کھمبے سے لٹکا دیا گیا۔ صبح کو کابل کے شہریوں نے دونوں لاشوں کو، جن کے گلے میں تار کے پھندے تھے لٹکتا دیکھا۔ ان کی انگلیوں میں سگریٹ اور جیبوں میں افغانی نوٹ بھر دیئے گئے تھے۔ یہ بدعنوانی کرنے والوں کو طالبان کا پیغام عبرت تھا۔ نجیب اللہ کے دو ساتھی احاطے سے بھاگ گئے تھے، لیکن شہر سے نکلتے وقت پکڑے گئے۔ ان دونوں کو بھی پھانسی دے دی گئی۔

نجیب اللہ کا قتل کابل میں طالبان کا پہلا علامتی بے رحمانہ اقدام تھا۔ مقصد آبادی کو ڈرانا اور خوفزدہ کرنا تھا۔ کابل شوریٰ کے لئے نئے سربراہ ملا ربانی نے اعلان کیا کہ نجیب اللہ کمیونسٹ اور قاتل تھا۔ طالبان نے اس لئے اسے موت کی سزا دی۔ یہ سچ سہی لیکن لاشوں کو مسخ کرنے کا کیا جواز تھا۔ اسلام نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ انصاف کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے منصفانہ مقدمہ چلایا جانا چاہیے تھا۔ لاشوں کو سرعام لٹکانے کو اکثر کابلیوں نے پسند نہیں کیا۔ نجیب اللہ کا جنازہ اٹھانے اور پڑھنے کی ممانعت کا بھی لوگوں نے برا مانا۔ پاکستان کے پشتونوں نے اگلے روز کوئٹہ اور پشاور میں نجیب اللہ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ نجیب اللہ کی میت پکتیا صوبے میں اس کی جائے ولادت گردیز لے جائی گئی۔ جہاں اس کے احمدزی قبیلے کے لوگوں نے اسے سپرد خاک کیا۔ نجیب اللہ کے قتل کی دنیا بھر، خاص طور پر اسلامی دنیا میں شدید مذمت کی گئی۔ طالبان نے اقوام متحدہ، عالمی برادری، اپنے حلیفوں، پاکستان اور سعودی عرب، غرض سب کی بے وقعتی اور خجالت کا سامان کیا۔ اقوام متحدہ نے بیان جاری کیا کہ جائز عدالتی طریق کے بغیر سابق صدر کا قتل کیا جانا نہ صرف یو این کے دفاتر کو حاصل سفارتی تحفظ کی صریح خلاف

ورزی ہے بلکہ افغانستان کے مسئلے کی پرامن تصفیہ کی کوششوں کو بے اثر کرنے کا بھی موجب ہے۔ طالبان نے اپنی روش نہیں بدلی، انہوں نے دوستم، ربانی اور مسعود کے لئے بھی موت کی سزا کا حکم جاری کیا۔

کابل پر قبضے کے 24 گھنٹے کے اندر طالبان نے سخت ترین اسلامی نظام نافذ کر دیا۔ عورتوں کو کام کرنے سے روک دیا گیا۔ کابل کی سول سروس ابتدائی تعلیمی نظام اور علاج معالجے کا بیشتر کام عورتیں ہی انجام دے رہی تھیں۔ لڑکیوں کے سکول اور کالج بند کر دیئے۔ اس طرح ستر ہزار طالبات متاثر ہوئیں۔ ان کا سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ عورتوں کے لئے برقعہ اوڑھنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ 25 ہزار خاندانوں کے نان نفقے کی کفالت، جنگ کے دوران بیوہ ہو جانے والی خواتین پر تھی۔ ان کے کام پر جانے کی مخالفت سے ان خاندانوں کی کفالت کا کوئی انتظام نہ رہا۔ اب ہر روز نئے اعلانات ہونے لگے۔ 28 ستمبر 1996ء کو ریڈیو کابل سے اعلان ہوا کہ چوروں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے۔ زانیوں کو سنگ بار کر دیا جائے گا۔ شراب خوروں کو کوڑے مارے جائیں گے۔ ٹی وی، ویڈیو، سٹیلائٹ، ڈشوں، موسیقی، شطرنج، فٹ بال سمیت تمام کھیلوں کی مخالفت کر دی گئی۔ ریڈیو کابل کا نام ریڈیو شریعت رکھ گیا اور موسیقی کے نشر بند کر دیئے گئے۔ طالبان سپاہی گلی کوچوں میں ان مردوں کو پکڑنے لگے جنہوں نے داڑھیاں نہیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہرات اور دوسرے شہروں کے برعکس کابل میں بین الاقوامی پریس اور ٹی وی کا خاصا بڑا عملہ موجود تھا۔ جس نے طالبان کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیوں کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی۔

طالبان نے کابل پر حکومت کرنے کے لئے ایک چھ رکنی شوریٰ قائم کر دی، اس میں زیادہ تر درانی پٹھان تھے۔ کسی کابلی کو شوریٰ میں شامل نہیں کیا گیا۔ ملا محمد ربانی اس کے سربراہ مقرر ہوئے، دوسرے ارکان ان میں ملا غوث وزیر خارجہ، ملا امیر خان متقی وزیر اطلاعات، ملا سید غیاث الدین آغا، ملا فاضل محمد اور ملا عبدالرزاق شامل تھے۔ شوریٰ کا

کوئی رکن کبھی کسی بڑے شہر میں نہیں رہا تھا۔ ان میں سے اکثر نے اس سے پہلے کابل دیکھا بھی نہیں تھا۔ اب وہ ایک نیم جدید مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے بارہ لاکھ افراد کے شہر کو، جہاں پشتونوں کی حیثیت چھوٹی سی اقلیت کی تھی، چلانے کے ذمہ دار تھے۔ طالبان کی مذہبی پولیس نے شریعت کے نفاذ کے لئے کابل سے ایک مقبوضہ شہر کے طور پر سلوک کرنا شروع کیا۔ کسی کو اس بات کا فہم نہیں تھا کہ ایک بڑے شہر اور ایک گاؤں کا نظم و انصرام یکسر مختلف ہے۔

واقعات سے ظاہر ہوا کہ طالبان کی مکمل فتح کی راہ میں احمد شاہ مسعود حائل ہے۔ افغان جہاد سے جو کرشماتی شخصیتیں نمایاں ہوئیں، مسعود ان میں سے الگ تھا۔ وہ ایک منجھا ہوا اور شاندار جرنیل ہے۔ کابل کے شمال میں پنج شیر وادی اس کی جائے پیدائش ہے۔ اس نسبت سے اسے پنج شیر کا شیر کہا جانے لگا۔ 1980ء کے عشرے میں اس نے پنج شیر وادی پر سوویت فوجوں کے سات بڑے حملوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ سوویٹ جرنیلوں نے تسلیم کیا کہ اسے شکست نہیں دی جا سکتی۔ وہ گوریلا جنگ کا ماہر ہے۔ اس کی 20 ہزار افراد کی فوج اس پر جان چھڑکتی ہے۔ 1992ء میں جب اس نے کابل فتح کیا تو اس کی شہرت پورے عروج پر تھی۔ کابل میں کمیونسٹ حکومت زوال پذیر تھی، حکمت یار اس حقیقت کے پیش نظر کابل پر قبضہ جمانا چاہتا تھا لیکن احمد شاہ مسعود نے اسے اس کا موقعہ نہیں دیا اور خود شہر پر قابض ہو گیا۔ کابل پر چار سال کے قبضے نے مسعود کی فوجوں کو مغرور اور خودسر بنا دیا۔ وہ شہریوں کو تنگ کرنے، دکانوں سے چیزیں چرانے اور لوگوں کے مکانوں پر قبضہ کرنے لگے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کابل کے شہریوں نے طالبان کا خیر مقدم کیا۔

مسعود 1953ء میں ایک فوجی خاندان میں پیدا ہوا۔ کابل میں فرانسیسیوں کے زیر اہتمام چلنے والے سکول میں تعلیم پائی۔ سب سے پہلے صدر داؤد کی مخالفت میں اٹھنے والی اسلامی تحریک میں شامل ہوا۔ شہر میں بغاوت کرانے میں ناکامی کے بعد 1975ء

میں بھاگ کر پاکستان چلا گیا۔ پشاور سے جلا وطنی کے زمانے میں اس کی اپنے ساتھی گلبدین حکمت یار سے ان بن ہو گئی۔ ان کی دشمنی نے آئندہ بیس برس تک مجاہدین کو اکٹھا نہیں ہونے دیا اور ایک متحدہ حکومت نہیں بن پائی۔ پاکستان کے خلاف اس کی تلخی کی وجہ پاکستان کی طرف سے پہلے حکمت یار کی اور اب طالبان کی حمایت ہے۔ پاکستان سے مخاصمت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جہاد کے دوران مسعود کا تقاضا تھا کہ جنگ کی حکمت عملی طے کرنے کا فیصلہ آئی ایس آئی کے بجائے افغانوں کو کرنے دیا جائے۔ امریکہ کی طرف سے آنے والے ہتھیاروں کی تقسیم پاکستان کر رہا تھا۔ جس سے مسعود کے دل میں ایسی دشمنی پیدا ہوئی جو آج بھی موجود ہے۔ 1992ء میں جب کابل پر جنوب کی طرف کے پشتونوں کی بجائے شمال کی جانب کے تاجکوں اور ازبکوں نے قبضہ کیا تو اس پر پاکستان کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔

مسعود قیام امن سے دامن بچاتا رہا، وہ اچھا سیاست دان نہیں ہے۔ وہ دوسرے پشتون سرداروں کو جو حکمت یار کے مخالف ہیں، یہ باور نہیں کرا سکا کہ تاجک پشتون اتحاد ہی امن قائم کرنے کا واحد وسیلہ ہے۔ وہ فوجی حکمت عملی بنانے کا ماہر ضرور ہے لیکن وہ مختلف گروپوں اور پارٹیوں میں سیاسی اتحاد قائم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ تاجک ہے۔ 1929ء کی ایک ناکام بغاوت کے سوا تاجکوں نے کبھی کابل پر حکومت نہیں کی۔ پشتون ہمیشہ ان پر بے اعتمادی کرتے رہے ہیں۔

کابل میں وہ الگ تھلگ اور کم آمیز رہا۔ فوج کا کمانڈر ہونے کے باوجود اس نے صدر ربانی کی حکومت میں وزیر دفاع کا منصب سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ جب ہر شخص بیٹھنے کے لئے کرسی کی تلاش میں ہو تو بہتر یہی ہے کہ آدمی فرش پر بیٹھ جائے''۔ مئی 1996ء میں اس نے مجھ سے کہا کہ پاکستان افغانستان کو نو آبادی بنانے کے لئے یہاں ایک پٹھو حکومت قائم کرنا چاہتا ہے لیکن ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ افغان ہمیشہ آزاد رہے ہیں۔ اس کے چند ہی ہفتے بعد طالبان نے اسے کابل

سے نکال باہر کیا۔ احمد شاہ مسعود ہر روز اٹھارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ دو ملٹری سیکرٹری شفٹوں میں باری باری اس کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ رات کو وہ صرف چار گھنٹے سوتا ہے اور قتل ہو جانے کے ڈر سے کسی ایک جگہ دو سے زیادہ راتیں قیام نہیں کرتا۔ وہ اپنے آدمیوں کے درمیان سوتا، کھاتا اور لڑتا ہے۔ کسی بھی بڑے معرکے میں وہ ہمیشہ پہلی صف میں ہوتا ہے۔ طالبان نے اسے کابل سے نکال دیا تو لگا کہ سارا ملک ان کے قبضہ میں آنے والا ہے، اس نے طالبان کو بہت بڑا چیلنج سمجھ لیا۔ 1999ء میں اس کی عمر 46 برس ہوگئی تھی اور وہ 25 برس سے مسلسل جنگ کرتا رہا تھا۔

مسعود کابل سے نکلا تو پنج شیر کے علاقے میں شاہراہ سالانگ تک پیچھے ہٹ گیا۔ طالبان نے اس کا تعاقب کیا۔ مسعود کے آدمیوں نے پہاڑوں کو بارود سے اڑا کر وادی میں داخل ہونے والے تمام راستے بند کر دیئے۔ طالبان نے پیش قدمی جاری رکھی لیکن وہ وادی پنج شیر میں داخل نہ ہو سکے، وہ شاہراہ سالانگ کے پاس کے دیہات پر قبضہ کرتے ہوئے جب درہ سالانگ پہنچے تو دوستم کی فوجوں نے جو مزار شریف کی طرف سے آئی تھیں، انہیں روکا، اس وقت یہ واضح نہیں تھا کہ دوستم کس کا ساتھ دے گا۔ اس کی فوجوں نے طالبان سے جنگ نہیں کی۔

ملا ربانی نے ازبکوں کو غیر جانبداری پر آمادہ کرنے کے لئے 8 اکتوبر 1996ء کو دوستم سے ملاقات کی، لیکن مذاکرات کامیاب نہیں ہوئے۔ طالبان نے دوستم کو شمال میں خودمختاری اور اقتدار دینے سے انکار کر دیا۔ دوستم نے محسوس کر لیا کہ مسعود سے اختلافات اپنی جگہ لیکن سبھی غیر پشتونوں کو اصل خطرہ طالبان کی طرف سے ہے۔ 10 اکتوبر 1996ء کو معزول صدر برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود، جنرل رشید دوستم اور ہزارہ لیڈر کریم خلیلی میں ملاقات ہوئی، جس سے مادر وطن کے دفاع کے لئے سپریم کونسل قائم کرنے پر اتفاق ہو گیا۔ یہ نئے طالبان مخالف اتحاد کا آغاز تھا، جن کے سبب سے خانہ جنگی جاری رہنا فطری تھا۔

طالبان کی شمال جانب برق رفتار پیش قدمی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دور دور پھیل گئے۔ مسعود نے اس سے فائدہ اٹھایا اور 12 اکتوبر 1996ء کو شاہراہ کے ساتھ ایک بڑا جوابی حملہ کیا، اس نے کئی قصبوں پر قبضہ کر لیا اور طالبان قومی سراسیمگی کے عالم میں کابل کی طرف بھاگنے لگے۔ مسعود کے حملے میں سینکڑوں مارے گئے۔ 18 اکتوبر 1996ء کو مسعود کی فوجوں نے بگرام کے ہوائی اڈے پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور کابل ایئر پورٹ پر گولہ باری شروع کر دی۔ دوستم کی ایئر فورس کابل میں طالبان کے ٹھکانوں پر بمباری کر رہی تھی۔ اس جنگ میں ہزاروں شہری ہلاک ہوئے اور 50 ہزار افراد گھروں سے نکل کر شاہراہ سالانگ کے ساتھ کے دیہات کی طرف بھاگ گئے۔ کابل میں لاکھوں شہری جن میں زیادہ تر تاجک اور مزارے تھے۔ پاکستان کی سرحد کی جانب بھاگنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے تھے، وہ طالبان کی سزا اور گرفتاری سے بچنا چاہتے تھے، جس کا سلسلہ شہر ہی میں شروع ہو چکا تھا۔

جنگ میں کام آنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے طالبان کے لئے افرادی طاقت کی کمی کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ انہوں نے کابل سے نوجوانوں کی جبری بھرتی شروع کر دی، وہ مسجدوں میں جا کر نمازیوں کو پکڑ لاتے اور اپنی فوج میں شامل کر لیتے۔ پاکستان میں بعض علماء نے اپنے مدرسے بند کر دیئے، ان کے طلباء کے لئے کوئی کام نہیں رہا تھا، وہ رضا کاروں کی حیثیت سے طالبان سے جا ملے۔ سینکڑوں پاکستانی طلبا افغان مہاجر کیمپوں سے بسوں کے ذریعے قندھار اور کابل پہنچنا شروع ہوئے۔ پاکستان نے انہیں پاسپورٹ اور ویزے کی پابندیوں سے آزاد کر دیا تھا۔ طالبان کو نئی امداد ملی تو انہوں نے ہرات اور بغدلیس صوبے کی طرف سے مغربی افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اکتوبر 1996ء کے اواخر میں اسماعیل خان اور اس کے دو ہزار سپاہی ایران سے جہاں وہ جلا وطن تھے، دوستم کے طیاروں پر بغدلیس میں طالبان کا مقابلہ کرنے پہنچے۔ ایران نے طالبان مخالف اتحاد کو مضبوط بنانے کی کوشش میں اسماعیل خان کے آدمیوں کو جان بوجھ کر اشتعال انگیز

انداز میں جدید ہتھیاروں اور ساز وسامان سے لیس کیا۔نومبر، دسمبر کے دوران بغدیس میں شدید جنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے فضائی حملے بھی کیئے جاتے رہے۔ 50 ہزار بے گھر افراد ہرات کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سے اقوام متحدہ کے امدادی اداروں کے لئے بڑی نازک صورت حال پیدا ہوگئی۔ برفباری اور جنگ میں انسانی امداد مہیا کرنا ممکن نہیں تھا۔ طالبان نے شدید برف باری میں بھی مسعود کو کابل کے نواح سے پیچھے دھکیل دیا۔جنوری 1997ء کے آخر تک انہوں نے سالانگ شاہراہ کے آس پاس کا وہ سارا علاقہ واپس لے لیا جوان کے قبضے سے نکل گیا تھا۔گلام کے فضائی اڈہ پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔مسعود نے طالبان کو دوستم کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر پنج شیر کی طرف مراجعت کی۔ کابل پر طالبان کا قبضہ ہونے اور شدید جنگ چھڑ جانے سے پورے علاقے میں طرح طرح کے خدشات ابھرنے لگے۔ ایران، روس اور چار وسطی ایشیائی جمہوریتوں نے طالبان کو انتباہ کیا کہ وہ شمال کی طرف نہ بڑھیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ طالبان مخالف اتحاد کو فوجی امداد دیں گے۔ پاکستان اور سعودی عرب نے اپنے سفارت کار یہ دیکھنے کے لئے کابل بھیجے کہ طالبان کی کیا مدد کی جاسکتی ہے۔اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں نے جنگ بندی اور ثالثی کے لئے اپیلیں کیں لیکن ضد پر اڑے ہوئے طالبان نے سنی ان سنی کر دی۔ علاقے میں ایک طرف پاکستان اور سعودی عرب طالبان کی حمایت کر رہے تھے تو دوسری طرف وسط ایشیاء کی علاقائی ریاستیں ان کے مخالفوں کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ طالبان کی بڑی خواہش تھی کہ انہیں بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا جائے، لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی۔ ملا محمد حسن نے شکایت کی کہ ہم نے ملک کا تین چوتھائی حصہ فتح کر لیا ہے۔ دارالحکومت بھی ہمارے قبضے میں آچکا ہے لیکن ہمیں کسی جانب سے ایک بھی پیغام تہنیت نہیں ملا۔

ملا عمر اپوزیشن یا اقوام متحدہ سے مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ ان کا پختہ یقین اور غیر متزلزل عزم آخرکار ان کی فوجی فتح کا سبب بنا۔ کابل جو 1772ء سے افغان

پشتون بادشاہوں کا دارالحکومت چلا آ رہا تھا اور جو گزشتہ چار برس سے تاجک حکمرانوں کے قبضے میں چلا گیا تھا پھر سے پشتونوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ کئی لوگوں کا خیال اور پیش گوئی تھی کہ طلباء کی تحریک دارالحکومت پر کبھی قبضہ نہیں کر سکے گی لیکن اس نے کر لیا۔ بے شمار نقصانات کے باوجود طالبان کا وقار اتنا کبھی بلند نہیں ہوا تھا، تاہم ان کی فتح، نسلی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو شدید تر کرنے کا موجب ہوئی جس کا نتیجہ افغانستان کی تقسیم اور علاقے میں ملکوں کے درمیان محاذ آرائی کی صورت میں نکلا۔ ''جنگ چال بازی کا کھیل ہے''۔ ملا عمر نے کہا: ''جنھوں نے کابل جانے سے انکار کر دیا ہے اور قندھار میں بھی رہتے ہیں''۔ طالبان کو ایک صوبہ فتح کرنے میں پانچ مہینے لگے لیکن چھ صوبے صرف دس دن میں ہمارے ہاتھ آ گئے۔ ہم بائیس صوبوں پر قابض ہیں، جن میں کابل بھی شامل ہے۔ انشاء اللہ سارا افغانستان ہمارے پاس ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ پرامن مذاکرات کے ذریعہ سمجھوتے کی کئی کوششیں ناکام ہونے کے بعد اب اس مسئلے کا فوجی حل ہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ شمالی افغانستان ان کے قبضے میں آنے ہی والا ہے۔

MashalBooks.org

شمال میں قتل عام

یہ کس کو توقع تھی کہ موسم بہار میں طالبان مزار شریف پر حملہ کریں گے۔ یہ شمالی افغانستان میں طالبان مخالف اتحاد کا مضبوط مرکز اور جنرل رشید دوستم اور اس کے ازبکوں کے کنٹرول میں تھا۔ طلبان نے رسد کی فراہمی کے سارے راستے بند کر رکھے تھے۔ اس لئے سرما میں اشیائے صرف کی قلت پیدا ہوگئی۔ ڈالر کے مقابلے پر افغانی سکے کی زرمبادلہ بہت کم رہ گئی۔ ایک ڈالر کے عوض دگنے افغانی ملنے لگے اور جب مزار شریف کے دولت مند باشندے وسط ایشیاء کی طرف بھاگ گئے تو یہ تناسب ایک اور تین کا ہو گیا۔ افغانستان کی زیادہ تر آبادی جنوب میں مرتکز ہے اور اب طالبان کے کنٹرول میں ہے۔ جبکہ افغانستان کے 60 فیصد زرعی وسائل 80 فیصد سابق صنعتیں گیس اور معدنیات شمال میں ہیں۔ گزشتہ صدی میں کابل کا شمال پر کنٹرول، ریاست کی تعمیر اور معیشت کی ترقی میں مددگار ثابت ہوا تھا۔

طالبان ملک کو فتح کرنے اور اسے متحد رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے شمالی جنگی سرداروں کی خودمختاری ختم کرنا پڑے گی۔ مئی میں طالبان کا حملہ شروع ہوا تو کسی کو توقع نہیں تھی کہ وفاداریاں بدلنے اور ان کی مخالفت کا خون ریز ڈرامہ شروع ہو جائے گا۔ مختلف نسلوں کے لوگوں کے درمیان خون ریزی شروع ہو جائے گی اور پورے وسطی ایشیاء کو پریشان مضطرب کر دے گی۔

دوستم، سرما میں، مزار شریف کے باہر قلعہ جنگی میں پناہ لئے بیٹھا تھا، اچانک ہمسایہ ریاستوں اور کئی افغانوں نے اسے طالبان کے خلاف آخری امید قرار دینا شروع کر دیا۔ مزار شریف وسطی ایشیاء کے میدانی علاقے میں جو کوہ ہندوکش سے شروع ہوتا ہے، واقع ہے۔ یہ شہر ثقافتی اور نسلی لحاظ سے قندھار سے اتنے ہی فاصلے پر ہے جتنا قندھار کراچی سے دور ہے۔ یہاں کا انیسویں صدی کا قلعہ کسی یورپی لارڈ کے قلعے کی طرز کا ہے، جس کے گرد دفاع کے لئے خندقیں ہیں۔ مٹی کی فصیلیں الف لیلوی انداز کی ہیں۔ قلعے کی زیبائش فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔ وسطی امارت پر نیلا گنبد ہے۔ یہیں دوستم کا دفتر ہے۔ قلعے کی حفاظت کے لئے ٹینک، توپیں اور تربیت یافتہ فوجی ہیں، جو آج بھی کمیونسٹ دور کی وردیاں پہنتے ہیں۔ قلعہ باہر سے خصوصاً غیر ملکی سفیروں کو متاثر کرنے کا وسیلہ ہے۔ دوستم سے ملنے والوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں۔

اس نے طاقت کا بے محابا استعمال کیا ہے۔ میں جب دوستم سے ملنے قلعے میں پہنچا تو کیچڑ سے بھرے ہوئے صحن میں جگہ جگہ خون کے دھبے اور گوشت کے ٹکڑے دکھائی دیئے۔ میں نے محافظوں سے معصومانہ انداز میں پوچھا کہ کیا یہاں بکری ذبح ہوئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک گھنٹہ پیشتر دوستم نے ایک سپاہی کو چوری کرنے کی پاداش میں سزا دی ہے۔ اسے روسی ٹینک سے باندھا گیا، پھر ٹینک ایک چکر میں چلایا گیا، جس سے اس کا جسم قیمہ ہو گیا۔ دوستم اور اس کے فوجی یہ منظر دیکھتے رہے۔ ازبک وسطی ایشیا کی قومیتوں میں سے سب سے زیادہ کھردرے اور سخت گیر ہیں۔ انہیں قتل و غارت گری میں تسکین ملتی ہے۔ شاید انہیں یہ خاصیت ان کے جد امجد چنگیز خان اور اس کے ستمگر ساتھیوں سے ورثے میں ملی ہے۔ دوستم ان کا سردار ہے۔ وہ چھ فٹ قد اور بڑے ہڈ کاٹھ کا شخص ہے۔ انسانی شکل میں ریچھ لگتا ہے، وہ جب ہنستا ہے تو لگتا ہے غرا رہا ہے۔ بعض ازبکوں کا کہنا ہے کہ اس کا گرجدار قہقہہ سن کر لوگوں کی تو جان نکل جاتی ہے۔ 1955ء میں وہ شیرگان کے ایک نواحی گاؤں کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔

MashalBooks.org

1978ء میں افغان فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے وہ کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ دریائے آمو کی بندرگاہ ہیراتن سے جو اشیاء سوویت یونین سے افغانستان آتی تھیں۔ دوستم ان کی سپلائی لائین کی حفاظت پر مامور دستے میں شامل تھا۔ یہیں سے وہ ترقی کر کے ایک مسلح دستے کا کمانڈر بنا۔ 989اء میں افغانستان سے سوویت فوج کے انخلاء کے بعد دوستم نے بڑی لڑاکا اور خونخوار ازبک ملیشیا فورس کی کمان سنبھالی۔ یہ اپنے آبائی صوبے کے نام پر جوزجان کہلاتی تھی۔ صدر نجیب اللہ اسے مجاہدین کے خلاف نہایت سریع الرفتار دستے کے طور پر استعمال کرتا رہا۔ جوز جانی ملک بھر میں لڑتے رہے، جہاں بھی دیکھا جاتا کہ سرکاری فوج کے پاؤں اکھڑنے والے ہیں، جوز جانی دستوں کو اس کی مدد کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔

1992ء میں دوستم سب سے پہلا شخص تھا جس نے اپنے محسن نجیب اللہ سے بغاوت کی، اسی بنا پر وہ غدار اور موقع پرست کہلایا۔ دوستم کبھی شراب کا رسیا تھا، اب وہ اچھا مسلمان بن گیا ہے۔ بعد میں اس نے کبھی احمد شاہ مسعود سے کبھی گلبدین حکمت یار اور کبھی طالبان سے اتحاد کیا، لیکن ہر بار بلاتامل ہر کسی سے غداری کی، وہ ہر ملک کا تنخواہ دار رہا۔ اس نے روس، ازبکستان، ایران، پاکستان اور بعد میں ترکی سے مالی امداد لی۔ 1995ء میں تو وہ بیک وقت ایران سے بھی پیسے لیتا رہا اور پاکستان سے بھی، دونوں ملکوں کے درمیان طالبان کے بارے میں سخت اختلاف تھے، بلکہ مخاصمت تھی۔ اس کا کنٹرول صرف چھ شمالی صوبوں پر تھا۔ اس کے باوجود وہ ہمسایہ ملکوں کی نظر میں ناگزیر تسلیم کیا جاتا رہا۔ ایران، ازبکستان اور روس نے اسے سیکولر لیڈر کے طور پر ابھارا اور سمجھا کہ صرف وہی پشتون بنیاد پرستوں کے خلاف مزاحمی حصار کا کام بھی دے سکتا ہے اور شمال کہ طالبان سے بچا سکتا ہے۔ ان ملکوں کی نگاہ میں اس کی اگر کوئی خوبی تھی تو یہ تھی کہ طالبان کے منظر پر آنے سے بھی پہلے انتہا پسند بنیاد پرستوں کے سخت خلاف تھا۔

مزار شریف جو کبھی قدیم شاہراہ ریشم پر ایک پر رونق پڑاؤ تھا۔ اب پاکستان وسطی ایشیا

اور ایران کے درمیان وسیع سمگلنگ کا وسیلہ بن گیا ہے۔ دوستم نے اپنی بلخ ایئر لائنز کا افتتاح کیا، وہ دوبئی سے مختلف اشیاء کی ناجائز تجارت کا وسیلہ بنی، جو سامان دوبئی سے آتا وہ ٹرکوں کے ذریعے مزار شریف سے 70 میل کے فاصلے پر وسطی ایشیا لے جایا جاتا۔ اس طرح راہداری سے جو محاصل ملتے وہ دوستم کے لئے مستقل آمدنی کا وسیلہ بنتے۔ مزار شریف کے بازار میں روسی شراب اور فرانسیسی پرفیومز عام میسر تھیں جو شراب اور عورتوں کے رسیا ازبک سپاہیوں کے تصرف میں آتیں۔ دوستم نے دوسرے جنگی سرداروں کے علی الرغم اچھی انتظامیہ قائم رکھی تھی، جو صحت اور تعلیم کے شعبوں کی بہتر کارکردگی کی ضامن تھی۔ ملک میں ایک ہی یونیورسٹی مزار شریف میں تھی۔ اس میں 1800 لڑکیاں تعلیم پا رہی تھیں، ان میں اکثریت سکرٹ اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنتی تھیں۔ دوستم نے کابل سے فرار ہو کر آنے والے ہزاروں مہاجروں کو مزار شریف میں پناہ دی اور ان کی دیکھ بھال کا اہتمام کیا۔ مہاجروں کی آمد کا سلسلہ 1999ء سے جاری تھا۔ مشہور افغان مغنی اور رقاص جو کابل میں اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے، مزار شریف چلے گئے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہ کا مزار بھی یہیں ہے، اسی کی نسبت سے یہ شہر مزار شریف کہلاتا ہے۔ شیعہ عقیدے کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں یہاں آتے اور مزار پر دعا کرتے ہیں۔ مزار کے پاس ایک شاندار مسجد ہے، جس کی پورے افغانستان میں کوئی نظیر نہیں۔

نزدیک ہی بلخ کے آثار ہیں۔ ساتویں صدی میں عربوں نے اس شہر کو جو شہروں کی ماں کہلاتا تھا، تاراج کیا۔ 3000 برس قبل زرتشت یہاں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا رہا۔ سکندر اعظم نے یہاں پڑاؤ کیا تھا۔ فارسی کے شہرہ آفاق شاعر رومی یہیں پیدا ہوئے۔ بلخ ہزاروں برس تک تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا، زرتشتیوں اور بودھوں نے بھی یہاں اپنے اثرات مرتب کئے، بعد میں یہاں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ 1220ء میں چنگیز خان نے اسے تباہ کیا، جس کے بعد مزار شریف ثقافتی اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن

گیا۔

دوستم کو اس لئے بھی لائق احترام سمجھا جاتا تھا کہ اس کا شہر اٹھارہ برس سے جنگ سے محفوظ چلا آ رہا تھا۔ یہاں کے شہریوں نے کبھی گولہ باری یا گلی کوچوں میں لڑائی ہوتے نہیں دیکھی تھی، جبکہ کئی دوسرے شہر اسی سبب سے برباد ہو گئے تھے۔ یہ سب کچھ بدل جانے والا تھا۔ ازبک قبیلے کی تاریخ خون خرابے، انتقامی قتل و غارت، اقتدار کے لئے جدوجہد، لوٹ مار اور عورتوں پر جھگڑوں سے بھری پڑی ہے۔ بزکش ازبکوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ یہ ایک طرح کا پولو ہے، جس میں سر کٹی بھیڑ کو چھیننے کی کوشش کی جاتی ہے، بعض لوگوں کے خیال میں ازبک سیاست کا محور بھی بزکش ہی ہے۔ بزکش میں کوئی ٹیم کوئی قاعدہ قانون نہیں ہوتا۔ دوستم کے اپنے افسروں سے روابط بھی کچھ اسی نوع کے ہیں۔

دوستم اور اس کے سیکنڈ کمانڈر جنرل مالک پہلوان کے مابین شدید جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ مالک پہلوان کا دوستم پر الزام تھا کہ اس نے اس کے بھائی جنرل رؤف پہلوان کو قتل کرا دیا تھا۔ جنرل رؤف پہلوان اور اس کے 15 محافظ جون 1996ء میں گھات سے ہونے والے اچانک حملے میں مارے گئے تھے۔ کچھ اور خدشات نے جھگڑے کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دوستم نے جنرل مالک کو قتل کرنے کا بھی حکم دے رکھا ہے وہ طالبان سے رشوت بھی لے رہا ہے۔ طالبان نے اسے اقتدار میں لانے کا وعدہ بھی کیا ہوا ہے۔ جنرل مالک نے 19 مئی 1997ء کو دوستم کا ساتھ چھوڑا اور اسے راستے سے ہٹانے کے لئے طالبان سے مدد مانگی۔ تین سینئر ازبک جرنیل گل محمد پہلوان، غفار پہلوان اور مجید روزی اس کے ہمنوا تھے۔

طالبان ہرات اور کابل سے سرعت رفتار سے شمال کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک ایک کر کے شمالی صوبے پشتون ازبک اتحاد کے قبضے میں آتے گئے۔ دوستم اپنے 135 افسروں سمیت پہلے ازبکستان اور پھر ترکی چلا گیا۔ ازبکستان اور افغانستان کی سرحد پر واقع قصبے

MashalBooks.org

ترمیز سے گزر کر ازبکستان جانے کے لئے اسے اپنے ہی سپاہیوں کو امریکی ڈالروں کی صورت میں رشوت دینا پڑی۔ طالبان کو خدا نے موقع دیا تھا لیکن انہوں نے دوسرے شہروں کو فتح کرنے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا تھا، ان کا رویہ سخت رہا، انہوں نے مقامی لوگوں کو اقتدار میں شریک کرنے سے مسلسل انکار کیا۔ سیاسی اعتبار سے وہ بے لچک رہے، شرعی قوانین میں کسی قسم کی نرمی کرنے سے انکار کرتے رہے، وہ مقامی لوگوں کے نسلی رجحانات کو خاطر میں لانے پر کسی طور پر تیار نہ ہوئے۔ اگر مالک کا خیال تھا کہ طالبان اسے شمال میں اسی طرح کی خودمختاری دے دیں گے، جس طرح کی خودمختاری دوستم کو 1992ء سے حاصل تھی تو یہ ان کی بھول تھی۔

جب 2500 مسلح طالبان (نجیب اللہ کو قتل کرنے کا حکم دینے والے) ملا عبدالرزاق کی قیادت میں مزار شریف پہنچے تو انہوں نے مالک کو شریک اقتدار کرنے سے صاف انکار کر دیا اور انہیں کابل حکومت میں نائب وزیر خارجہ کے معمولی منصب کی پیش کش کی۔ اکثر طالبان پہلے کبھی شمال کو نہیں گئے تھے۔ انہوں نے ازبک اور ہزارہ دستوں سے ہتھیار لینا شروع کر دیئے، مساجد میں پہنچ کر شریعت کے نفاذ کا اعلان کر دیا، سکول بند کر دیئے۔ یونیورسٹی کو بھی ٹھپ کر دیا۔ عورتوں کو گلی کوچوں سے ہٹا کر گھروں میں پہنچا دیا، یہ ایک ایسے شہر کے لئے ہضم نہ ہونے والا نسخہ تھا جس میں مختلف نسلوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مل جل کر رہتے چلے آ رہے تھے۔ آزاد روی ان کا مسلک تھا۔ پاکستانی سفارت کار اور آئی ایس آئی کے افسر طالبان کو معاہدے کی شرائط طے کرانے میں مدد دینے کے لئے دوڑے دوڑے مزار شریف پہنچے، لیکن یہ معاہدہ طے پانے سے پہلے ہی بے اثر ہو چکا تھا۔ اسلام آباد نے طالبان کو افغانستان کی جائز حکومت قرار دینے کا قبل از وقت اعلان کر کے صورت حال کو مزید بگاڑ دیا۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارت کے پاکستان کی تقلید میں طالبان کو تسلیم کرنے سے یہ رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ ازبکوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ یہ اقتدار میں شرکت کی شرائط طے

کرنے کا معاہدہ ہے۔ اب ان پر کھلا کہ طالبان نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ مالک درمیان میں ہی رہ گیا۔ دوستم سے اس کی غداری نے صورت حال کومزید خراب کر دیا۔ خاص طور پر جب اسماعیل خان کو جوفریاب میں طالبان کے خلاف لڑ رہا تھا، ان کے حوالے کر دیا گیا۔

28 مئی 1997ء کی سہ پہر کو ہزارہ قبیلے کے بعض لوگوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا، جس پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس میں سب کی بن آئی اور وہ کھل کھیلنے لگے۔ سب سے پہلے مزار شریف کے ہزاروں اور بعد میں باقی ماندہ آبادی نے بغاوت کر دی۔ طالبان کو گلیوں میں جنگ کرنے کی تربیت نہیں تھی، دوسرے وہ شہر کی سڑکوں سے بھی واقف نہیں تھے۔ وہ اپنی پک اپ گاڑیوں میں ایسی بند گلیوں میں گھستے رہے جن سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ مکانوں اور چھتوں سے ان پر گولیاں برسنے لگیں، پندرہ گھنٹے کی شدید لڑائی میں 600 طالبان ہلاک ہوئے۔ ایئر پورٹ پر ایک ہزار طالبان فرار ہونے کی کوشش کے دوران گرفتار ہوئے۔ طالبان کے دس اہم سیاسی اور فوجی لیڈر یا تو ہلاک ہو گئے یا گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتار ہونے والوں میں وزیر خارجہ ملا محمد غوث، ملا رزاق اور مرکزی بینک کے گورنر ملک احسان اللہ شامل تھے۔ مالک کے آدمیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، شہر لوٹنا شروع کر دیا۔ اقوام متحدہ کی ایجنسیاں بھی ان کی دستبرد سے نہ بچیں۔ اقوام متحدہ کا عملہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس لڑائی میں درجنوں پاکستانی طلبا بھی ہلاک ہوئے۔

مالک کی فوج نے تیزی سے چار صوبوں تخار، فریاب، جوزجان اور سرائے پل پر قبضہ کر لیا۔ طالبان نے صرف پانچ دن پہلے ان صوبوں پر قبضہ کیا تھا۔ تین صوبوں بلخ، سمنگان اور قندوز پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے شدید جنگ ہوئی، ان صوبوں سے باہر نکلنے کے تمام راستے بند ہو گئے، جس سے ہزاروں طالبان اور سینکڑوں پاکستانی طلباء گھر کر رہ گئے۔ بعد میں ان سب کو گولی مار دی گئی اور اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔

احمد شاہ مسعود نے موقع پا کر جوابی حملہ کیا اور درہ سالانگ کے جنوب میں جبل السراج پر قبضہ کرلیا، یوں طالبان کو گھیرے میں لے لیا، وہ شمال سے نکل کر کابل جانے کی کوشش میں تھے لیکن اب ان پر راہ فرار بند ہوگئی تھی۔

مسعود نے کابل کے گرد کا مزید علاقہ اور شمال مشرقی افغانستان کے کئی شہر جو طالبان کے قبضے میں چلے گئے تھے، پھر سے فتح کر لئے۔ یہاں بھی سینکڑوں طالبان مارے گئے یا گرفتار کر لئے گئے۔ ہزاروں نے مزار شریف کی فتح یابی سے شہ پا کر اپنے علاقہ، ہزارہ کے گرد طالبان کا محاصرہ توڑ دیا۔ طالبان فوج، وادی بامیان میں داخل ہوتے ہوتے رہ گئی، اسے پیچھے دھکیل دیا گیا اور خلیلی کی فوج نے جنوب میں کابل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے راستے میں ہزاروں پشتون دیہاتیوں کو کابل کی راہ فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

30 ماہ پہلے ملک فتح کرنے کے لئے منظر پر آنے والے طالبان پر وہ پہلی بڑی شکست تھی۔ مئی اور جولائی کے درمیانی دس ہفتوں کی لڑائی میں 3 ہزار طالبان ہلاک یا زخمی ہوئے۔ 3600 گرفتار کر لئے گئے۔ دونوں طرف کے ساٹھ ہزار افراد زخمی ہوئے۔ اسی عرصے میں 250 پاکستانی ہلاک اور 560 پکڑے گئے۔ طالبان کے صف اول کے بہترین اور مناسب تجربہ کار یونٹ جنگ میں کام آ گئے۔ اس طرح طالبان کو جو زک پہنچی اس سے ان کے حوصلے پست ہونے لگے۔

ملا عمر نے پاکستان کے طلبا سے طالبان کی مدد کرنے کے لئے کہا، اس پر ایک بار پھر پاکستانی مدرسے بند کر دیئے گئے اور 5000 نئے پاکستانی اور افغان رنگروٹ، طالبان کا ساتھ دینے کے لئے پہنچ گئے۔ طالبان کے لئے صورت حال اس درجہ تشویشناک ہوگئی تھی کہ ملا عمر کو قندھار میں اپنی پناہ گاہ سے نکل کر پہلی مرتبہ کابل جانا پڑا۔ مقصد اپنے کمانڈروں اور سپاہیوں سے ملنا اور ان کا حوصلہ بڑھانا تھا۔ طالبان کو افغانستان اور پاکستان کے غلزئی پشتون قبیلے کے لوگوں کو بھرتی کرنے پر مجبور ہونا پڑا، لیکن انہوں نے

سیاسی قیمت کا مطالبہ کیا جو طالبان ادا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔غلزئی قبائیلوں نے سوویت یونین کی فوجوں کے خلاف جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، وہ طالبان کی شوریٰ میں جس پر درانی چھائے ہوئے تھے، پوری نمائندگی ملے بغیر جنگ کا ایندھن بننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ اسی صورت میں آگے آ سکتے تھے کہ انہیں اقتدار میں حصہ ملے۔غلزئی کمانڈر جنہوں نے طالبان کا ساتھ دیا تھا وہ مزار شریف میں طالبان کی چالوں کے سخت مخالف رہے تھے۔ طالبان کا ساتھ دینے والے اہم مشرقی پشتون کمانڈر جلال الدین حقانی نے جولائی 1997ء میں مجھے کابل میں بتایا کہ مزار شریف میں کئی غلطیاں کی گئیں۔ مالک اور طالبان کے درمیان تھوڑے سے وقت میں وہ معاہدہ طے پا گیا جبکہ اسے غور وخوض کے بعد طویل مدت کے لئے طے پانا اور باہمی مذاکرات کی اساس بنانا چاہیے تھا۔انہوں نے فوجی نوعیت کی غلطیاں بھی کیں۔

حقانی نے کابل کے محاذ پر طالبان فوج کی کمان کی تھی، وہ خوست کے صوبہ کا رہنے والا ہے، اس نے 1995ء میں طالبان کا ساتھ دینا شروع کیا تھا وہ سوویت فوجوں کے خلاف لڑنے والے ممتاز کمانڈروں میں سے تھا۔اسے کابل میں وزیر بھی بنایا گیا، لیکن وہ اور دوسرے غیر قندھاری اس بات پر سخت ناراض تھے کہ انہیں ملا عمر کے زیر اہتمام قندھار میں ہونے والے مذاکرات اور فیصلوں میں کبھی شریک نہیں کیا گیا۔مزار شریف کی شکست کے بعد طالبان نے حقانی کو 3 ہزار غلزئی قبائیلیوں کو بھرتی کرنے کے لئے خاصی بڑی رقم دی۔حقانی اپنے آدمی لے کر کابل کے محاذ پر پہنچا۔لیکن اسے فوجی نوعیت کے فیصلے کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ دوسرے وہاں قندھاری افسر چھائے ہوئے تھے، جو کسی کی چلنے نہیں دیتے تھے، اس صورت حال سے گھبرا کر حقانی کے آدمی فوج چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ دو ہفتوں میں کم و بیش تین سو آدمی حقانی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ دوسری پریشان کن صورت یہ پیش آئی کہ قندھار کے قرب و جوار کے دیہاتیوں نے اپنے بیٹوں کو طالبان فوج میں بھرتی کرنے کے لئے انکار کر دیا۔ طالبان کو نئے فوجی بھرتی کرنے

میں مشکل کا سامنا ہوا اور افرادی قوت کی کمی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

وسطی ایشیاء کی ریاستوں نے اپنی سرحدوں پر خون بہتے دیکھا تو جنگ کو اپنے علاقے تک پھیلتا اور ہزاروں افغان مہاجروں کی آمد کا خطرہ محسوس کیا۔ جس کے پیش نظر پورے علاقے میں سخت حفاظتی انتظامات کیے جانے لگے۔ تین ہزار روسی دستے ازبکستان، افغانستان سرحد پر، 25 ہزار روسی سپاہی تاجکستان کی سرحد پر لگا دیئے گئے۔ ترکمانستان نے روسی سرحدی محافظوں اور مقامی فوجی ڈویژنوں کو چوکس کر دیا گیا۔ ازبکستان اور تاجکستان نے شمالی افغانستان کے ساتھ اپنی سرحدیں بند کر دیں۔ ازبک ہیلی کاپٹر نے سرحد پر پروازیں شروع کر دیں اور فوج نے ٹینکوں کا راستہ روکنے کے لئے رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ آٹھ دریا کے پل کو جو افغانستان کو وسط ایشیا سے ملاتا ہے بند کر دیا گیا۔

روس نے کرغیز عسکر اکائیف کی اپیل پر اپنی دس بٹالین فوج کرغیزستان بھیجنے کی پیش کش کی۔ کرغیز کی سرحد افغانستان سے نہیں ملتی۔ روس اور قازقستان نے آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ کا اجلاس بلانے کا اہتمام کیا، جس میں درپیش بحران کے مضمرات پر غور کیا گیا۔ روسی وزیر خارجہ نے یووگنی پریما کوف نے اجلاس میں وعدہ کیا کہ اگر طالبان مزید آگے بڑھے تو روس بڑے سخت اور موثر اقدامات کرے گا۔ ترکمانستان نے اپنے آپ کو غیر جانبدار قرار دے رکھا ہے۔ اس کے طالبان سے تعلقات ہیں، لیکن ترکمان عوام مزار شریف کے گرد جنگ ہوتی دیکھ کر گھبرائے ہوئے ہیں۔ افغان ترکمان جنگ سے پناہ لینے سرحد پار کر کے ترکمانستان پہنچ گئے ہیں۔

ایران نے کہا کہ وہ طالبان کے مخالف اتحاد کی حمایت جاری رکھے گا۔ اس نے روس، ہندوستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے بھی اپیل کی کہ وہ بھی اس اتحاد کی مدد کریں۔ ایران کے وزیر خارجہ علی اکبر ولائتی نے اقوام متحدہ سے مداخلت کرنے کی اپیل کی ہے۔ طالبان اپنے تمام ہمسایوں سے سخت ناراض ہیں۔ طالبان کے وزیر صحت ملا محمد عباس

نے کہا کہ ''ایران اور روس دخل اندازی اور ہمارے مخالفوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انہوں نے طالبان کے مخالفوں کو بمباری کے لئے طیارے دیئے ہیں، ایران اسلحہ پہنچانے کے لئے دن میں 22 پروازیں مزار شریف بھیج رہا ہے''۔

ایران، وسطی ایشیائی ریاستوں کے سفارت کاروں نے پاکستان پر الزام لگایا ہے کہ وہ نہ صرف طالبان کی مدد کر رہا ہے بلکہ طالبان کا حملہ شروع ہونے سے ایک ہفتہ قبل وزیراعظم نواز شریف نے جو وعدہ کیا تھا اس کی صریح خلاف بھی کر رہا ہے۔ اشک آباد میں علاقائی ملکوں کے سربراہوں کے اجلاس میں یقین دلایا گیا تھا کہ جنگ کو شمال کی طرف پھیلنے سے روکا جائے گا۔ ایک ازبک سفارت کار نے مجھے بتایا کہ وسطی ایشیاء میں پاکستان کا اعتبار ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ تاہم شمال میں طالبان کی آمد کا، تاجکستان کی چار سالہ خانہ جنگی پر مثبت اثر ہوا ہے۔ دونوں متحارب گروپوں کو مجبوراً مذاکرات امن کو تیز کرنا پڑ گیا ہے۔ یہ سب طالبان سے ڈرنے کا اثر ہے۔ تاجک حکومت اور اسلامی اپوزیشن کے درمیان صلح کرانے کی جو کوششیں روسی اور اقوام متحدہ نے شروع کر رکھی تھیں، نتیجہ خیز ہوئی ہیں۔ 27 جون 1997ء کو ایک معاہدہ طے ہوا جس کی رو سے احمد شاہ مسعود کو تاجکستان کے اڈوں کے ذریعے روسی امداد ملنے لگے گی۔ مسعود کو جنوبی تاجکستان کا کلیاب ایئر پورٹ استعمال کرنے کا حق مل گیا ہے۔ روسی اور ایرانی فوجی امداد اسی ایئر پورٹ پر پہنچائی جائے گی۔ مسعود یہاں سے اسے آگے پنج شیر لے جایا کرے گا۔

طالبان مخالف اتحاد نے اپنی صفیں درست کرنا شروع کر دی ہیں اور اپنے آپ کو سیاسی اتحاد کی شکل دے لی ہے۔ انہوں نے دوستم کے منظر سے ہٹ جانے کے بارے میں بھی سوچ بچار کی۔ 13 جون 1997ء کو انہوں نے افغانستان کے مسائل کے حل کے لئے اسلامی اور قومی محاذ بنانے کا فیصلہ کیا اور سوچا کہ اس کا صدر مقام مزار شریف ہوگا۔ انہوں نے برہان الدین ربانی کو صدر اور احمد شاہ مسعود کو وزیر دفاع مقرر کیا۔ قبائلی اور

اسلامی لیڈروں کے علاوہ ٹیکنو کریٹس کو نئی حکومت میں شامل کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ لیکن مالک مسعود اور خلیلی کے باہمی اختلافات کے باعث ازبکوں، تاجکوں اور ہزاروں کے مل بیٹھنے اور مل جل کر کام کرنے کے امکانات ختم کر دیئے اور یوں یہ معاہدہ بھی عملی جامہ پہننے سے پہلے ہی تحلیل ہو گیا۔ مالک نے یکے بعد دیگرے جو پینترے بدلے اور جو غداری کی اس کی بنا پر ان کا کردار مشکوک تھا۔ یہی اختلاف بنا اور معاہدہ ٹوٹ گیا۔ مالک 25 ہزار طالبان کو قندوز شہر اور ایئر پورٹ پر قبضہ کرنے سے نہیں روک سکا تھا۔ طالبان ہر روز کابل سے طیاروں کے ذریعے اسلحہ اور سپاہی قندوز پہنچاتے اور یوں اپنی پوزیشن مضبوط بناتے رہے۔ مالک طالبان کو شمال سے باہر نہیں نکال سکا، جبکہ مسعود کابل کے قریب بڑھتا آیا۔ جولائی کے وسط تک احمد شاہ مسعود نے شمال میں چیریکار اور بگرام ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیا جس کے دوران سینکڑوں طالبان مارے گئے۔ میدان جنگ کو پھر سے گرم کر دیا۔ ستمبر تک مسعود کی فوج ایک بار پھر کابل سے صرف 20 میل دور رہ گئی تھی۔ دونوں فریقوں کے درمیان توپ خانے سے بمباری جاری تھی۔ شعر مالی کے سرسبز و شاداب وادی سے ایک لاکھ 80 ہزار کی شہری آبادی نکل بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ وادی جو کابل کے جنوب میں ہے، میدان جنگ بن گئی۔ طالبان نے شومالی وادی سے پیچھے ہٹتے وقت کنوؤں میں زہر ملا دیا اور چھوٹی چھوٹی نہروں اور بندوں کو بارود سے اڑا دیا تاکہ مقامی تاجک آبادی جلد واپس آ کر آباد نہ ہو سکے۔ جنگ اب نہ صرف سول آبادی کی ہلاکت اور فرار کا سبب بن گئی تھی بلکہ لوگ زندگی کے لوازم سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ کابل کے گرد سبزیوں اور پھلوں کے جو باغات تھے اجڑ گئے اور تباہ ہو کر رہ گئے۔

طالبان مخالف اتحاد نے کابل کے گرد ایک سو اسی درجے بڑا حصار قائم کر لیا۔ مغرب اور شمال کی جانب مسعود کی فوجیں تھیں، مشرق اور جنوب میں خلیلی کے ہزارہ تھے۔ خام اندازہ تھا کہ طالبان مخالف اتحاد کی فوجیں کابل پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ ادھر

طالبان کو اعتماد تھا کہ مخالفین اتنے بٹے ہوئے ہیں کہ کابل پر حملہ نہیں کر سکتے۔ حقانی کا کہنا تھا کہ ہم نے اپنی فوج قندوز میں رکھ کر مخالفین کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ شمال کی جانب کے گروپ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ ازبک جرنیل مالک پر اعتماد نہیں کر سکتے، وہ ایک بار انہیں دھوکہ دے چکا ہے اور اب اسے صرف اپنے بچاؤ کی فکر ہے۔ کسی گروپ کے پاس اتنی طاقت نہیں کہ وہ اپنے طور پر طالبان سے جنگ کر سکے، وہ اتحاد کرنے کی کوشش کریں گے لیکن وہ متحد نہیں ہو سکیں گے۔

اتحاد سے مالک کی وفاداری کا مشکوک ہونا قابل فہم تھا۔ ستمبر میں جب طالبان نے اسے قندوز میں اچانک جا لیا۔ انہوں نے قندوز کا حصار توڑ ڈالا اور علاقے کے پشتون قبائیل کی مدد سے مزار شریف پر ایک اور حملہ شروع کیا۔ 7 ستمبر 1997ء تا شخو گران شہر پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ جس سے مزار شریف میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ طالبان کی مزار شریف کی جانب پیش قدمی جاری تھی کہ مالک کے وفادار ازبک اور دوستم کے وفادار فوجیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ دوستم کے سپاہیوں نے مالک کا گھر جلا ڈالا۔ وہ بھاگ کر پہلے فریاب میں اپنے اڈے پر پھر وہاں سے فرار ہو کر ترکمانستان اور بعد میں ایران چلا گیا۔ دوستم ڈرامائی طور پر ترکی میں جلا وطنی ترک کر کے واپس مزار شریف پہنچ گیا، اس نے اپنے دستوں کو مالک کے حامیوں کو شکست دینے اور طالبان کو مزار شریف کے علاقے سے نکال باہر کرنے کے لئے صف آراء کیا۔ ازبکوں نے ایک بار پھر شہر کے بعض علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اقوام متحدہ اور اس کی ایجنسیوں کے دفاتر بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔ انسانی ہمدردی میں امدادی کام کرنے والے کارکنوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ انہیں بھی شہر چھوڑ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ ایک سال میں یہ دوسری بار تھی کہ شہر میں افراتفری پھیلی اور بے سکونی لوگوں کا مقدر بنی۔ سہراب رستم، ایک شخص جو اس قتل و غارت میں بچ گیا تھا اس نے بتایا کہ طالبان نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے مزار شریف کے قریب فاضل آباد نامی گاؤں میں 70 کے قریب ہزارہ

شیعوں کو قتل کر دیا۔ شاید ہزاروں دوسرے افراد ہلاک کیے گئے۔ اس قتل عام میں بچ جانے والے سہراب رستم نے بتایا کہ طالبان طوفان کی طرح تباہی مچاتے گزرے۔ انہوں نے 70 دیہاتیوں کے گلے کاٹ ڈالے، کئی ایک کا چہرہ ادھیڑ لیا گیا۔

طالبان پسپا ہو کر قندوز چلے گئے۔ اس دوران رشید دوستم نے اپنے آپ کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ لیکن مزار شریف پر ہزارہ قبیلے کا قبضہ ہو چکا تھا۔ دوستم کو ازبکوں کے صدر مقام سے نکل کر شیر غان میں اپنا اڈہ بنانا پڑا۔ ازبکوں اور ہزاروں میں شدید کشیدگی کے باعث طالبان کے مخالف اتحاد کو نقصان پہنچا۔ دوستم ابھی تک مالک کے حامیوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مالک کے مظالم کو افشا کر کے اس کے حامیوں کو اپنے ساتھ ملانے کا حیلہ کیا۔ دوستم کے فوجیوں نے شیر غان کے قریب دشت لیلائی میں 20 اجتماعی قبریں تلاش کیں۔ وہاں دو ہزار سے زائد طالبان کو قتل کر کے دفن کر دیا گیا تھا۔ دوستم نے اس قتل کی ذمہ داری مالک پر ڈالی۔ طالبان کو میتیں لے جانے کی پیش کش کی اور اقوام متحدہ سے تحقیقات کرنے کے لئے کہا۔ اس نے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر 200 طالبان قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اقوام متحدہ کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ قیدیوں کو قتل کرنے سے پہلے بھوکا رکھا گیا تھا اور ان پر تشدد کیا گیا تھا۔ انہیں جس طریقے سے ہلاک کیا گیا، وہ بڑا ہولناک تھا۔ قیدیوں کو یہ کہہ کر کہ ان کا تبادلہ کیا جا رہا ہے، ٹرکوں میں لاد کر کنوؤں پر لے جایا جاتا اور زندہ ہی ان میں گرا دیا جاتا، جو قیدی ذرا مزاحمت کرتے، پہلے انہیں گولی ماری جاتی اور پھر کنوئیں میں پھینک دیا جاتا۔ اوپر سے دستی بم گرا دیئے جاتے، بعد میں کنوؤں کو بند کر دیا جاتا۔ اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے پیک چونگ ہیرن نے اس کی تصدیق کی۔ بعض عینی شاہدوں نے بھی بتایا کہ نسل کشی کی لرزہ خیز کارروائی کی جاتی رہی۔ رات کے اندھیرے اور خاموشی میں طالبان قیدیوں کی آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ کر انہیں ٹرکوں میں بھر کر، صحرا میں لے جایا جاتے، پھر دس دس طالبان قیدیوں کو قطار میں کھڑا کیا جاتا، انہیں کنوؤں کی

منڈیر پر کھڑا کر کے گولی مار دی جاتی، مسلسل چھ راتوں تک یہی کچھ کیا جاتا رہا۔ مالک کا ایک وفادار جرنیل سلیم صابر پکڑا گیا اور دوستم کے سامنے لایا گیا تو اس نے طالبان قیدیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا اعتراف کیا۔ اکثر صورتوں میں قیدیوں کو ایسے کنٹینروں میں لے جایا جاتا، جن میں ہوا کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ قیدی دم گھٹنے سے بھی مر جاتے تھے، جب ان کی نعش باہر نکالی جاتی تو گرمی کے باعث ان کی کھال ادھڑ چکی ہوتی۔ اس طرح کم وبیش 1250 طالبان بند کئے گئے تھے۔

شمال میں بپا ظلم و تعدی اور خون ریز جنگ نے افغانوں کو طالبان پشتونوں اور غیر پشتونوں میں اس طرح منقسم کر دیا کہ ان کے باہم مل بیٹھنے کی کوئی امید باقی نہ رہی، ملک عملاً شمال اور جنوب میں بٹ گیا تھا۔ دونوں طرف کے مخالف نسل کے لوگوں کو ملیامیٹ کرنے کا پورا پورا جتن کیا گیا۔ مذہب کے نام پر ظلم ڈھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ طالبان نے ہزارہ شیعہ دیہاتیوں کو قتل کیا اور شومالی وادی سے تاجک کاشت کاروں کو باہر ہانک دیا۔ ازبکوں اور ہزارہ قبائیلیوں نے شمال میں کابل کے گرد سینکڑوں طالبان قیدیوں اور پشتون دیہاتیوں کو بے دردی سے مار ڈالا۔ شیعہ ہزارہ قبائیلیوں نے پشتونوں کو سنی ہونے کی بنا پر گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ مزار شریف کے قرب و جوار میں ہرات کے نواح میں اور کابل کے آس پاس ہونے والی جنگ نے لاکھوں لوگوں کو بے گھر کر دیا اور وہ جان بچانے کے لئے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب اقوام متحدہ پاکستان میں پناہ گزین افغان مہاجروں کو اپنے گھروں میں واپس جانے پر آمادہ کرنے کے لئے کوشاں تھی۔ افغانستان کے سبھی ہمسایہ ملک اپنے اپنے ہم عقیدہ افغانوں کی پیٹھ ٹھونکنے اور ان کی مدد کرنے میں مصروف تھے۔ اس سے افغانستان میں نسلی اور فرقہ وارانہ اختلافات اور زیادہ بڑھے۔

جنگ کا دائرہ پھیلنے اور اس میں شدت آنے سے عام افغانوں پر جو عذاب نازل ہوا

اور انہیں جو بے اندازہ مصائب اٹھانا پڑے وہ اپنی جگہ پر، لیکن اقوام متحدہ بھی ایک آزمائش سے دوچار ہوگئی۔ اقوام متحدہ طالبان سے کہتی کہ قیام امن اس کا نصب العین ہے، لیکن طالبان اس کی ایک نہ سنتے، وہ طالبان کے مخالفوں سے کہتی کہ وہ نسلی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے کا وسیلہ ہوگی، لیکن اس جانب بھی اس کی کوئی نہ مانتا۔ اقوام متحدہ کا نمائندہ نوبرٹ ہول بھی ہمسایہ ملکوں پر دباؤ ڈال کر انہیں اپنے ہم نسل اور ہم عقیدہ افغانوں کو مسلح کرنے سے باز رکھنے میں ناکام رہا۔ کوئی اقوام متحدہ پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہر کسی نے اسے نظر انداز کیا۔ ہول نے ہمسایہ ملکوں پر افغانستان کے معاملات میں مداخلت کرنے اور بے لچک رویہ اپنائے رکھنے کا کھلے عام الزام لگایا۔ اس کا کہنا تھا کہ مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھنا ممکن نہیں رہا، یہ تو کہنا شاید صحیح نہ ہو کہ افغان لیڈر بیرونی ملکوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہیں کہیں نہ کہیں سے اسلحہ چاہیے۔ ایک ماہ بعد ہول نے استعفیٰ دے دیا۔

طالبان قیادت اقوام متحدہ کے طریقوں سے نابلد تھی، اقوام متحدہ کا منشور سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ اس لئے نہ وہ اسے سمجھتی تھی اور نہ اس پر عمل کرنے کی نیت رکھتی تھی۔ ملا عمر نے ہول سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا، جس کا اقوام متحدہ کے سفارت کاروں نے بہت برا مانا۔ دوسرے طالبان لیڈروں نے تو جنگ بندی کے لئے اقوام متحدہ کی کوششوں کی ہنسی اڑائی۔ اقوام متحدہ کے خلاف طالبان کی ناراضی مزار شریف کے واقعات کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ سلامتی کونسل کا مزار شریف میں ہونے والے قتل عام کی مذمت کرنا اور افغانستان کو اقوام متحدہ میں نشست دینے سے انکار نے بھی طالبان کی مغائرت میں اضافہ کیا۔ اقوام متحدہ میں افغانستان کی نشست صدر برہان الدین ربانی کے پاس ہے۔ طالبان کو اقوام متحدہ کے بارے میں کئی غیر حقیقی شکوک دستیاب ہیں۔ جنہیں کسی بھی سفارتی کوشش سے دور نہیں کیا جا سکا۔ انہیں یقین ہے کہ اقوام متحدہ کا مغربی طاقتوں سے گٹھ جوڑ ہے اور وہ اسلام اور شریعت کے نفاذ کے خلاف

سازش کر رہے ہیں۔ ان کا اقوام متحدہ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ علاقے کے ملکوں کے زیر اثر ہونے کے سبب سے طالبان حکومت کو تسلیم نہیں کر رہی۔ ادھر ان ملکوں نے اقوام متحدہ کو اپنے حصے کے فنڈ دینے میں تامل کرنا شروع کیا تو افغانستان کے لئے امداد میں کمی ہونے لگی۔ افغانستان کی مسلسل خانہ جنگی اور افغان عورتوں کے بارے میں طالبان کا امتیازی سلوک بھی امداد میں رکاوٹ کا موجب ہوا۔ افغانستان میں اقوام متحدہ کی امدادی سرگرمیوں کے جاری رہنے کا انحصار اس پر ہے کہ طالبان عورتوں کے بارے میں اپنے طرز عمل میں اعتدال پیدا کریں۔ طالبان نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کئی مغربی غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) نے بھی اپنے امدادی کام روک دیئے ہیں۔ اس لئے کہ طالبان عورتوں کی مدد کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ شمالی علاقوں میں جنگ نے این جی اوز کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا، تب سے وہ واپس نہیں گئیں، تو طالبان کے انتہا پسندوں نے اقوام متحدہ کی امدادی ایجنسیوں کی سرگرمیوں میں بحران پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ انہیں طالبان کے زیر اثر علاقے سے باہر نکالا جا سکے۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ یہ ایجنسیاں مغربی ملکوں کے سیکولر خیالات لوگوں میں پھیلا رہی ہیں۔ شہر کے آخر میں قندھار میں اقوام متحدہ کی تین ایجنسیوں کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین کی ایک خاتون وکیل سے طالبان کی بدسلوکی کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ طالبان کا اصرار تھا کہ خاتون وکیل نقاب پہن کر گفتگو کرے۔ اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ نومبر میں طالبان نے اقوام متحدہ کے کمشنر برائے مہاجرین کے افغان عملے کے چار ارکان گرفتار کر لئے۔ طالبان نے عورتوں کو بارودی سرنگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے منع کر دیا، جس پر اقوام متحدہ نے اپنے متعدد امدادی پروگرام بند کر دیئے۔

موسم سرما سر پر آ گیا تھا۔ لوگوں کو غذائی قلت کا بھی سامنا تھا۔ ممکن امدادی سرگرمیاں جاری رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ 28 ستمبر 1997ء کو کابل کی اسلامی پولیس نے انسانی

امور کے یورپی کمشنر ایما بونینو اور 19 مغربی صحافیوں کو 3 گھنٹے تک حراست میں رکھا، اس پر طالبان کی بڑی مذمت ہوئی۔عورتوں سے ان کی بدسلوکی خاص طور پر ہدف تنقید بنی، وہ خواتین کا ایک ہسپتال دیکھنے آئے تھے، جسے یورپی یونین مالی امداد فراہم کر رہی تھی۔ بونیف کے ساتھ آنے والی صحافیوں سے یہ خطا ہوئی کہ وہ بیمار عورتوں کی تصویریں اتارنے لگیں، اس کے بعد طالبان نے ہر طرح کی فوٹو گرافی کی ممانعت کر دی۔ مس بنینو نے کابل میں رپورٹروں سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ ''لوگ خوف اور دہشت کی فضا میں رہنے پر مجبور ہیں''۔ طالبان نے بعد میں معذرت کی لیکن افغانستان کی امداد کرنے کا مغربی ملکوں کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ طالبان نے اعلان کیا کہ کابل کے ہسپتالوں کو مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے گا۔عورتوں کو مردوں کے ساتھ علاج کرانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کابل میں عورتوں کے لئے صرف ایک ہسپتال رکھا گیا۔

کلنٹن انتظامیہ کے لئے طالبان سے اپنی ابتدائی ہمدردی کو جاری رکھنا مشکل ہونے لگا تھا۔ امریکہ کی خواتین کے طاقتور گروپوں نے امریکی حکومت کو افغان عورتوں کے مسائل سمجھنے کے لئے مناسب رویہ اپنانے کے لئے کہنا شروع کیا۔ نومبر میں امریکہ کی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے طالبان پر سخت تنقید کی۔ امریکہ نے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ البرائیٹ نے 18 نومبر 1997ء کو اسلام آباد میں کہا کہ ''ہم طالبان کے اس لئے خلاف ہیں کیونکہ وہ انسانی حقوق کے خلاف ہیں۔ عورتوں اور بچوں سے برا سلوک کرتے ہیں۔ انسانی وقار کے لیے ان کے دل میں کوئی لحاظ یا پاس نہیں۔ البرائیٹ کے بیان کو طالبان اور پاکستان سے امریکہ کا فاصلہ بڑھنے کا اشارہ سمجھا گیا۔ لیکن طالبان پر بین الاقوامی دباؤ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مغربی ملکوں کے خلاف ان کے جذبات میں مزید شدت آ گئی۔ پاکستان اور قندھار کے علماء نے ملا عمر سے کہا کہ تمام امدادی ایجنسیاں افغانستان سے باہر پھینک دی جائیں، کیونکہ یہ جاسوس ہیں اور اسلام کی دشمن ہیں۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے اقوام متحدہ کی ثالثی کی کوششوں کو تقویت پہنچانے کے لئے سابق الجزائری وزیر خارجہ لخذار براہیمی سے کہا کہ وہ 14 اگست اور 23 ستمبر کے درمیانی عرصے میں افغانستان سمیت علاقے کے 13 ملکوں کا دورہ کریں اور سیکرٹری جنرل کو اپنی رپورٹ پیش کریں۔ براہیمی جو نتائج اخذ کرتے، انہیں علاقے کے ملکوں پر دباؤ ڈالنے اور انہیں افغانستان کی مدد سے ہاتھ روک لینے کا وسیلہ بنایا جاتا۔ اکتوبر میں کوفی عنان نے متاثرہ ملکوں کا ایک گروپ قائم کیا، جس میں افغانستان کے چھ ہمسایہ ملکوں کے علاوہ امریکہ اور روس شامل ہیں۔ اس رعایت سے اس گروپ کو چھ اور دو کا نام دیا گیا۔ براہیمی کا خیال تھا کہ اس گروپ کی کوششوں سے ایران کو پاکستان سے مذاکرات کرنے اور امریکہ کو امن کی تلاش میں سنجیدہ رویہ اپنانے پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ دوسرا مقصد افغانستان کے لئے اسلحے کی فراہمی روکنا اور افغان متحارب گروپوں کو آپس میں بات چیت پر آمادہ کرنا تھا۔

کوفی عنان نے ان اقدامات کے بعد وسط نومبر میں سلامتی کونسل میں افغانستان کے بارے میں ایک تند و تیز رپورٹ پیش کی، جس میں انہوں نے پہلی مرتبہ غیر مصالحانہ سخت اور تلخ زبان استعمال کرتے ہوئے علاقائی ملکوں خاص طور پر ایران اور پاکستان پر افغان اختلافات بڑھانے کا الزام عائد کیا اور کہا کہ یہ ممالک اقوام متحدہ کی پروا کئے بغیر متحارب افغان دھڑوں کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں۔ غیر ملکی فوجی ساز و سامان کی فراہمی اور مالی حمایت تصادم کے ضمن میں جلتی پر تیل کا کام کر رہی ہے اور مصروف جنگ دھڑوں میں قیام امن کی سچی خواہش ہی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اس امداد کے باعث سفارتی کوششوں کو یکسر غیر متعلق اور بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے۔ عنان نے جنگی سرداروں کو بھی نہیں بخشا اور کہا کہ افغان لیڈروں نے اپنے گروہی مفادات سے اوپر اٹھنے اور قومی مصالحت کے لئے باہم مل کر کام شروع کرنے سے انکار کر رکھا ہے۔ افغانستان میں کئی ایک گروہوں، جنگی سرداروں، دہشت گردوں، منشیات کا کاروبار کرنے والوں اور

دوسرے لوگوں کا جنگ میں فائدہ اور امن میں نقصان ہے۔ بعد میں عنان نے ایران میں اسلامی کانفرنس تنظیم (او آئی سی) کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے افغان مسئلے کے حل کے لئے کوشش نہ کرنے پر تنظیم کے ارکان کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ برسوں سے نظر انداز ہونے کے بعد افغانستان پھر بین الاقوامی سفارتی ایجنڈے پر ایک مستقل حیثیت اختیار کر گیا ہے لیکن یہ طالبان کے لئے تشفی کا موجب نہیں، وہ شمالی علاقے کو فتح کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں، مخالفین نے بھی ان کی مزاحمت کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔

MashalBooks.org

بامیان 1998-99

کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ

وسطی افغانستان میں ہزارہ قبیلے کے علاقے ہزارہ جات میں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی کم تھا۔ کوہ ہندوکش کی چوٹیاں برف پوش تھیں۔ پہاڑی سلسلے کے بیچوں بیچ بامیان واقع ہے۔ یہاں لڑکے بالے، جن کے پیٹ پھولے ہوئے اور باقی کے اعضا کمزور تھے۔ ڈاکو سپاہی کا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے، انہوں نے اس کھیل کو ''طالبان'''' کا نام دے رکھا ہے۔ ہزارے بھوکے تھے، وہ گندم لے جانے والے قافلے پر گھات لگا کر پل پڑتے اور اپنے بھوکے بال بچوں کے لئے گندم لے آتے، بچوں کی گزر درختوں کی جڑیں، بیر، یا آلوؤں پر ہوتی تھی۔ آلو چھوٹے چھوتے پتھریلے کھیتوں میں اگا لئے جاتے۔ یہ کھیت پہاڑیوں کی ڈھلوانوں کو کاٹ اور کھود کر بنائے گئے ہیں۔ ہزارہ جات کا صرف 10 فیصد رقبہ قابل کاشت ہے۔ اس سال گندم اور باجرے کی فیصل ناکام ہوگئی تھی۔ اگست 1997ء سے طالبان نے جنوب مغرب اور مشرق کی طرف کے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔ ہزارہ کے لوگوں تک کوئی چیز نہیں پہنچ رہی تھی، شمال کی طرف سے کسی قسم کی امداد ملنا محال تھا۔ سرما کی برفباری نے بامیان تک خوراک کی رسد میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ شمالی علاقے میں امن و قانون کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ خوراک کی کمی ہوگئی تھی۔ پہاڑی درے، برف سے ڈھک گئے تھے، بامیان تک جو 7500 فٹ کی بلندی پر ہے، کھانے پینے کی اشیاء پہنچانے کا کوئی

ذریعہ نہیں تھا۔صوبہ بامیان کے تین لاکھ باشندے بھوکے تھے۔تین ہمسایہ صوبے اغور، وردک اور غزنی بھی غذائی کمی کا شکار تھے۔کل دس لاکھ افراد اس صورت حال سے دوچار تھے۔ اقوام متحدہ اور عالمی فوڈ پروگرام نے طالبان سے امدادی قافلے گزرنے کی اجازت دینے کے لئے گفت وشنید کی، لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ طالبان مسلسل انکار کرتے رہے۔اقوام متحدہ کے لئے یہ بات بڑی مایوس کن تھی کہ پاکستان نے طالبان کو ساٹھ ہزار ٹن گندم مہیا کرنے کا سودا کر لیا، لیکن طالبان سے انسانی بنیادوں پر یہ تک نہیں کیا کہ وہ بامیان کے گرد رکاوٹیں ختم کر دیں اور وہاں خوراک پہنچنے دیں۔گزشتہ 20 برس میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک فریق نے دوسرے کے خلاف جنگ میں خوراک کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، اس سے نسلی اور فرقہ وارانہ تقسیم اور اختلاف کے بڑھتے جانے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔دراصل یہ تقسیم اور اختلاف افغانستان کو کھائے چلا جا رہا ہے۔ ہزارہ قبائیل یوں تو پشتونوں کے مقابلے میں ہمیشہ ہی محرومی کا شکار رہے ہیں، لیکن اتنے کبھی نہیں تھے، جتنے اب ہیں۔ یہ چھوٹے قد کے فربہی مائل، منگولوں کی وضع قطع کے لوگ ہیں، ایک نظریے کے مطابق یہ چنگیز خان کے سپاہیوں اور مقامی تاجک اور ترک لوگوں کے درمیان ہونے والی شادیوں کا حاصل ہیں۔ 1222ء میں چنگیز خان کا پوتا، بامیان کا دفاع کرنے والوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اس نے انتقام لینے کی غرض سے یہاں کے لوگوں کا قتل عام کیا، ایک ہزار برس پہلے بامیان ہندوستان میں بدھ مت کا مرکز تھا۔ قدیم شاہراہ ریشم پر جو رومیوں کی سلطنت وسط ایشیا، چین اور ہندوستان کو ملاتی تھی۔ اونٹوں کے قافلوں کا پڑاؤ بھی تھا۔ اسلامی فتوحات کے بعد بھی بامیان پورے وسطی ایشیا اور ہندوستان کے لئے بدھ مت کا مرکز رہا۔ایک کوریائی بودھی نے جو 827ء میں بامیان آیا تھا، لکھا کہ یہاں کا بادشاہ ابھی تک بدھ مت کا پیرو ہے۔ کہیں گیارہویں صدی میں غزنوی اس وادی میں اسلام لائے۔

شہر میں دوسری صدی عیسوی مہاتما بدھ کے دو شاندار مجسمے ہیں، ان میں سے ایک

165 فٹ اور دوسرا 114 فٹ اونچا ہے۔ دونوں ایک پہاڑی کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، موسمی حالات اور طبعی تغیرات کے باعث دونوں کے چہرے مسخ ہو چکے ہیں، تاہم باقی کے حصے صحیح وسالم ہیں اور دیکھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ بدھ کے یہ بت برصغیر میں پائے جانے والے بتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کی ساخت اور تخلیق میں ایک جیسا کلاسیک انداز نمایاں ہے۔ البتہ لباس یونانی ہے۔ دراصل یہ ہندوستانی اور وسط ایشیائی آرٹ کا نمونہ ہیں۔ یہ یونانی رنگ سکندر اعظم کے ساتھ آنے والے لائے۔ بدھ کے بت قدیم زمانے کے عجائبات میں شامل ہیں۔ جاپان اور ہندوستان سے بدھ مت کے پیرو انہیں دیکھنے دور دور سے آتے ہیں۔ ہزاروں ودھ راہب ان بتوں کے گرد غاروں میں رہتے تھے۔ یہ غار جو نقش و نگار سے مرصع ہیں۔ اب کابل سے فرار ہو کر آنے والے ہزارہ مہاجروں کے لئے رہائش گاہ کا کام دے رہے ہیں۔ طالبان آئے تو انہوں نے بت اور دوسرے نقوش مٹا ڈالنے کا عندیہ ظاہر کیا، جس پر جاپان سے لے کر سری لنکا تک کے بودھوں نے سخت احتجاج کیا۔ پہاڑیوں پر بمباری ہونے سے بدھ کے بتوں اور دوسرے آثار کو شدید نقصان پہنچا۔

ہزارہ جات 1893ء سے آزاد چلے آتے تھے۔ پشتون فرمانروا عبدالرحمٰن نے یہ علاقہ فتح کیا تو اس نے ہزارہ قبائیل کو مٹا ڈالنے کا بیڑہ اٹھایا اور ہزاروں، ہزارے مارے گئے۔ ہزاروں کابل کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ جہاں وہ غلامی کی زندگی بسر کرنے اور مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگے۔ 3 سے 4 ملین ہزارہ، افغانستان میں سب سے بڑا شیعہ گروپ ہے۔ سنی پشتونوں اور شیعہ ہزاروں میں یوں تو دشمنی بہت پرانی تھی لیکن طالبان نے اس میں تیزی کا عنصر پیدا کر دیا۔ طالبان شیعوں کو منافق اور خود سر سمجھتے ہیں اور انہیں دائرہ اسلام سے خارج کہتے ہیں۔ طالبان کے لئے ایک اور تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ہزارہ عورتیں بہت اہم سیاسی، سماجی اور علاقے کے دفاع میں فوجی کردار ادا کر

MashalBooks.org

رہی تھیں۔ ہزاروں کی حزب وحدت کی 80 رکنی مرکزی کونسل میں 12 عورتیں شامل تھیں، ان میں سے بہت سی تعلیم یافتہ اور مختلف پیشوں سے وابستہ تھیں، وہ اقوام متحدہ کے امدادی پروگراموں اور بنیادی تعلیم، صحت اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق حزب کے کاموں کی نگرانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ وہ اپنے مردوں کے شانہ بشانہ جنگ میں بھی حصہ لیتی رہی ہیں۔ جب طالبان نے مزار شریف پر حملہ کیا تو عورتیں بھی شہر کے دفاع میں پیش پیش تھیں۔ ان کے ہاتھوں کئی طالبان قتل اور زخمی ہوئے۔ کابل سے فرار ہو کر آنے والی خواتین پروفیسروں نے بامیان میں ایک یونیورسٹی قائم کر لی، یہ دنیا کی شاید سب سے بے وسیلہ اور غریب یونیورسٹی تھی۔ یہ مٹی اور گارے سے بنائی گئی تھی۔ اس میں بجلی یا کمروں کو گرم کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ڈاکٹر حمیرہ راہی یونیورسٹی میں فارسی ادبیات پڑھاتی ہیں اور جو مزاحمتی تحریک کی ایک اہم شاعرہ کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم طالبان کے اس لئے خلاف ہیں کہ وہ ہر نوع کی تہذیب، افغان ثقافت اور خاص طور پر عورتوں کے خلاف ہیں۔ طالبان ہزارہ عورتوں کے ملبوسات اور ان کے پہناوے کے طرز کو ناپسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حمیرہ راہی اور ان کے ساتھ درس و تدریس میں حصہ لینے والی خواتین سکرٹ اور اونچی ایڑھی کے جوتے پہنتی ہیں۔ حمیرہ راہی کی شاعری ہزارہ لوگوں کے اس جرئات اور خودشناسی کی آئینہ دار ہے جو انہیں پشتونوں کے ہاتھوں صدیوں تک جبر سہتے رہنے کے بعد ملی ہے۔ حمیرہ راہی نے اپنے اشعار میں کہا ہے۔ ''ہزارہ جات کے کامران سپاہ فتح تمہاری ہے اور خدا تمہارے ساتھ ہے، دشمن کے سینے تمہاری رائفلوں کی نالیوں کی زد میں ہیں۔ تم کامیاب و کامران اور فتح یاب ہو۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ میری نصف شب کی عبادت اور صبح دم کی التجا ہے یا خدا، یا خدا کچلے ہوئے اور دبے ہوئے انسانوں کے آنسو اور آہیں سب تمہارے لئے ہیں''۔

کابل کے طالبان حکمرانوں کے تسلط، بدسلوکی اور تعصب کے باوجود ہزارہ اب جاگنے

اور آگے بڑھنے لگے ہیں۔ مئی میں انہوں نے مزار شریف پر حملہ کرنے والے طالبان کو شکست دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اکتوبر 1997ء میں دوبارہ انہوں نے طالبان کا مقابلہ کیا۔ بامیان پر طالبان کے ایک کے بعد دوسرا حملہ ناکام بنانے میں بھی ہزارے ہی کام آئے۔ طالبان کی مزاحمت کرنے کے لئے جو ازبک، تاجک اور ہزارہ محاذ بنایا گیا، اس میں ہزاروں کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن صورت حال مختلف تھی۔ ازبک آپس میں بٹ گئے تھے اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ تاجک، کابل کے گرد بے ہمتی اور بے دست و پائی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ہزاروں نے محسوس کیا کہ ان کے آگے بڑھنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہماری پشت ہندوکش کی طرف ہے اور ہمارے سامنے طالبان اور ان کا مددگار پاکستان ہے، ہم مر جائیں گے لیکن ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ وحدت کے ڈپٹی چیف قربان علی عرفانی مجھ سے ہم کلام تھے۔ ہم ایک کمرے میں بیٹھے تھے، جسے گرم کرنے کے لئے لکڑیاں جلائی گئی تھیں، کھڑکی سے بدھ کے بت، چاندنی میں نہائے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں اپنی تنظیم پر فخر اور اپنی جنگجوئی کے ضمن میں نیا اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ ایک چودہ سالہ ہزارہ سپاہی احمد شیر بولا، ''ہم نے شمال کو طالبان سے بچایا ہے۔ احمد شیر دو برس سے جنگ میں حصہ لیتا آ رہا ہے۔ اس نے پیشہ ور سپاہی کی طرح کلاشنکوف پکڑی ہوئی تھی۔ ہزارہ بے یار و مددگار نہیں تھے۔ بامیان کے باہر نوتعمیر دو میل لمبی پٹی پر ایرانی طیارے جنگی ساز و سامان لے کر اڑتے رہتے تھے۔ وحدت کے لیڈر کریم خلیلی مزید فوجی امداد کے لئے سرما کے دوران تہران، ماسکو، نئی دہلی اور انقرہ آتے جاتے رہے۔

ہزاروں نے غلطیاں بھی کیں، انہوں نے اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی پھیلا لیا، ان میں کئی گروہ تھے، جو علاقے اثر و رسوخ اور بیرونی امداد کے لئے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہے، حزب وحدت کے مختلف فریقوں میں سے ایک نے مزار شریف کے ایک حصے پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ ازبکوں کی طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ مزار شریف

کو میدان جنگ بنا دیا گیا تھا اور طالبان کے خلاف جو اتحاد قائم کیا گیا تھا، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ ایرانی اور روسی انٹیلی جینس کے افسروں نے دوستم اور ہزاروں کے مختلف فریقوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کی بڑی کوشش کی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ کوئی دھڑہ بھی اپنی روش بدلنے پر آمادہ نہ تھا۔ فروری 1998ء میں جب مزار شریف میں ازبکوں اور ہزاروں کے درمیان شدید لڑائی چھڑ گئی تو احمد شاہ مسعود پہلی مرتبہ تہران گیا۔ اس نے ایرانیوں پر زور دیا کہ قبل اس کے وقت ہاتھ سے نکل جائے، وہ طالبان مخالف اتحاد کو بچانے کے لئے اگر کچھ کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔ طالبان سرما میں اپنے دشمنوں کو آپس میں دست و گریباں ہوتے اور ایک دوسرے کا خون بہاتے دیکھتے رہے، ساتھ ہی بامیان کے گرد محاصرہ مضبوط بنانے اور مزار شریف پر دوسرا حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف رہے۔

سردیوں کے مہینوں میں مغربی صوبے فریاب میں لڑائی جاری رہی۔ طالبان نے جنوری میں تقریباً 600 ازبک دیہاتیوں کو قتل کر دیا۔ مغربی ملکوں کے امدادی کارکنوں نے بعد میں اس سانحے کی جو تحقیقات کی اس کے مطابق لوگوں کو ان کے گھروں سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور قطاروں میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ طالبان نے کابل میں اسلامی قوانین کے نفاذ اور سزائیں دینے کا جو سلسلہ شروع کیا، بین الاقوامی سطح پر اس کی بڑی مذمت ہوئی۔ اعضاء کاٹ ڈالنا، کوڑے مارنا، عورتوں کو سنگسار کرنا، کابل اور قندھار میں معمول بن گیا تھا۔ 8 فروری 1998ء کو عورتوں کا جو عالمی دن منایا گیا، اسے افغان عورتوں کی کسمپرسی سے منسوب کیا گیا۔ امریکی سینٹ میں افغان عورتوں کا مسئلہ اٹھایا گیا تو ایک بار پھر اس کی بڑی تشہیر ہوئی۔ ہنیری کلنٹن اور دوسری سربرآوردہ خواتین نے طالبان کے طرز عمل کی مذمت کی۔

طالبان نے داڑھیوں کی صحیح لمبائی مقرر کر دی، نومولود بچوں کے لئے اسلامی نام تجویز کر دیئے۔ طالبان نے کابل میں گھروں میں کھولے گئے بچیوں کے سکول بند کر دیئے۔

عورتوں کو گلی کوچوں میں نکلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ کھڑکیوں کو کالا کرنے کا حکم دیا گیا تا کہ باہر سے عورتیں نظر نہ آ سکیں۔ عورتیں پورا وقت گھروں میں بند رہتیں۔ انتہا پسند طالبان اقوام متحدہ کی امدادی ایجنسیوں کو افغانستان سے نکال دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ اشتعال انگیزی کی، جو اقوام متحدہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ قندھار میں طالبان لیڈروں نے اقوام متحدہ کے عملے کے ارکان کو مارا پیٹا اور دھمکیاں دیں، جس کے بعد 24 فروری 1998ء کو کو سارا عملہ قندھار سے نکال لیا گیا اور امدادی سرگرمیاں معطل کر دی گئیں۔ قندھار کے گورنر ملا محمد حسن نے جن کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے اور جو بالعموم نرم خو سمجھتے جاتے ہیں، ایک بار اقوام متحدہ کے ایک افسر کے سر پر کرسی اور میز دے ماری اور اس کا گلا گھونٹنا چاہا۔ قصور اس کا یہ تھا کہ اس نے موصوف کے گاؤں تک سڑک بچھانے سے انکار کر دیا تھا۔ مارچ میں طالبان نے اقوام متحدہ کے انسانی امداد کی کارروائیوں کے ناظم الفریڈ و وٹسچی سسٹاری کو مذاکرات کے لئے کابل جانے کی اجازت نہ دی۔

اقوام متحدہ کو ہزارہ جات کا محاصرہ ختم کرنے سے طالبان کے انکار پر بھی سخت مایوسی ہوئی۔ لخذار براہیمی نے مجھے بتایا کہ شمال میں ہمیں امدادی کارروائیوں کے سلسلے میں مکمل عدم تحفظ کا سامنا ہے اور جنوب میں طالبان کے ساتھ کام کرنا سخت دشوار اور اذیت ناک ہے۔ شمال میں کوئی انتظامیہ نہیں، جس کے جی میں جو کچھ آئے کر گزرتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، جنوب کا معاملہ اس کے سراسر برعکس ہے، یہاں انتظامیہ بے حد سخت گیر ہے۔ ان مشکلات کے باوجود براہیمی نے طالبان اور طالبان مخالف اتحاد کے درمیان ملاقات کرانے کی کوشش کی۔ طالبان نے اس ملاقات سے بچنے کے لئے کہ اس طرح طالبان مخالف اتحاد کو باقی رہنے کا جواز مل سکتا تھا۔ تجویز کیا کہ دونوں طرف کہ علماء کی ملاقات کرا دی جائے۔ کئی مہینوں تک اس بات پر جھگڑا ہوتا رہا کہ کون علماء کے ذیل میں آتا ہے اور کون عالم کہلانے کے مستحق ہیں۔ اقوام متحدہ نے امریکہ

سے مدد چاہی۔ خارجہ امور میں درپیش مشکلات پر قابو پانے کے ماہر امریکی صدر کے مشیر اور اقوام متحدہ میں امریکہ کے سفیر بلی ریسرڈسن 17 اپریل 1998ء کو ایک دن کے لئے کابل گئے اور دونوں فریقوں سے علماء کا اجلاس بلانے کے لئے کہا۔

دونوں فریق امریکہ کو خوش کرنے کی کوشش میں تھے۔ رجرڈسن کو مسرت تھی کہ اس کا پرتپاک خیر مقدم ہوا، اسے قالینوں، پگڑیوں اور دوسرے تحائف سے لاد دیا گیا۔ کابل میں طالبان نے رچرڈسن کے ساتھ آنے والے ٹی وی کے کیمرامینوں کو پہلی بار اپنے رہنماؤں کی فلم بنانے اور تصویریں اتارنے کی اجازت دی۔ رچرڈسن کی لحاظ داری میں انہوں نے جمعہ کے روز برسر عام کوڑے مارنے اور اعضا کاٹنے کی سزا ملتوی کر دی۔ عام طور پر ہر جمعہ کو یہ سزائیں دینا کا معمول تھا۔ اگرچہ کابل میں طالبان کے لیڈروں نے دعویٰ کیا کہ ہزارہ جات کا محاصرہ نرم کر دیا جائے گا اور اقوام متحدہ سے عورتوں کے بارے میں طالبان کی پالیسی پر بات چیت ہوگی، لیکن رچرڈسن کے جانے کے بعد چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ ملا عمر نے معاہدہ ختم کر دیا۔ اپریل کے اواخر میں علماء کا اجلاس اسلام آباد میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ چار دن کے مذاکرات کے بعد دونوں فریقوں نے امن کمیشن کے لئے ،20 20 علماء کے نام تجویز کئے۔ کمیشن کو جن مسائل پر غور کرنا تھا، ان میں جنگ بندی، ہزارہ جات سے طالبان کا محاصرہ ختم کرنے کی تدبیر کرنا اور قیدیوں کا تبادلہ شامل تھا۔ طالبان نے اپنی طرف کے علماء نامزد کرنے سے انکار کر دیا اور مئی تک امن کے لئے کی جانے والی کوششیں پھر سے ناکام ہوگئیں۔

طالبان نے سب کچھ بھول بھلا کر نئے حملے کی تیاری شروع کر دی، اس تیاری کا ایک حصہ اقوام متحدہ سے تازہ کشیدگی بڑھانا تھا۔ جون میں طالبان نے عورتوں کو جنرل ہسپتالوں میں جانے سے روک دیا اور اقوام متحدہ کے عملے میں شامل تمام مسلمان خواتین کو حکم دیا کہ وہ افغانستان میں محرم یا خونی رشتہ داری کے ساتھ ہی سفر کر سکتی ہیں۔ یہ مطالبہ پورا کرنا ممکن نہیں تھا۔ خاص طور پر اس لئے کہ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں نے اپنے

عملے میں مسلمان خواتین کی تعداد اس لئے بڑھائی تھی کہ طالبان کے اطمینان کی صورت پیدا ہو سکے اور دوسرے افغان عورتوں تک رسائی میں کوئی اڑچن نہ رہے۔ طالبان نے اب یہ اصرار شروع کیا کہ کابل میں موجود این جی اوز اپنے دفاتر خالی کر دیں اور پولی ٹیکنیک کالج کی تباہ شدہ عمارت میں منتقل ہو جائیں۔ 30 این جی اوز نے فیصلہ کیا کہ اگر طالبان اپنا مطالبہ واپس نہیں لیتے تو وہ کابل سے ہی نکل جائیں گے۔ طالبان نے صاف کہہ دیا کہ اس مسئلے پر بات نہیں ہو سکتی، جو کچھ کہہ دیا گیا ہے اس پر عمل ہونا چاہیے۔ یورپی یونین نے طالبان کے کنٹرول کے علاقوں میں ہر طرح کی انسانی امداد معطل کر دی۔

اسی دوران براہیمی نے اقوام متحدہ کی مایوسی کا برملا اظہار کر کے ایک اور دھماکہ کر دیا۔ براہیمی نے کہا کہ طالبان کو یہ جان لینا چاہیے کہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ پھر ہم پر عطیات دینے والوں کا بھی شدید دباؤ ہے، وہ طالبان کا ہر مطالبہ ماننے کے حق میں نہیں۔ طالبان اپنی ضد پر اڑے رہے۔ انہوں نے 20 جولائی 1998ء کو تمام این جی اوز کے دفاتر جبراً بند کر دیئے، جس کے بعد کابل سے غیر ملکی امدادی کارکنوں کا انخلا شروع ہو گیا۔ اسی روز اقوام متحدہ کی امدادی ایجنسیوں کے لئے کام کرنے والے دو افغانوں محمد حبیبی اور محمد بشر یاد کی لاشیں جلال آباد سے ملیں۔ دونوں کو اغوا کیا گیا تھا۔ طالبان نے ان کی ہلاکت کے بارے میں کوئی وضاحت نہ کی۔ کابل کی بارہ لاکھ آبادی میں سے نصف کسی نہ کسی صورت میں این جی اوز سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ امداد ملنی بند ہوئی تو سب سے زیادہ عورتیں اور بچے متاثر ہوئے۔ خوراک کی تقسیم طبی امداد، آب رسانی کے نظام پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ لوگ پاس سے گزرتی جیپوں میں بیٹھے طالبان کو دیکھ کر خالی بوتلیں اور خالی ڈبے اونچے کر کے دکھاتے، لیکن طالبان کوئی دھیان نہ دیتے، بے توجہی سے گزر جاتے۔ وزیر منصوبہ بندی قاری دین محمد کا کہنا تھا کہ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، وہ ہر کسی کو روزی دیتا

ہے۔ این جی اوز اگر گئی ہیں تو یہ ان کا اپنا فیصلہ ہے۔ ہم نے انہیں کچھ نہیں کہا۔

دریں اثنا طالبان نے پاکستان اور سعودی عرب سے کہا کہ وہ شمال پر قبضے کے لئے ان کے دوسرے حملے میں مدد دیں۔ سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ شہزادہ ترکی الفیصل وسط جون میں قندھار گئے، جس کے بعد سعودی عرب نے طالبان کو 400 پک اپ ٹرک اور مالی امداد دی۔ پاکستان کی آئی ایس آئی نے طالبان کے لئے نقل وحمل کے وسائل کی فراہمی کی غرض سے دوسوارب روپے کا بجٹ بنایا۔ حملے کی تیاری میں مدد دینے کے لئے آئی ایس آئی کے افسر اکثر قندھار جاتے رہتے۔ پاکستان میں افغان مہاجر کیمپوں اور مدرسوں سے ہزاروں طلباء طالبان میں شمولیت کے لے جانے لگے۔ مارچ میں روس، ایران اور ازبکستان نے طالبان مخالف محاذ کو ہتھیار، گولہ بارود اور ایندھن کی فراہمی شروع کر دی۔ ایران ہزارہ قبائل کو براہ راست طیارے بھر بھر کر ہتھیار بھیجنے لگا۔ یہ طیارے مشہد سے اڑتے اور بامیان جا پہنچتے۔ روس اور ایران نے احمد شاہ مسعود کو اسلحے کی فراہمی کا اہتمام، تاجکستان میں کلیاب کے ہوائی اڈے کے راستے کیا۔ یہاں سے تمام اسلحہ افغانستان پہنچایا جاتا۔

جولائی میں طالبان نے ہرات سے شمال کی طرف پیش قدمی شروع کی اور دوستم کی فوج کو کچلتے ہوئے 12 جولائی 1998ء کو مائی مانا پر قبضہ کر لیا۔ یہاں ایک سو ٹینک اور ٹرک ان کے قبضے میں آئے۔ 800 ازبک سپاہی گرفتار کئے گئے، جن میں سے اکثر کو قتل کر دیا گیا۔ یکم اگست 1998ء کو طالبان نے شبرغان میں دوستم کے ہیڈکوارٹر پر بھی قبضہ کر لیا۔ دوستم کے کئی کمانڈروں نے طالبان سے رشوت لے کر اپنی وفاداری بدل لی۔ دوستم فرار ہو کر ازبکستان چلا گیا اور وہاں سے ترکی کی راہ لی۔ دوستم کے فرار ہونے سے شکستہ دل ازبک کمانڈروں نے جونزار کو جانے والی مغربی شاہراہ کی حفاظت پر مامور تھے، طالبان سے رشوت قبول کر لی اور 1500 سپاہیوں پر مشتمل ہزارہ فوج کو طالبان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ طالبان کا حملہ 8 جولائی 1998ء کو ہوا۔ ہزارہ فوجیوں نے

اپنے آپ کو اچانک چاروں طرف سے گھرا ہوا پایا، جب تک ان کا گولہ بارود ختم نہیں ہو گیا، وہ لڑتے رہے۔ صرف 100 ہزارہ فوجی زندہ بچے۔ صبح 10 بجے طالبان کی پہلی پک اپ گاڑیاں مزار شریف میں داخل ہوئیں۔ اس وقت شہریوں کو حالات کے بدل جانے کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ روزمرہ کے کام کاج میں مصروف تھے کہ نئی آزمائش سے دوچار ہو گئے۔

طالبان کو گزشتہ برس جو نقصان اٹھانا پڑا تھا اس کا بدلہ لینے کے لئے انہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ ایک طالبان کمانڈر نے بعد میں بتایا کہ ملا عمر نے انہیں دو گھنٹے تک قتل کرنے کی اجازت دی تھی لیکن وہ دو دن تک لوگوں کو قتل کرتے رہے۔ طالبان اپنی پک اپ گاڑیوں میں گلی کوچوں میں ادھر سے ادھر پھرتے اور شہریوں پر گولیاں برساتے رہے۔ دکاندار، ریڑھی بان، عورتیں، بچے، گاہک، حتیٰ کہ بھیڑ بکریاں اور گدھے تک ان کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے۔ یہ متحرک چیز ان کا ہدف تھی۔ گلیوں میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور خون نے ہر شے کو ڈھانپ دیا تھا۔ اسلام میں میتوں کو بلا تاخیر دفن کرنے کا حکم ہے لیکن مزار شریف میں لاشوں کو گلنے سڑنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ طالبان لوگوں کو پہلے سے خبردار کرنے کی تکلیف بھی نہیں کرتے تھے۔ بلا امتیاز مرد، عورت، بچہ، جو بھی گلی میں نکلتا گولی کا نشانہ بن جاتا۔ 3 دن تک کسی کو لاشوں کو اٹھانے اور دفن کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کتے لاشوں کو کھاتے، بدبو اتنی تھی کہ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ ترک پناہ کے لئے گھروں کی طرف بھاگے لیکن طالبان نے ان کا پیچھا کیا اور ہزارہ لوگوں کے گھروں کے گھر مقتل بنا دیئے۔ ایک عینی شاہد نے جو بچ گیا تھا بتایا کہ طالبان ہر شخص کو تین گولیاں مارتے، ایک سر میں، ایک چھاتی میں اور ایک خصیوں میں۔ جو مرنے سے بچ گئے انہوں نے اپنے عزیزوں کی نعشیں اپنے باغوں میں دفن کر دیں۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ایک بیوہ نے بتایا کہ طالبان ہمارے گھر میں داخل ہوئے، انہوں نے پہلے میرے خاوند کو اور دو بھائیوں کو تین تین بار گولی ماری

اور اس کے بعد ان کے گلے اس طرح کاٹے جیسے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔

پہلے دن کے بلا امتیاز قتل و غارت کے بعد طالبان نے ہزارہ لوگوں کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ طالبان نے پہلے کی طرح غلطی نہیں کی بلکہ اس بار حکمت یار کے طرفدار مقامی پشتونوں کو اپنا گائیڈ بنایا، وہ شہر کے گلی کوچوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگلے چند روز تک انہوں نے طالبان کو ہزارہ لوگوں کے گھروں کے بارے میں بتایا۔ لیکن طالبان بے قابو ہو کر کھل کھیلنے لگے۔ انہوں نے ہزارہ اور غیر ہزارہ میں امتیاز کرنا چھوڑ دیا۔ جو سامنے آیا انہوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ انہوں نے ایک تاجک نوجوان کو مار ڈالا۔ اس کا باپ واویلا کرتا رہا کہ ہم تو تاجک ہیں، ہمیں کیوں مار رہے ہو۔ طالبان نے کہا کہ تم پہلے بتاتے، دل گرفتہ باپ نے کہا کہ تم مارنے سے پہلے پوچھتے تو ہم بتاتے۔

ہزاروں، ہزارہ افراد کو جیل میں لے جایا گیا۔ جب وہاں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ رہی تو انہیں ٹینکوں میں بھرنا شروع کر دیا، جہاں وہ دم گھٹ کر مرنے لگے۔ کچھ کنٹینر صحرا میں لے جائے جاتے اور ان میں لائے جانے والے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا۔ 1997ء میں یہی سلوک طالبان سے بھی ہوا تھا۔ اب اس کا بدلہ لینے کا موقعہ ملا تو انہوں نے پوری بے رحمی سے اپنے مخالفوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں سے صرف تین افراد زندہ برآمد ہوئے۔ باقی سب دم گھٹ کر مر گئے تھے۔ تینوں کو جیل لے جایا گیا۔ عینی شاہد نے بتایا کہ میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھا یہ سانحہ دیکھ رہا تھا۔ لاکھوں شہری آئندہ چند روز تک شہر سے نکل کر محفوظ جگہوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ طالبان ان پر فضا سے گولیاں برساتے رہے۔ جس سے درجنوں افراد ہلاک ہو گئے۔

طالبان کمانڈر ملا نیازی جس نے نجیب اللہ کے قتل کا حکم دیا تھا، مزار شریف کا گورنر مقرر کیا گیا۔ منصب سنبھالنے کے چند گھنٹے بعد ہی طالبان ملاؤں نے اعلان کرنا شروع کر دیا کہ شیعہ یا تو سنی مسلک اختیار کر لیں یا ایران چلے جائیں یا موت قبول کر لیں۔ شیعوں کے مساجد میں عبادت کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ نیازی نے مزار شریف کی

وسطی مسجد میں شیعوں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گزشتہ برس تم نے ہم سے بغاوت کی تھی، ہمیں قتل کیا، گھروں سے ہم پر گولیاں برساتے رہے، اب ہم بدلہ چکانے آ گئے ہیں۔ اگر تم اوپر گئے تو تمہیں پیروں سے پکڑ کر نیچے کھینچ لائیں گے، اگر تم نیچے چھپے تو بالوں سے پکڑ کر تمہیں اوپر لے آئیں گے۔ جیسا کہ رومن مورخ ٹیٹس نے لکھا ہے کہ جب رومنوں نے برطانیہ فتح کیا تو رومن فوج نے وسیع پیانے پر قتل کیا اور بستیاں اجاڑ دیں تو اسے قیام امن سے منسوب کیا۔ کوئی غیر جانبدار مبصر موجود نہ تھا جو مزار شریف میں ہلاک ہونے والوں کو گنتا۔ بعد میں اقوام متحدہ کے ایک ادارے نے اندازہ لگایا کہ پانچ سے چھ ہزار شہری قتل کئے گئے۔ طالبان کی پیش قدمی کے دوران راستے میں ازبکوں اور تاجکوں کا قتل جاری رہا۔ کچھ یہی حال مائی مانا اور شبرغان میں ہوا۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ جولائی اور اگست میں پانچ سے چھ ہزار تک شہری قتل ہوئے۔ طالبان مخالف فوجوں میں بھی بے شمار افراد ہلاک ہوئے، طالبان لوگوں کو اس درجہ خوفزدہ کرنا چاہتے تھے کہ انہیں پھر کبھی سر اٹھانے کی جرئات نہ ہو، لیکن ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہوسکا۔

طالبان مزار شریف میں ایک اور گروہ کو نشانہ بنانا چاہتے تھے، اس سے بین الاقوامی احتجاج کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور انہیں ایران سے جنگ میں الجھنا پڑ جاتا۔ طالبان کا ایک چھوٹا سا گروہ ملا دوست محمد کی سربراہی میں ایرانی قونصل خانے میں داخل ہوا، اس نے ایرانی سفارت کاروں، انٹیلی جینس کے ایک افسر اور ایک صحافی کو تہہ خانے میں لے جا کر گولی ماردی۔ حکومت ایران نے کچھ عرصہ پہلے حکومت پاکستان سے درخواست کی تھی کہ ان کے قونصل کے تحفظ کی ضمانت فراہم کی جائے۔ ایرانی جانتے تھے کہ آئی۔ ایس۔ آئی کے افسر بھی طالبان کے ساتھ مزار شریف گئے ہیں۔ اسی بنا پر وہ اپنے سفارتی عملے کی حفاظت کے لئے پاکستان کی مدد کے طالب تھے۔ ایرانیوں کا خیال تھا کہ دوست محمد کا یونٹ ان کی حفاظت کے لئے آیا ہے۔ اس لئے انہوں نے اس کا خیر

مقدم کیا تھا۔لیکن معاملہ الٹ نکلا، طالبان نے 45 ایرانی ڈرائیوروں کو بھی جو ہزاروں کے لئے ہتھیار لا رہے تھے، پکڑ لیا۔

طالبان نے پہلے تو ایرانی سفارت کاروں کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی لیکن جب بین الاقوامی سطح پر احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایران کے غصے میں اضافہ ہوا تو انہوں نے مان لیا کہ ایرانی سفارتی نمائندے قتل ہو گئے ہیں۔لیکن اس میں طالبان کا سرکاری طور پر کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ چند گمراہ اور خود سر عناصر کی کارستانی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دوست محمد نے وائرلیس پر ملا عمر سے پوچھا تھا کہ آیا ایرانی سفارت کاروں کو قتل کیا جائے۔ ملا عمر نے اسے اجازت دے دی۔صحیح یا غلط ایرانیوں کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے۔قسمت کا کھیل تھا کہ دوست محمد بعد میں قندھار کی جیل میں پہنچایا گیا۔اس کی بیوی نے ملا عمر سے شکایت کی تھی کہ اس کا خاوند دو ہزارہ فاحشہ عورتوں کو ساتھ لے آیا ہے۔

طالبان کا افغانستان کے بڑے حصے پر کنٹرول ہو گیا تھا، اسے طالبان نے اپنی بڑی فتح سمجھا، پاکستانی افسروں نے یہ کہہ کر ان کی امید بڑھائی کہ اب انہیں بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا جائے گا۔اس سے اسامہ بن لادن کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ امریکہ اور سعودی عرب کے شاہی خاندان کے خلاف جہاد کے ضمن میں زیادہ پر جوش ہو گیا۔ 7 اگست 1998ء کو کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں کو بم سے اڑا دیا گیا۔اس سے 224 افراد ہلاک اور 4500 زخمی ہو گئے۔ امریکہ نے اس کا الزام اسامہ بن لادن پر لگایا۔ امریکہ نے 20 اگست 1998ء کو شمال مشرقی افغانستان میں اسامہ بن لادن کے تربیتی کیمپوں پر راکٹوں سے حملہ کیا۔ چھ نشانوں پر درجنوں کروز مزائیل گرے، جس سے 20 افراد ہلاک اور 30 زخمی ہو گئے۔امریکہ کا کہنا تھا کہ اسامہ بن لادن، کیمپوں میں موجود تھا لیکن حملے میں بچ گیا۔ بہت کم عرب ہلاک یا زخمی ہوئے۔ مرنے والوں میں زیادہ تعداد پاکستانیوں اور افغانوں کی تھی جو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں لڑنے کی تربیت لے رہے تھے۔

طالبان نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور افغانستان کے شہروں میں احتجاجی مظاہرے منظّم کیئے۔ مختلف شہروں میں اقوام متحدہ کے دفاتر پر حملے کیئے گئے۔ ملا عمر کا کہنا تھا کہ افغانستان پر حملہ اگر کلنٹن کا ذاتی فیصلہ تھا تو اس نے یہ حرکت دنیا اور امریکی عوام کی توجہ وائٹ ہاؤس کے اس شرمناک واقعہ سے ہٹانے کی غرض سے کی ہے جس نے ثابت کیا کہ کلنٹن ایک جھوٹا، شرافت اور عزت سے تہی دامن شخص ہے۔ ملا عمر کا اشارہ مونیکا لیونسکی کے معاملے کی طرف تھا۔ ملا عمر کا اصرار تھا کہ اسامہ بن لادن مہمان ہے۔ طالبان ہی کا نہیں بلکہ افغانستان کے عوام کا۔ طالبان اسے کبھی امریکہ کے حوالے نہیں کریں گے۔ امریکہ خود بہت بڑا دہشت گرد ہے۔ اقوام متحدہ کا عمل عدم تحفظ کی بنا پر کابل سے نکلنے لگا تو اقوام متحدہ کے اطالوی ملٹری افسر کو گولی مار دی گئی۔ ایک فرانسیسی سفارت کار کو زخمی کر دیا گیا۔ حملہ کرنے والے حاجی نواز اور سلیم دونوں کا تعلق راولپنڈی حرکت الانصار سے تھا۔ طالبان نے انہیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔

طالبان نے اپنے بین الاقوامی ناقدوں اور ایران کی تسکین و تشفی کرنے کی بجائے بامیان پر تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ چند ہزارہ کمانڈروں کے ہتھیار ڈال دینے پر طالبان 13 ستمبر 1998ء کو شہر پر قابض ہو گئے۔ کریم خلیلی اور وحدت کے دوسرے لیڈر شہر کی بیشتر آبادی ساتھ لے کر پہاڑوں پر چلے گئے۔ اس مرتبہ بار بار کی بین الاقوامی اپیلوں پر کہ انسانی حقوق کا احترام کیا جائے، ملا عمر نے اپنے دوستوں کو حکم دیا کہ وہ ہزارہ شہریوں کے خلاف کسی زیادتی کے مرتکب نہ ہوں۔ اس کے باوجود طالبان کے شہر میں داخل ہونے کے چند ہفتوں کے بعد بامیان میں قتل کے واقعات ضرور ہوئے۔ بامیان کے ایک قریبی گاؤں کے 50 معمر افراد کو طالبان نے قتل کر دیا۔ نوجوان تو گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے، بوڑھے پیچھے رہ گئے تھے، جو طالبان کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔

بامیان پر قبضہ کے پانچ دن بعد طالبان نے بدھ کے ایک مجسمے کا سر بارود سے اڑا

دیا۔ یہ بت جس جگہ بنایا گیا تھا، اس پر بھی اندھا دھند فائرنگ کی گئی، جس سے بت اور اس کے خوبصورت پس منظر کو شدید نقصان پہنچا۔ بدھ کے دو مجسمے دو ہزار سال سے موجود تھے اور افغانستان کے آثار قدیمہ میں ایک نمایاں حیثیت اور اہمیت رکھتے تھے۔ منگولوں کے حملے میں بھی یہ محفوظ رہے، لیکن اب کے انہیں ہدف بنایا گیا۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جس کی تلافی ممکن نہیں۔

بامیان کا طالبان کے ہاتھوں فتح ہونا، ایرانیوں کے لئے اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوا۔ ایران نے کہا کہ بین الاقوامی قانون کے مطابق اسے اپنا دفاع کرنے کی اجازت ہے۔ اقوام متحدہ کا منشور طالبان کے خلاف ہر ضروری اقدام کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ امریکہ نے بھی افغانستان پر مزائلوں کے حملے کے جواز میں یہی دلیل دی تھی۔ ایک ہفتہ بعد ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ علی خان رابی نے انتباہ کیا کہ بہت بڑی جنگ چھڑ جائے گی، جو پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لی گئی۔ انہوں نے پاکستان پر الزام لگایا کہ بامیان پر قبضہ کرنے کے لئے اس نے طالبان کی فوجوں کی طیاروں کے ذریعے مدد کی۔ اسلام آباد نے اس کی تردید کی۔ اس کے باوجود ایران اور پاکستان کے تعلقات میں شدید سرد مہری پیدا ہو گئی۔ ستر ہزار ایرانی انقلابی گارڈز نے فوج اور طیاروں کی مدد سے ایران افغانستان سرحد کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر فوجی مشقیں شروع کر دیں۔ اکتوبر میں ایران دو لاکھ باقاعدہ فوج کو بھی لے آیا۔ طالبان، ایران کے مقابلے میں صرف پانچ ہزار فوج لا سکے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایران کے بھرپور حملے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے لخدار براہیمی کو علاقے کے دورے پر بھیجا۔ وہ 14 اکتوبر 1998ء کو قندھار میں ملا عمر سے ملے، جس سے ایران اور طالبان کے درمیان کشیدگی کم کرنے میں مدد ملی۔ ملا عمر پہلی بار اقوام متحدہ کے کسی افسر یا غیر ملکی سفارت کار سے ملے جو پاکستانی نہیں تھا۔ ملا عمر تمام ایرانی ٹرک ڈرائیوروں کو رہا کرنے اور ایرانی سفارت کاروں کی میتیں ایران کے حوالے

کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اقوام متحدہ سے تعلقات بہتر بنانے کا بھی وعدہ کیا۔

طالبان کی ایران سے محاذ آرائی کے سبب احمد شاہ مسعود کو اپنی فوج اور بچے کھچے ازبک اور ہزارہ دستوں کو منظّم کرنے کی مہلت مل گئی، اسی دوران اسے روس اور ایران سے ہتھیار، موٹر گاڑیاں اور ہیلی کاپٹر مل گئے۔ مسعود نے شمال مشرق کی جانب برق رفتار حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور طالبان سے وسیع رقبہ واپس لے لیا۔ اس میں وہ حساس علاقہ بھی شامل تھا جو تاجکستان اور ازبکستان کے ساتھ ملنے والی افغان سرحد پر پھیلا ہوا ہے۔ اکتوبر میں یہاں دو ہزار کے لگ بھگ طالبان ہلاک یا زخمی ہوئے۔ طالبان اسلحے کی کمی، موسمی شدائد، حد سے زیادہ بڑھی ہوئی سردی کی وجہ سے پست حوصلہ ہو گئے تھے، وہ تھوڑی سی دیر لڑنے کے بعد مسعود کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ 7 دسمبر 1998ء کو مسعود نے طالبان کے مخالف فیلڈ کمانڈروں کا اجلاس پنج شیر وادی میں طلب کیا۔ ہزارہ اور ازبک قیادت کے ختم ہو جانے کے بعد مسعود اور اس کے تاجک کمانڈر ہی برتر اور اعلیٰ تسلیم ہونے لگے۔ کمانڈروں نے جن میں کئی پشتون بھی شامل تھے، مسعود کو تمام طالبان مخالف عناصر کا فوجی کمانڈر مقرر کر دیا۔

طالبان کے حملے ہزارہ لوگوں کا قتل عام، ایران سے محاذ آرائی اور امریکہ کے کروز مزائیلوں سے حملے نے علاقے میں طاقت کے نازک سے توازن کو ڈرامائی طور پر بگاڑ دیا۔ طالبان کی پیش قدمی نے روس، ترکی اور وسطی ایشیائی ریاستوں کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے پاکستان اور سعودی عرب پر طالبان کی حمایت اور پشت پناہی کرنے کا الزام لگایا۔ الفاظ کی تیز جنگ نے علاقے میں دھڑے بندی اور دونوں ملکوں کی باہمی مخاصمت میں شدت پیدا کر دی۔ قازقستان، کرغیزستان، ازبکستان، تاجکستان اور روس کے نمائندوں کا ایک اجلاس 25 اگست 1998ء کو تاشقند میں ہوا۔ جس نے طالبان کی پیش قدمی روکنے کے لئے فوجی اور سیاسی منصوبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر غور کیا۔

علاقے میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کے سنگین اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا۔ ایران اور طالبان میں جنگ چھڑ جانے کے خطرے اور پاکستان کے طالبان کا ساتھ دینے کے امکان کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ مغربی سرمایہ کاروں نے اور آئیل کمپنیوں نے کیسپین کے ساتھ کے تیل کے ذخائر نے مالا مال ملکوں میں سرمایہ کاری کرنے میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ وسطی ایشیا کی اقتصادی لحاظ سے بے مایہ ریاستوں میں اسلامی بنیاد پرستی کے پھیلنے کا خطرہ بڑھنے لگا۔ پاکستان میں دینی جماعتوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ شدت سے کرنا شروع کر دیا۔ عالمی برادری کے لئے یہ امر سخت مایوسی کا موجب تھا کہ طالبان وسیع البنیاد حکومت بنانے سے انکار کرتے آ رہے تھے۔ عورتوں کے معاملے میں اپنی روش بدلنے پر تیار نہیں تھے اور سفارتی آداب کو ملحوظ رکھنے پر آمادہ نہ تھے۔ اقوام متحدہ کی امدادی ایجنسیاں واپس کابل نہیں جا سکتی تھیں۔ امریکہ کے اعصاب پر اسامہ بن لادن سوار تھا وہ اسے ہر حال میں پکڑنا چاہتا تھا، لیکن طالبان اسے امریکہ کے حوالے کرنے سے انکاری تھے۔ حتیٰ کہ طالبان کے قریبی اتحادی سعودی عرب بھی اب اس اسامہ بن لادن کو طالبان کی طرف سے تحفظ فراہم کرنے پر مایوس اور ناراض تھا۔ اس نے کابل سے اپنا سفارتی عملہ واپس بلا لیا اور طالبان کو مالی امداد دینا بند کر دی۔ اب طالبان کا واحد حامی اور مددگار صرف پاکستان رہ گیا۔

یہ بین الاقوامی ردعمل کا اثر تھا کہ 8 دسمبر 1998ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے سخت ترین قرارداد منظور کی، جس میں بین الاقوامی دہشت گردوں کو پناہ دینے، انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے، منشیات کے ناجائز کاروبار کو فروغ دینے اور جنگ قبول کرنے سے انکار کی بنا پر افغانستان پر سخت پابندیاں لگانے کا کہا گیا تھا۔ امریکی سفارت کار نینس سوڈر برگ نے کہا کہ ''افغانستان میں دہشت گردی نے طاعون کی صورت اختیار کر لی ہے''۔ پاکستان واحد ملک ہے جس نے قرارداد کی حمایت نہیں کی، اس نے اسے تعصب پر مبنی قرار دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ طالبان کی طرح پاکستان بھی

عالمی سطح پر تنہا رہ گیا ہے۔

اقوام متحدہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ نے دونوں فریقوں کو گفت وشنید پر آمادہ کر دیا۔ طالبان اور مخالفوں میں 11 مارچ 1991ء کو اشک آباد میں ملاقات ہوئی، دونوں میں قیدیوں کا تبادلہ کرنے اور بات چیت جاری رکھنے پر اتفاق ہو گیا۔لیکن اپریل تک ملا عمر نے مزید بات چیت کو خارج از امکان قرار دے دیا اور مسعود پر الزام لگایا کہ وہ دوغلے پن سے کام لے رہا ہے۔ درحقیقت دونوں فریق جنگ میں تعطل سے فائدہ اٹھا کر نئے حملے کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔

7 اپریل 1999ء کو مسعود نے روسی وزیر دفاع ایگور سرگئن سے دوشنبے میں ملاقات کی۔ روس نے اعلان کیا کہ وہ تاجکستان میں ایک نیا فوجی اڈہ تعمیر کرے گا۔ صاف ظاہر تھا کہ روس احمد شاہ مسعود کی فوجی امداد میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ طالبان بھی اپنے آپ کو مزید اسلحے سے لیس کر رہے تھے اور پاکستان میں موجود مدرسوں کے طلبا کو بھرتی کر کے اپنی طاقت بڑھا رہے تھے۔مسعود اور ہزارہ فوجوں نے شمال مشرقی اور ہزارہ جات پر حملوں کا نیا سلسلہ شروع کیا۔ 21 اپریل 1999ء کو حزب وحدت کی فوج نے ڈرامائی طور پر بامیان پر دوبارہ قبضہ کر لیا، شمال میں ایک بار پھر جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور اقوام متحدہ کی قیام امن کے لئے کوششیں موقوف ہو کر رہ گئیں۔

1998ء کے اوائل میں کوفی عنان نے انتباہ کیا تھا کہ ''دو کروڑ کے ملک میں 50 ہزار مسلح افراد نے پوری آبادی کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ 1998ء کے اواخر تک کوفی عنان نے علاقائی بنیادوں پر تصادم کے مزید گہرا ہونے اور ایک بڑے تنازع کی بنیاد بننے کی پیش گوئی کی۔ طالبان کی فتوحات اور شمال میں بسنے والوں کے قتل عام نے افغانستان میں مختلف نسلوں کے درمیان نفرت اور بے اعتمادی کی دیواریں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔کوفی عنان کی پیش گوئی سال کے آخر تک صحیح ثابت ہونے لگیں۔ لخدار براہمی نے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے طالبان پر خودسری، پاکستانی مدرسوں کے ہزاروں طلباء کا

طالبان کی صفوں میں شامل ہونے اور بیرونی مداخلت کے مسلسل جاری رہنے کو صورت حال کی سنگینی کا سبب بتایا۔ براہیمی کے مستعفیٰ ہونے کے بعد طالبان نے جولائی اور ستمبر میں مسعود کی فوج کو کابل کے علاقے سے باہر نکالنے اور شمال میں تاجکستان سے اس کی رسد کے راستے کاٹ ڈالنے کے لئے دو حملے کئے جو ناکام رہے لیکن طالبان نے دارالحکومت کی شمالی علاقے اور شومالی کی وادی میں بے تحاشا تباہی چاہی، جس کے نتیجے میں دو لاکھ افراد یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

موسم سرما شروع ہوا تو وہ لاکھوں افراد جنہوں نے مسعود کی پنج شیر وادی میں اور ہزارہ کے کابل میں پناہ لے رکھی تھی، بھوکوں مرنے لگے۔ ان علاقوں میں خوراک اور رہائش کی سہولتوں کی شدید کمی تھی۔ براہیمی کے استعفیٰ کا ایک اثر یہ ہوا کہ عالمی برادری نے طالبان کے بارے میں اپنا رویہ اور زیادہ سخت کر لیا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے 15 اکتوبر کو طالبان پر محدود پابندیاں عائد کیں، افغانستان آنے جانے والی کمرشل پروازوں کی ممانعت کر دی۔ دنیا بھر کے بینکوں میں طالبان کے جہاں جہاں بھی اکاؤنٹ تھے، منجمد کر دیئے۔ امریکہ نے اسامہ بن لادن کی گرفتاری کے لئے طالبان پر اپنا دباؤ مزید بڑھا دیا۔ طالبان بین الاقوامی سطح پر مکمل طور پر تنہا ہو گئے۔ 12 اکتوبر کو پاکستان میں فوجی انقلاب کے بعد یہ امکان پیدا ہو گیا کہ پاکستان پہلی مرتبہ طالبان سے اپنا فاصلہ بڑھائے گا۔

طالبان کی نئی طرز کی بنیاد پرستی

اسلام کو عام افغان عوام کی زندگی میں ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی پابندی میں افغانوں سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اسلام افغان کے مختلف قبائیل اور نسلوں کے لوگوں کے درمیان اتحاد کا اہم ترین وسیلہ رہا ہے۔ جہاد افغان قوم پرستی کو زندہ رکھنے اور متحرک کرنے کا بھی محرک ثابت ہوا۔ برطانیہ اور روس کے خلاف افغانوں کی مزاحمت میں جذبہ جہاد کی کارفرمائی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ امیر، غریب، کمیونسٹ، شاہ اور مجاہدین سب ہیں۔ اسلام کے بارے میں اتفاق رائے ہے، سبھی لوگ فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کے ذہنی تحفظ کا شکار نہیں۔ 1988ء میں سابق شاہ ظاہر شاہ سے جن کی عمر خاصی ڈھل گئی تھی۔ ملنے اور ان کا انٹرویو لینے میں روم گیا۔ انٹرویو کے دوران وہ اٹھے اور دوسرے کمرے میں جا کر نماز ادا کی۔ افغان کمیونسٹ وزراء اپنے محاذ پر نماز ادا کرتے تھے، مجاہدین جنگ روک کر نماز ادا کرتے ہیں۔ ملا عمر گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھے عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ نماز کے بعد ہی طالبان کی جنگی چالوں کے بارے میں سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں۔ احمد شاہ مسعود گھمسان کی جنگ میں بھی نماز کے لئے وقت نکال لیتے ہیں، گولیوں کی سنسناہٹ، وائرلیس پر موصول ہونے والے پیغامات کے شور میں بھی وہ استغراق میں چلے جاتے ہیں۔

لیکن کوئی افغان اس پر اصرار نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کھڑا ہوا شخص بھی اس کے ساتھ نماز پڑھے۔ افغانستان میں اسلام کبھی متنازع نہیں رہا، میں نے یکساں جذبے و شوق سے اس کی پیروی کی ہے۔ تمام اسلامی فرقوں کو برداشت کیا ہے۔ حتیٰ کہ دوسرے مذاہب اور جدید طرفہ زندگی کے حامل لوگوں کے ضمن میں بھی رواداری اور تحمل سے کام لیا ہے۔ افغان ملاؤں نے دین کے معاملے میں کبھی جبر نہیں کیا۔ فرقے کبھی سیاسی مسئلہ نہیں بنے۔ 1992ء سے پہلے ملک کی معیشت میں ہندو، سکھ اور یہودی اہم کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ روایتی طور پر منی مارکیٹ پر انہی کا کنٹرول رہا ہے، جب افغان شاہوں میں جنگ چھڑی ہے تو وہ انہی سے مالی امداد لیتے رہے ہیں۔

1992ء میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو صدیوں سے چلی آنے والی افغان برداشت اور دوسروں کے لئے مفاہمت، غارت ہو کر رہ گئی۔ خانہ جنگی نے اسلامی فرقوں اور نسلی گروہوں کو اس طرح منقسم کر دیا کہ اس سے قبل عام افغان اس کا تصور نہیں رکھتے تھے۔ 1995ء میں احمد شاہ مسعود نے کابل میں ہزارہ قبیلے کے لوگوں کا قتل عام کیا۔ 1997ء میں ہزارہ قبائیل نے مزار شریف میں طالبان کا قتل عام کیا۔ 1998ء میں طالبان نے ہزارہ اور ازبک نسلوں کے لوگوں کو قتل کیا۔ پوری افغان میں یہ کچھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، لیکن اب اسی کے سبب سے ملک کے قومی اور دینی جذبے اور رویے کو جس طرح زک پہنچی اور نقصان ہوا ہے شاید اس کی کبھی تلافی نہ ہو سکے گی۔ طالبان نے جان بوجھ کر شیعوں کی جو مخالفت کی اس نے اسلام اور ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اقلیتی گروپ اجتماعی طور پر ملک سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ افغانستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام جو اتحاد کا داعی اور مبلغ رہا ہے انتہا پسندوں کے ہاتھ میں ایک حربہ بن گیا جو تقسیم افزاں اور خون ریزی کا موجب بنا ہے۔

نوے فیصد افغان سنی حنفی عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ مسلک بڑی حد تک آزاد رو ہے۔ اقلیتی فرقے ملک کی سرحد پر رہتے تھے۔ ہزارہ جات میں ہزارے شیعہ ہیں، یہاں چند

پشتون تاجک اور کچھ ہراتی رہتے ہیں۔ آغا خان کے ماننے والے اسماعیل بھی ہیں۔ اسماعیلی شمال مشرق کے ایسے علاقے میں آباد ہیں جو دشوار گزار ہے۔ جہاں تک رسائی مشکل ہے۔ پایر کا سلسلہ کوہ جو تاجکستان کے مشرقی حصے میں واقع ہے اور پاکستان کے شمالی علاقوں تک پھیلتا چلا گیا ہے، اسماعیلی فرقے کے لوگوں کا مسکن ہے۔ افغان اسماعیلیوں کے لیڈر سید نادر شاہ حسین کو آغا خان نے خود فرقے کا سربراہ مقرر کیا۔ 1971ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے ان کے فرقے کے سربراہ چلے آتے ہیں۔ انہوں نے طالبان کے خلاف اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندو اور سکھ جو انیسویں صدی میں انگریزوں کے ساتھ آئے تھے 1998ء تک ان کی اکثریت ملک چھوڑ کر جا چکی تھی، کچھ یہی حال یہودیوں کا ہے، ان کی اکثریت بھی افغانستان سے نکل گئی۔ معدودے چند رہ گئے ہیں۔

سنی حنفی مسلک میں باپ کے بعد بیٹے کے گدی نشین ہونے کی کوئی روایت نہیں ہے۔ ان کی عدم مرکزیت کے باعث بیسیویں صدی کے حکمران انہیں منظّم شکل دینے میں ناکام رہے۔ ان کے دینی رہنماؤں کو مرکزی حکومتی نظام میں اہم منصب دینا بھی مشکل رہا۔ روزمرہ کے مسائل، قبیلہ اور اس کے ارکان طے کرتے ہیں۔ پشتونوں میں دیہات کے ملا ان پڑھ ہونے کے باوجود مسجد کو گاؤں کی زندگی میں مرکزی مقام دلائے رکھنے کا وسیلہ ہیں۔ طلبا قبائلی علاقوں میں پھیلے ہوئے مدرسوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں ہرات، افغانستان کے مدرسوں کے نظام کا مرکز رہا۔ سترہویں صدی میں افغان طلبا، علماء کی صف میں شامل ہونے کے لئے وسطی ایشیاء مصر اور ہندوستان کے مشہور مدارس میں پڑھنے کے لئے جانے لگے۔

اسلام کی جڑیں افغانستان میں اس لئے بھی گہری رہی ہیں کہ 1925ء تک شریعت ہی یہاں کے نظام قانون کی بنیاد رہی۔ شاہ امان اللہ نے سول خاندانی نظام قائم کرنے کی ابتداء کی۔ حکومت نے علماء کی تربیت کا اہتمام کیا۔ تربیت پانے کے بعد علماء قاضی

کے منصب پر فائز ہونے کے اہل قرار پاتے۔ 1946ء میں کابل یونیورسٹی میں شرعی شعبہ قائم کیا گیا، جس نے سول قانون اور شریعت کو مربوط کرنے کا کام شروع کیا۔ روایتی اور جدید سول کوڈ کو باہم مدغم کرنے کا آغاز بادشاہت کے دور کے آخری وزیراعظم محمد موسیٰ شفیق نے کیا۔ 1973ء میں اس حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔شفیق نے ابتدائی تعلیم مدرسے میں پائی تھی، پھر کابل یونیورسٹی کے شعبہ شریعت میں زیرتعلیم رہے۔ بعد میں ایک اور ڈگری لینے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں پڑھنے چلے گئے۔ 1979ء میں جب کیمونسٹوں نے انہیں قتل کیا تو ان کی ہلاکت پر پورے ملک میں سوگ منایا گیا۔ چنانچہ یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ 1979ء میں ملا روشن خیال اسلامی مجاہدین کی جماعتوں میں شامل نہیں ہوئے، اس کے مقابلے میں وہ مولانا محمد نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی اور مولوی یونس خالص کی حزب اسلامی کی طرف راغب ہوئے۔ دونوں نے پاکستان کے مدرسہ حقانیہ میں تعلیم پائی تھی۔ بعد میں دونوں نے افغانستان میں اپنے مدرسے قائم کر لئے۔ سوویت حملے کے وقت انہوں نے ڈھیلی ڈھالی تنظیمیں قائم کرلیں، ان میں عدم مرکزیت تھی اور ان کا کوئی خاص نظریہ بھی نہیں تھا۔لیکن جب سی آئی اے اور آئی ایس آئی نے زیادہ گرم جوش جماعتوں کو اسلحہ فراہم کرنا شروع کیا تو یہ دونوں تنظیمیں بھی اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکیں۔

افغانستان میں اسلام کو اعتدال کی راہ پر رکھنے کا ایک اہم وسیلہ تصوف تھا جو بے حد مقبول تھا۔ اس کا آغاز وسطی ایشیاء اور ایران سے ہوا تھا۔صوفی طریقہ (یا مسلک) ازمنہ وسطیٰ میں حاکمیت، شریعت کی یک طرفہ تشریح، قانون کی سختی اور ملا کے خلاف ردعمل کے طور پر ابھرا۔غریب، بے کس اور محروم لوگوں نے اس میں اپنے لئے راحت و عافیت دیکھی۔صوفیوں نے عبادت، مراقبے، موسیقی اور حال کو حق تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیا۔ان طریقوں سے فرد کے اندر ایسا روحانی سکون پیدا ہو جاتا ہے جس تک کسی غیر کی رسائی ممکن نہیں۔ سات صدی پیشتر مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ نے لکھا کہ صوفی کی

زندگی کا بنیادی مقصد انسان کے عقل و حواس پر پڑے پردے ہٹا کر اسے واصل بالحق کرنا ہے۔

افغانستان صوفی مسالک کے دو سلسلے نقشبندیہ اور قادریہ نے سوویت حملے کے خلاف مزاحمت پیدا کی اور اسے منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے مجاہدین کی پارٹیوں کے لئے نسلی گروہوں سے الگ اتحاد و ارتباط کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ صوفیا کے دونوں مسالک کے رہنماؤں کو مساوی طور پر اہمیت حاصل تھی۔ مجددی خاندان نقشبندیہ مسلک کا رہنما تھا اور صدیوں سے کابل میں بادشاہ گر تسلیم ہوتا آ رہا تھا۔ کمیونسٹوں نے جنوری 1979ء میں کابل میں مجددی خاندان کے 79 ارکان کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ یہ خاندان آگے چل کر کمیونسٹوں کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ اس لئے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ خاندان کے ایک بچ جانے والے رکن صبغت اللہ مجددی نے نجات ملنے پر افغانستان کے نام سے پشاور میں اپنی مزاحمتی جماعت بنا لی۔ وہ متشدد اسلامی جماعتوں پر سخت تنقید کرتے تھے۔ انہیں 1989ء میں افغان عبوری حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ 1992ء میں مجاہدین کی طرف سے افغانستان کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

سابق شاہ، ظاہر شاہ کے رشتے کے بھائی پیر سید احمد گیلانی نے جو قادری سلسلے کے سربراہ تھے۔ پشاور میں محاذ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی وہ شاہ کے حامی اور مجاہدین کے لیڈروں میں سے سب سے زیادہ اعتدال پسند تھے۔ سی آئی اے اور آئی ایس آئی حکمت یار، مسعود اور بعد میں طالبان نے بھی انہیں قریب نہیں آنے دیا۔ 1999ء میں وہ دوبارہ سیاست میں آئے اور امن و قومی اتحاد پارٹی کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے طالبان اور مخالفین میں صلح صفائی کرانے کی بہت کوشش کی۔

طالبان سے پہلے افغانستان میں اسلامی انتہا پسندی کبھی پھولی پھلی نہیں تھی۔ سنی حنفی روایت کی پابندی کرنے والوں میں وہابی بھی شامل تھے۔ وہ سعودی عرب کے وہابی

مسلک کے پیروکار تھے۔ عبدالوہاب (1792ء - 1703ء) نے عرب بدوؤں کو تصوف کے اثر سے نکالنے کے لئے وہابی تحریک شروع کی تھی۔ 1970ء کے عشرے میں جب تیل اقتصادی ترقی کا کارگر وسیلہ بنا تو سعودی خارجہ پالیسی میں وہابیت کے فروغ کو نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی۔ وسط ایشیاء میں وہابی سب سے پہلے 1912ء میں پہنچے۔ مدینہ کے رہنے والے ایک شخص شفیع محمد نے تاشقند اور وادی فرغانے میں وہابی مراکز قائم کئے۔ ان سے اور برطانوی ہندوستان سے وہابی مسلک افغانستان پہنچا۔ جنگ سے پہلے اس کی ترویج ہونے لگی۔

بہرحال سعودی عرب میں تربیت پانے والے افغان لیڈروں کو ہتھیار اور سرمایہ ملنے لگا تو وہابیوں کے پیروکاروں میں کچھ اضافہ ہونے لگا۔ جنگ کے ابتدائی مراحل میں سعودی عرب نے اپنے ہاں عرصے سے چھپے ہوئے ایک افغان عبدالروف سیاف کو وہابی جماعت، اتحاد اسلامی قائم کرنے کے لئے پشاور بھیجا۔ وہابی افغان جو سلفی بھی کہلاتے ہیں انہوں نے تصوف اور قبائیل کی بنیاد پر قائم جماعتوں کی مخالفت کرنا شروع کی۔ لیکن وہ اپنا پیغام اس لئے پھیلانے میں ناکام رہے کہ عام افغان ان سے سخت نفرت کرتے تھے اور ان کے مسلک کو بیرونی مسلک سمجھتے تھے۔ اسامہ بن لادن سمیت عرب مجاہدین جو جہاد کی غرض سے افغانستان آئے، بہت کم پشتونوں کو اپنا ہم نوا بنا سکے۔ جو پشتون ان کی حمایت کرنے پر آمادہ ہوئے، ان کے لئے اصل ترغیب سرمایے اور اسلحے کی بہتات تھی۔

سی آئی اے اور آئی ایس آئی کی طرف سے اسلحے کی فراہمی نے اسلامی جماعتوں کو متحرک کیا۔ حکمت یار اور مسعود نے 1975ء میں صدر محمد داؤد کے خلاف ناکام بغاوت کی تھی، پھر دونوں بھاگ کر پاکستان چلے گئے تھے، جہاں حکومت نے ان کی سرپرستی کی تھی۔ پاکستان کا خیال تھا کہ افغانستان میں آئندہ جو حکومتیں اقتدار میں آئیں گی، ان دونوں کو ان پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کیا جا سکے گا۔ 1979ء میں سوویت یونین

نے افغانستان پر حملہ کیا، اس سے پہلے ہی پاکستان کے پاس ایسے موثر اسلامی انتہا پسند موجود تھے جو جہاد شروع کر سکتے تھے۔ صدر ضیاء الحق کا اصرار تھا کہ سی آئی اے کی فوجی امداد کا وافر حصہ ان پارٹیوں کو منتقل کر دینا چاہیے لیکن جلد ہی مسعود نے آزادروی اختیار کر لی اور وہ پاکستان کے کنٹرول پر بڑی شدت سے تنقید کرنے لگا۔

یہ اسلامی لیڈر یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ طلباء میں سے تھے۔ حکمت یار کابل یونیورسٹی میں انجینئرنگ کے طالب علم تھے۔ مسعود نے کابل کی فرانسیسی درسگاہ سے تعلیم پائی تھی۔ دونوں پاکستان کی جماعت اسلامی سے متاثر تھے۔ جماعت اسلامی اخوان المسلمین سے متاثر تھی۔ اخوان 1928ء میں مصر میں قائم ہوئی۔ اس کا نصب العین اسلامی انقلاب بپا کرنا اور ایک اسلامی ریاست قائم کرنا تھا۔ اخوان المسلمین کے بانی حسن البنی (1949 ۔ 1906) کے جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (1978ء ۔ 1903ء) پر گہرا اثر تھا۔

ایرانی اخوان تحریکیں اسلامی دنیا میں جہاں جہاں بھی تھیں وہ نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے لئے قوم پرستانہ یا کمیونسٹ انقلاب نہیں بلکہ اسلامی انقلاب کو وسیلہ بنانے کے حق میں تھیں۔ انہوں نے روایتی ملاؤں کے برعکس اپنے اپنے ملک میں نو آبادیاتی نظام کے حامیوں سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا وہ دوررس اسلامی تبدیلی چاہتے تھے، جس میں ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں مدد مل سکے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ میں قائم کیا تھا۔ دوسرے وہ دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہو۔ انہوں نے قوم پرستی، نسلی، قبائلی، جاگیرداری کی تمام صورتوں کو مسترد کرتے ہوئے ایک اسلامی بین الاقوامیت کے فروغ کو اپنا مطمع نظر بنا لیا جو بالآخر پوری اسلامی دنیا یا امت کو پھر سے متحد کرنے کا وسیلہ بنے گا۔ اس مقصد کی تحصیل اور تکمیل کے لئے جماعت اسلامی اور حکمت یار کی ضرب اسلامی نے کمیونسٹ پارٹی کے خطوط پر سیل قائم کئے۔ انتہائی رازداری کو اہم قرار دیا، سیاسی بیداری اور فوجی

تربیت کو لازم ٹھہرایا۔ اخوان کی طرز پر اسلامی سیاسی جماعتوں کی سب سے بڑی کمزوری ایک کرشمہ ساز شخصیت یا امیر پر مکمل انحصار تھا۔ جمہوری بنیادوں پر تنظیم کرنے کو اہمیت نہیں دی گئی۔ انقلاب آخر میں اسلام کو اداروں کا امین سمجھنے کی بجائے لیڈر کی پاکبازی، اوصاف حسنہ، کردار کی خوبی اور راستی کو اسلام کی ترویج کا موثر وسیلہ قرار دیا گیا۔ یہ اوصاف کسی ایسے معاشرے میں ہی افراد کی زندگی کا حصہ بنتے ہیں جو خود صحیح معنوں میں اسلامی ہو۔ جہاں تک حکمت یار کا تعلق ہے، اس کی مثال آمریت کے فروغ کا وسیلہ بنی۔

بہرحال جہاں تک ان اصلاح کے طالب اسلام پسندوں کا تعلق ہے وہ طالبان کے مقابلے میں جدید اور آگے کی طرف دیکھنے اور دھیان دینے والے ہیں۔ وہ عورتوں کو تعلیم دلانے اور معاشرتی زندگی میں ان کی شرکت کے حامی ہیں۔ انہوں نے اسلامی معیشت کے بارے میں اصول متعین کیے ہیں یا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنکاری، خارجی تعلقات اور عادلانہ اور منصفانہ سماجی نظام کے تعلق سے بھی مقاصد اور اصول طے کیے ہیں۔ لیکن اصلاح کے طالب اسلام پسندوں کو بھی انہی کمزوریوں اور حدود کے باعث مشکلات اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا، جن کمزوریوں اور محدودات کے باعث افغان مارکسسٹ کو نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ بھی کچے پکے نظریات کے اسیر رہے، انہوں نے مختلف معاشرتی، مذہبی اور نسلی شناختوں کو جن کی اساس پر افغان معاشرے کی تعمیر ہوئی تھی۔ جلا بخشنے اور باہم مربوط بنانے کی بجائے انہیں یکسر مسترد کر دیا۔ مختلف افغان قبیلے اور جماعتیں اور اسلام پسند اور کمیونسٹ دونوں ہی ایک روایتی سماجی نظام میں اوپر سے آنے والے انقلاب کے توسط سے اس انقلابی تبدیلی کو لانا چاہتے تھے۔ وہ قبائلی اور نسلی شناختوں کو بیک جنبش قلم موقوف کر دینا چاہتے تھے، جو اصلاً ناممکن تھا۔ وہ زمینی حقائق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

افغان اسلام پسندوں کی سیاسی ناکامی اور تبدیلی لانے کے لئے حقائق پر مبنی نظریات

پیش نہ کر سکنے کے باعث وہ اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل نہ کر سکے۔ یہ صورت حال افغانستان تک محدود نہیں۔ یہ پوری اسلامی دنیا کو درپیش ہے۔ فرانسیسی دانشور اولیور رامے نے اسے سیاسی اسلام کی ناکامی سے تعبیر کیا ہے۔ مسلم معاشرہ بیسویں صدی میں دو متضاد حصوں میں منقسم رہا ہے۔ خاندان، قبیلہ اور نسلی گروہ۔ ایک طرف ریاست اور مذہب دوسری طرف یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک چھوٹا گروہ بمقابلہ وسیع تر، دینی گروہ اور قبیلہ بمقابلہ امہ ہے۔ وفاداری اور کومٹ منٹ کی بنیاد بھی یہی گروہی اور قبائلی نسبتیں رہی ہیں۔ افغانستان کے اسلام پسند اس پیچیدگی کو دور نہیں کر سکے۔

طالبان نے اسلامی اصلاحی تحریک شروع کی ہے۔ پوری مسلم تاریخ میں اسلامی اصلاحی تحریکیں عقیدے کی نوعیت اور سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ماہیت بدلتی رہی ہیں۔ مسلم خانہ بدوشوں، قبائیل، دوسری مسلم سلطنتوں کو تباہ کرتے اور اپنے رنگ میں ڈھالتے رہے لیکن جب شہروں میں بس گئے تو خود برباد ہو گئے۔ یہ سیاسی تبدیلی ہمیشہ جہاد کے نظریے سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کا مغربی فکر، جس پر ہمیشہ کا جہاد کو کافروں کے خلاف اسلامی جنگ قرار دیتی رہی۔ لیکن اصل جہاد انسان کی باطنی اصلاح کے لئے کیا جاتا ہے تاکہ اچھا انسان بنایا جا سکے اور اپنی اور معاشرے کی فلاح کے ارباب فراہم کئے جا سکیں۔ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اس کے احکام کی پابندی اور روئے زمین پر ان کا نفاذ بھی جہاد ہی کا حصہ ہے۔ جہاد اخلاقی نظم وضبط کے لئے باطنی سعی و جہد اور اسلام کے ساتھ کامل وابستگی اور سیاسی عمل کا نام بھی ہے۔

اسلام اس امتیاز کے بغیر کہ کوئی غیر منصف حکمران، مسلمان ہے یا نہیں، اس کے خلاف جہاد کی تحریک کی اجازت دیتا ہے۔ اس تبدیلی کا وسیلہ بھی جہاد ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جہاد کے ضمن میں ایک لائق تقلید نمونہ ہے۔ آپؐ نے بدعنوان عرب معاشرے پر پورے دینی جذبہ کے ساتھ کاری ضرب لگائی۔ طالبان بھی حضور ہی کی پیروی میں گرد و پیش کے جنگی سرداروں پر حملہ آور ہیں۔ تاہم جہاد نسل یا

MashalBooks.org

فرقے کے اختلاف کی بنا پر مسلمانوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ طالبان کے جہاد کا یہ رخ غیر پشتونوں کو لرزا دیتا ہے۔ طالبان کا دعویٰ ہے کہ وہ بدعنوان اور برے مسلمانوں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں لیکن نسلی اقلیتوں کے نزدیک وہ اسلام کے پردے میں غیر پشتونوں کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ طالبان نے اسلام، جہاد اور معاشرتی اصلاح کی جو توجیہہ کی ہے، وہ افغانستان میں اغل اور بے ربط سمجھی جاتی ہے کیونکہ طالبان کی تحریک کے شروع ہونے سے عروج حاصل کرنے تک اس میں ان اسلامی رجحانات کا کوئی عکس یا پرتو نظر نہیں آتا، جو سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران نمایاں رہا، طالبان نہ تو انقلابی اسلام پسند ہیں، جو اخوان سے متاثر ہیں اور نہ مومنوں سے اور نہ ہی روایت پسندوں سے۔ 1979ء سے 1794 کے دوران افغانستان میں جتنی بھی اسلامی تحریکیں اٹھیں یا خیالات پھیلے ان میں طالبان کہیں بھی جگہ نہیں پاتے۔ کہا جا سکتا ہے تینوں رجحانات (انقلابی اسلام پسندی، تصوف اور روایت پسندی) کی نفی اور اقتدار کی تنگی جنگ نے جو خلا پیدا کیا، طالبان اسے پر کرنے آ گئے ہیں۔ طالبان کسی کی نمائندگی نہیں کرتے، بس اپنی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلام بھی وہی مانتے ہیں جس کی تعبیر و توجیہہ خود انہوں نے کی ہے۔ ان کی نظریاتی اساس ہے اور وہ دیو بندی مسلک کی انتہا پسند تعبیر، جس کی تبلیغ پاکستان میں افغان مہاجر کیمپوں میں اسلامی جماعتیں کرتی رہی ہیں۔ دیو بندی سنی حنفی عقیدے ہی کی ایک شاخ ہے۔ جس کی افغانستان میں باقاعدہ ایک تاریخ ہے۔ لیکن طالبان اس کی جو تشریح کرتے ہیں، ساری اسلامی دنیا اس سے ناآشنا ہے۔

دیو بندی، برطانوی ہندوستان میں منظر پر آئے وہ رجعت پسند نہیں بلکہ مال اندیش تحریک کے طور پر ابھرے، ان کا مقصد ایک نو آبادیاتی ریاست میں، جس پر غیر مسلم حکمران ہوں۔ مسلمان معاشرے کو متحد اور منظم کرنا تھا۔ اس کے نظریاتی رہنماؤں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی 1833۔(77ء) اور رشید احمد گنگوہی (1905ء۔۔ 1829ء)

شامل تھے، انہوں نے دیوبند کے مقام پر مدرسے قائم کیے۔ 1857ء کی جنگ آزادی ہندی مسلمانوں کے لئے ایک حد فاصل ثابت ہوئی۔ مسلمانوں نے ہی برطانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور جنگ آزادی چھیڑی، لیکن اس میں انہیں شکست ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں کئی فلسفیانہ اور دینی رجحانات پیدا ہوئے۔ مقصد انہیں سہارا دینا اور ان میں فکری توانائی پیدا کرنا تھا۔ ان میں ایک طرف اگر دیوبندی تھے تو دوسری جانب مغرب نواز اصلاح پسند تھے۔ جنہوں نے علی گڑھی یونیورسٹی قائم کی۔ یہ یونیورسٹی برطانوی نمونے کی درسگاہ تھی، جس میں اسلام کے ساتھ ساتھ فنون اور سائنسی مضامین کی تدریس کا اہتمام تھا۔ اس کا مقصد مسلمان نوجوانوں کو جدید علوم سے لیس کر کے انگریز حکمرانوں سے مسلمانوں کا فاصلہ کم کرنا اور فروغ پذیر ہندو اشرافیہ کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا تھا۔ ان تمام اصلاح پسندوں کے نزدیک نیا اور جدید مسلمان پیدا کرنے کا واحد وسیلہ تعلیم تھی۔ دیوبندی پڑھے لکھے مسلمانوں کی نئی پود تیار کرنا چاہتے تھے جو فکری بالیدگی، روحانی تجربے، شریعت اور طریقت کی بنیاد پر اسلامی اقتدار کے احیاء کے لئے کام کرسکیں۔ طلباء کو یہ سکھایا جاتا کہ وہ شریعت کی اس طرح تشریح کریں کہ کلاسیکی شرعی نصاب اور دور جدید کے رجحانات میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ دیوبندی عورتوں کے محدود کردار کے مبلغ تھے، انہوں نے مسلم معاشرے میں حسب نسب کی اساس پر تفرق حاصل کرنے کے رجحان کی نفی کی اور شیعہ مسلک کو مسترد کر دیا۔ طالبان نے ان نظریات کو اس انتہا تک پہنچا دیا، جس کا اصل دیوبند سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دیوبندیوں نے پورے ہندوستان میں مدرسے قائم کیے۔ جن میں افغان طلباء نے بھی داخلہ لیا جو خود یہ جاننا چاہتے تھے کہ نو آبادیات کے خلاف اسلام کا کیا موقف ہے اور اس نظام کو کس طرح ختم کیا جائے۔ 1879ء تک ہندوستان میں دیوبندیوں کے بارہ مدرسے تھے، جن میں افغان خاصی بڑی تعداد میں تعلیم پا رہے تھے۔ حالانکہ افغان طلبہ کو غصیل سمجھا جاتا تھا۔ 1967ء میں دیوبند نے اپنی ایک سوویں سالگرہ منائی، اس وقت تک جنوبی

MashalBooks.org

ایشیاء میں 9000 دیوبندی مدرسے موجود تھے۔

بیسویں صدی کے اوائیل میں افغان حکومت نے سرکاری کنٹرول میں جدید مدرسے قائم کرنے کے سلسلے میں دیوبند سے تعاون طلب کیا۔ دیوبند کے مدارس کے علماء 1933ء میں شاہ ظاہر شاہ کی تاجپوشی کے سلسلے میں کابل گئے اور کہا کہ دیوبند ایسے علماء تیار کرے گا، جو زمانے کے بدلے ہوئے حالات میں دنیائے اسلام کی آزاد حکومتوں کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لئے بھرپور تعاون کریں گے اور ریاست کے مخلص اور وفادار کارکن ثابت ہوں گے۔ افغان ریاست نے چند دیوبندی مدرسے قائم کئے، لیکن وہ پشتونوں کے علاقے میں کچھ ایسے مقبول نہیں ہوئے۔

دیوبندی مدرسے پاکستان میں 1947ء کے بعد تیزی سے پھلے پھولے۔ دیوبندیوں نے جمعیت علمائے اسلام قائم کی۔ اس کا بنیادی مقصد دینی عقائد کی ترویج اور مسلمانوں کی تنظیم کرنا تھا۔ 1962ء میں صوبہ سرحد کے مولانا غوث ہزاروی نے جمعیت کو ایک سیاسی پارٹی بنا دیا۔ جس کے بعد جمعیت کے کئی حصے ہو گئے۔ مفتی محمود نے صوبہ سرحد میں جمعیت کی پشتون شاخ کا نظم وانصرام سنبھال لیا اور اسے مقبول عام تنظیم کے طور پر منظّم کیا۔ 1970ء کے انتخابات میں مفتی محمود کی جمعیت علمائے اسلام نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ فوجی حکومت کے خلاف تھے۔ انہوں نے 22 نکاتی اسلامی پروگرام پیش کیا۔ جس میں امریکہ اور سامراج کی شدید مخالفت کی گئی تھی اور معاشرے کی اصلاح کے لئے ایک ترقی پسندانہ سماجی پروگرام تجویز کیا۔ جمعیت علمائے اسلام کی تحریک کا ایک نتیجہ جماعت اسلامی سے اختلاف کو وسیع تر کرنے کی صورت میں نکلا۔ یہ اختلاف آج تک چلا آ رہا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کی تاریخ کا تذکرہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ دیوبندی مسلک کا طالبان پر بنیادی نوعیت کا مذہبی اور نظریاتی اثر مرتب ہوا۔ 1980ء کے عشرے میں پاکستان کی افغان پالیسی پر جماعت اسلامی اور حکمت یار کی

مدد سے عمل ہوتا رہا۔ یہ دونوں جماعتیں پاکستان کے اندر جمعیت علمائے اسلام کی حریف تھیں۔ آئی ایس آئی کا جماعت اسلامی سے تعلق ہی مجاہدین میں امداد کی تقسیم سے متعلق حکمت عملی کا اہم عنصر تھا۔ جمعیت علمائے اسلام کی قیادت مفتی محمود کے بعد ان کے بیٹے مولانا فضل الرحمٰن کے پاس آئی، لیکن انہیں کوئی سیاسی کردار تفویض نہیں کیا گیا۔ افغان مجاہدین میں سے جو گروپ دیوبندی مسلک پر کاربند تھے، انہیں بیشتر صورتوں میں نظر انداز کیا گیا۔

تاہم جمعیت علمائے اسلام نے اس دوران سرحد اور بلوچستان کی پشتون پٹی میں سینکڑوں مدرسے کھول لئے۔ جہاں افغان مہاجروں اور پاکستانیوں کو مفت تعلیم، خوراک، رہائش اور فوجی تربیت دی جاتی ہے۔ یہاں افغانوں کی نئی نسل کو سوویت یونین کے اثر اور حملے کے بعد کے عرصے میں ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بنانے کی سعی کی جاتی رہی۔ دیوبندیوں کو پاکستان میں کوئی سیاسی حمایت حاصل نہیں تھی۔ صدر ضیاء الحق نے بلا امتیاز مسلک وعقیدہ تمام مدرسوں کی مالی امداد کی۔ 1971ء میں پاکستان میں صرف نوسو مدرسے تھے، لیکن 1988ء میں ضیاء کا دور ختم ہونے تک ان کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ 25 ہزار ایسے مدرسے تھے جن کی رجسٹریشن نہیں ہوئی تھی۔ ان سب میں پانچ لاکھ طلباء تعلیم پا رہے تھے۔ پاکستان میں حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے سکول تو بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے۔ چنانچہ غریب لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے دینی مدرسوں کی طرف رجوع کرنے لگے۔

زیادہ تر مدرسے دیہی علاقوں میں یا افغان مہاجر کیمپوں میں تھے، انہیں نیم پڑھے لکھے ملا چلا رہے تھے۔ ان میں اکثر وہ تھے جنہیں اصل دیو بندی اصلاحی ایجنڈے کا بہت کم علم تھا وہ شریعت کی تعبیر وتشریح، پشتونوں کے قبائلی ضابطوں کی روشنی میں کرتے۔ ان مدرسوں اور جماعتوں کو سعودی عرب سے مالی امداد ملتی، جو دیوبندی مسلک سے اتفاق رکھتے تھے۔ ان مدرسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کی اکثریت

سوویت یونین کے خلاف جہاد کرنے والوں سے خوش نہیں تھی۔ 1992ء میں کابل پر مجاہدین کا قبضہ ہونے کے بعد بھی آئی ایس آئی نے جنوبی پشتونوں پر جمعیت علماء اسلام کے روز افزوں اثر کو نظر انداز کئے رکھا۔ جمعیت ملک کے اندر بڑی حد تک سیاسی طور پر تنہا رہی، اس نے 1988۔90ء کے دوران جب بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت برسر اقتدار آئی، حزب مخالف کا کردار ادا کیا۔ نواز شریف کی پہلی حکومت 1990۔(93ء) کے دوران میں بھی اس کا یہی کردار رہا۔

1993ء کے انتخابات میں جمعیت علمائے اسلام نے بے نظیر بھٹو کی قیادت میں کامیاب ہونے والی پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا اور یوں مخلوط حکومت کا حصہ بن گئی۔ اقتدار سے وابستگی کی بنا پر اس نے فوج، آئی ایس آئی اور وزارت داخلہ سے جس کا قلمدان جنرل نصیراللہ بابر کے پاس تھا، تعلقات قائم کر لئے۔ بابر ایک نئے پشتون گروپ کی تلاش میں تھے، جو افغانستان میں پشتونوں کے اثرات و مفادات کا احیاء کر سکے اور پاکستانی تاجروں کے لئے جنوبی افغانستان کے راستے وسطی ایشیاء سے تجارت کا وسیلہ بن سکے۔ جمعیت نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا۔ جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا فضل الرحمٰن قومی اسمبلی کی سٹینڈنگ کمیٹی برائے امور خارجہ کے چیئر مین بنا دیئے گئے۔ اس حیثیت میں انہیں پہلی بار خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے کا موقع ملا۔ اسی حیثیت میں انہوں نے طالبان کے حق میں بات کرنے کی غرض سے واشنگٹن اور یورپی ملکوں کے دارالحکومتوں کا دورہ کیا اور ان کے لئے مالی امداد کے حصول کے لئے سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں سے مذاکرات کئے۔ مرکزی قیادت کے فقدان یا مدرسے کے اجراء کے لئے کسی مقامی طور پر معروف یا عالم فاضل ملا کی عدم موجودگی کے سبب سے دیو بندی روایت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمعیت علمائے اسلام کی صفوں سے انتہا پسند گروہ نکلنے لگے۔ جمعیت کی کئی شاخیں بن گئیں۔ ایک ایسی اہم اور قابل ذکر شاخ وہ ہے جس کے رہنما مولانا سمیع الحق ہیں۔ وہ قومی اسمبلی کے رکن اور سینٹر رہے ہیں، ان کا مدرسہ طالبان کی

قیادت کی تربیت کا اہم مرکز بن گیا۔ 1999ء میں کابل میں آٹھ وزراء مولانا سمیع الحق کے دارالعلوم حقانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ طالبان کے درجنوں صوبائی گورنر، فوجی کمانڈر، جج اور بیوروکریٹ بھی اسی مدرسے سے پڑھ لکھ کر نکلے تھے۔ مجاہدین کی روایتی جماعتوں کے لیڈر یونس خالص اور محمد نبی محمدی نے بھی مدرسہ حقانیہ سے ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ مدرسہ اکوڑہ خٹک (صوبہ سرحد) میں ہے۔ اسلام آباد پشاور شاہراہ پر اس مدرسے کی عمارات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں 15 سو طلباء کے لئے بورڈ تک سکول ہے۔ اس کے ہائی سکول میں طلباء کی تعداد ایک ہزار ہے۔ بارہ چھوٹے مدرسوں کا اس سے الحاق ہے۔ یہ مدرسہ مولانا سمعیع الحق کے والد مولانا عبدالحق نے جو دیوبند میں پڑھاتے رہے تھے قائم کیا تھا۔

مدرسہ حقانیہ میں اسلامیات کا اعلیٰ ترین کورس آٹھ برس کا ہے۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کے لئے دو سال لگتے ہیں۔ مدرسے کے اخراجات لوگوں کے عطیات سے پورے کئے جاتے ہیں۔ طلباء سے کوئی فیس یا کسی قسم کی مالی امداد نہیں لی جاتی۔

فروری 1999ء میں مدرسے میں داخلے کے لئے 15 ہزار درخواستیں آئیں، جبکہ صرف 400 نشستیں خالی تھیں، جنہیں پر کرنا تھا۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدرسہ کتنا مقبول ہے۔ 1991ء سے مدرسے میں تاجکستان، ازبکستان اور قازقستان سے ساٹھ طلباء لئے جاتے رہیں۔ ان کا تعلق بالعموم ان ملکوں کی اسلامی حزب اختلاف سے ہوتا تھا۔ وہ پاسپورٹ، ویزے کے بغیر ہی پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ مولانا سمیع الحق ایک پرہیزگار لیکن خوش مزاج شخص ہیں، ان کی حس مزاح بڑی تیز ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مدرسے میں افغان طلباء کے لئے 400 نشستیں ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ آئی ایس آئی نے انہیں اتنے طویل عرصے تک نظر انداز کئے رکھا ہے۔ آئی ایس آئی نے ہمیشہ حکمت یار اور قاضی حسین احمد (امیر جماعت اسلامی) کی حمایت کی ہے جبکہ پشتون علاقوں میں روسیوں کے خلاف لڑنے والے 80 فیصد کمانڈر مدرسہ حقانیہ

سے پڑھ کر نکلے ہیں۔ ہم ان کے دفتر میں ایک کھردری سی چٹائی پر بیٹھے تھے اور کئی باریش طلباء داخلے کے لئے درخواستیں لئے آس پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ حکمت یار کو صرف 5 فیصد عوامی حمایت حاصل ہے جبکہ آئی ایس آئی کی 90 فیصد فوجی امداد بھی اس کو ملتی ہے۔ ہمیں کسی نے کبھی تسلیم ہی نہیں کی۔ طالبان کے آنے کے بعد افغانستان کی عوام کی تمام تر حمایت ہماری گود میں آ پڑی ہے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ 1994ء سے پہلے میں ملا عمر کو نہیں جانتا تھا کیونکہ وہ پاکستان میں نہیں پڑھا۔ لیکن اس کے گرد جتنے بھی لوگ ہیں وہ حقانیہ کے طلباء ہیں وہ مجھے ملتے اور پوچھتے ہیں کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ وہ اکثر آتے رہتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ وہ کوئی جماعت نہ بنائیں۔ کیونکہ آئی ایس آئی مجاہدین کی ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑاتی رہتی ہے تاکہ وہ باہم بٹے رہیں، متحد نہ ہو سکیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ طلباء کی تحریک شروع کریں۔ جب طالبان کی تحریک شروع ہوئی تو میں نے آئی ایس آئی سے کہا کہ طلباء کو افغانستان کا کنٹرول سنبھال لینے دو۔ مولانا سمیع الحق ملا عمر کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ 1996ء میں جب میں قندھار گیا تو میری ملاقات ملا عمر سے ہوئی، مجھے ان کے امیر المومنین چنے جانے پر فخر ہے۔ ان کے پاس کوئی روپیہ پیسہ نہیں، نہ ان کا کوئی قبیلہ ہے، نہ کوئی حسب نسب ہے لیکن دوسروں سے زیادہ محترم ہیں۔ اس لئے اللہ نے انہیں قیادت دی ہے۔ اسلام کی رو سے جو شخص امن قائم کر سکتا ہے، امیر چنا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں اسلامی انقلاب آیا تو میری طرح کے از کار رفتہ لیڈروں کے ذریعے نہیں بلکہ عوام میں سے ایسے ہی نامعلوم شخص کے ذریعے آئے گا۔

مولانا سمیع الحق کا ملا عمر سے مسلسل رابطہ ہے۔ یہ بین الاقوامی معاملات طے کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں اور اہم شرعی فیصلوں کے سلسلے میں انہیں مشورے دیتے ہیں۔ مولانا سمیع الحق طالبان کے لئے پاکستانی لباب بھرتی کرنے کے بھی اہم منتظم ہیں۔ 1997ء میں مزار شریف میں طالبان کی شکست کے بعد انہیں ملا عمر کا فون آیا کہ ان کی

MashalBooks.org

مدد کریں۔ مولانا سمیع الحق نے اپنا مدرسہ بند کر دیا اور تمام طلباء کو طالبان کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لئے بھیج دیا۔ 1988ء میں مزار شریف کے لئے جنگ کے بعد مولانا سمیع الحق نے طالبان لیڈروں اور صوبہ سرحد کے بارہ مدرسوں کے درمیان طالبان کے لئے کمک کا انتظام کرنے کے بارے میں ملاقات کرائی۔ تمام مدرسوں کو ایک ماہ کے لئے بند کرنے اور 8 ہزار طلباء کو افغانستان بھیجنے پر اتفاق ہو گیا۔ طالبان کو پاکستان کے دیوبندی مدرسوں سے حکومت اور انٹیلی جینس ایجنسوں سے یکسر الگ بہت اہم مدد ملتی ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کی ایک اور شاخ نے کراچی کے مضافات میں بنوری ٹاؤن میں علوم اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ مولوی محمد یوسف بنوری مرحوم اس کے بانی تھے۔ اس میں آٹھ ہزار طلباء تعلیم پا رہے ہیں۔ ان میں سینکڑوں افغان بھی شامل ہیں۔ طالبان کے متعدد وزراء یہیں سے پڑھ کر گئے ہیں۔ 45 ملکوں کے مسلمان اس مدرسے کے لئے عطیات دیتے ہیں۔ مدرسے کے استاد مفتی جمیل نے کہا کہ ''ہمیں جو عطیات ملتے ہیں، وہ سب اللہ کی دین ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم طالبان کو پڑھاتے ہیں، ان کی تربیت کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں۔ انہوں نے اسلامی قوانین سختی سے نافذ کر دیئے ہیں''۔ بنوری مدرسے نے 1997ء میں 600 طلباء کو طالبان کا ساتھ دینے کے لئے بھیجا، نومبر 1997ء میں تین اساتذہ کے قتل ہو جانے پر بنوری مدرسے کے طلباء آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کا پولیس سے تصادم ہو گیا اور انہوں نے کئی گاڑیاں اور ویڈیو کی دکانیں توڑ پھوڑ دیں۔ فوٹو گرافروں کو مارا پیٹا، یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان کے سب سے بڑے کاسمو پولیٹن شہر نے طالبان جیسی بے چینی کا نظارہ اور سامنا کیا۔

جمعیت علمائے اسلام کی ایک شاخ سپاہ صحابہ ہے۔ یہ پاکستان میں شیعوں کی سب سے بڑی مخالف تنظیم ہے۔ طالبان اس کی حمایت کرتے ہیں۔ 1998ء میں جب

حکومت نے سینکڑوں شیعوں کے قتل کے بعد سپاہ صحابہ کے ارکان کی پکڑ دھکڑ شروع کی تو اس کے رہنما بھاگ کر کابل چلے گئے۔ جہاں طالبان اور اسامہ بن لادن نے انہیں پناہ دی۔ سپاہ صحابہ کے سینکڑوں پرجوش کارکنوں کو خوست کے تربیتی کیمپ میں تربیت دی گئی۔ یہ کیمپ طالبان اور اسامہ بن لادن نے قائم کر رکھا ہے، امریکہ نے 1998ء میں اس پر کروز مزائیلوں سے حملہ کیا تھا۔ جمعیت کے ہزاروں کارکن طالبان کے ساتھ مل کر جنگ کرتے رہے ہیں۔

جمعیت علمائے اسلام کو طالبان سے بے پناہ فائدہ پہنچا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسلامی انقلاب کے داعی کے طور پر بین الاقوامی سطح پر جمعیت کے وقار اور اثر میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد پاکستانی حکومتوں اور آئی ایس آئی کے لئے جمعیت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں بھی اس کا اثر پڑا۔ افغانستان میں قائم کیمپ جن میں غیر افغان مجاہدین پناہ بھی لیتے اور تربیت بھی حاصل کرتے ہیں، پہلے حکمت یار کی تحویل میں تھے، طالبان نے مل کر ان پر قبضہ کر لیا اور جمعیت علمائے اسلام کے گروپوں کے حوالے کرایا۔ 6991ء میں طالبان نے خوست کے قریب پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر بدر کیمپ، حرکت الانصار کے سپرد کر دیا۔ فضل الرحمٰن خلیل اس کے رہنما ہیں۔ یہ بھی جمعیت علمائے اسلام ہی کی شاخ ہے اور انتہا پسندی میں اپنا نام رکھتی ہے۔ اس نے اپنے ارکان، افغانستان، کشمیر، چیچنیا اور بوسینا تک میں لڑنے کے لئے بھیجے، دو سال بعد امریکہ نے اس کیمپ پر کروز مزائیلوں سے حملہ کیا تھا۔

طالبان اور بعض انتہا پسند پاکستانی دیوبندی گروپوں کے درمیان تعلقات بہت مضبوط ہیں، کیونکہ نظری اعتبار سے وہ ایک ہی سطح پر ہیں۔ سرحد سے دونوں طرف کے دیوبندی لیڈر قندھار اور پاکستان میں چمن کے گرد بسنے والے درانی پٹھانوں میں سے ہیں۔ دیوبندی روایت یہ ہے کہ اس مسلک پر کاربند افراد قبائلی اور جاگیردارانہ نسبتوں کے خلاف ہیں۔ اس کا اثر ہے کہ طالبان کو قبائلی ڈھانچے اور خاندانی سربراہوں پر کوئی

اعتماد نہیں، چنانچہ انہیں قائدانہ کردار سے محروم کر دیا گیا ہے۔ دونوں ہی شیعہ فرقے اور ایران کے سخت خلاف ہیں۔ اب پاکستانی دیوبندی پاکستان میں طالبان کی طرز کا انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

طالبان نے تعلیم اور اصلاح کے متعلق دیوبندی روایت کو صاف طور پر ترک کر دیا ہے۔ انہیں اپنے عقائد میں کسی قسم کی نرمی یا ترمیم کرنا گوارا نہیں، وہ کوئی ایسی بات ماننے کے لئے تیار نہیں جس کے بارے میں انہیں رائی برابر بھی شک ہو، وہ اسے گناہ سمجھتے ہیں۔ بحث مباحثے کو سنی سنائی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں، انہوں نے ایک نیا اور علاقے کی حکومتوں کے لئے انتہائی خطرناک اسلامی انقلاب کا نمونہ پیش کیا ہے۔ حکمت یار اور مسعود جدیدیت کے خلاف نہیں، ان کے مقابلے میں طالبان جدیدیت کے سخت خلاف ہیں، وہ ترقی یا اقتصادی تعمیر سے متعلق جدید نظریات کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

طالبان نے اسلامی اور افغان تاریخ کا سرسری سا مطالعہ کیا ہے۔ شریعت اور قرآن کے بارے میں بھی ان کے علم کا یہی حال ہے۔ بیسویں صدی میں اسلامی دنیا میں جو سیاسی اور نظریاتی ترقی ہوئی، وہ اس سے بھی نابلد ہیں۔ جبکہ بیسویں صدی میں اسلامی جدیدیت کی طویل تاریخ ہے کہ اس ضمن میں بڑی عالمانہ اور منفرد تصنیفات نظر آتی ہیں اور بڑے فکر انگیز مباحث کا سلسلہ قائم ہوا ہے۔ طالبان کے ہاں ایسا کوئی تاریخی وقوف یا روایت نہیں۔ ان کا کوئی اسلامی منشور نہیں، اسلامی اور افغان تاریخ کا کوئی عالمانہ تجزیہ بھی نہیں۔ دنیا میں علمی سطح پر اسلام کے حوالے سے جو مباحث ہو رہے ہیں، وہ ان سے بھی آشنا نہیں۔ خود اپنی تاریخ کے بارے میں ان کا علم اور بھی کم ہے۔ اس کے نتیجے میں ایسی جہالت اور تنگ نظری پیدا ہوئی ہے جس میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بھی بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔

طالبان کے نئی طرز کے خالص اور مصفا اسلامی انقلاب نے پاکستان میں اور محدود

پیمانے پر وسط ایشیائی جمہوریتوں میں منفی اثرات اور رجحانات پیدا کیے ہیں۔ پاکستان جو پہلے ہی شناخت کے بحران، اقتصادی بدحالی، نسلی اور فرقہ وارانہ اختلافات میں گھرا ہوا ہے اور جب کہ حکمران اچھی حکومت اور انتظامیہ مہیا کرنے میں ناکام رہے ہیں اب اسے ایک نئی اسلامی لہر کا سامنا ہے، جو پرانی زیادہ بالغ نظر اور جذبہ وقبول کی صلاحیت سے بہرہ ور جماعتوں نے نہیں بلکہ نئے طالبان گروہوں نے اٹھائی ہے۔

1998ء تک پاکستانی طالبان پشتون پٹی کے ساتھ کے شہروں میں ٹی وی اور ویڈیو پر پابندی لگانے پر موقوف رہے۔ قانونی نظام، شرعی سزائیں (سنگساری، اعضاء کاٹنے) رائج کرنے، شیعوں کو قتل کرنے اور لوگوں بالخصوص عورتوں کو طالبان کا تجویز کردہ لباس پہننے اور انہی کا طرز زندگی اپنانے پر اصرار کر رہے تھے۔ پاکستان کی طرف سے طالبان کی حمایت، خود پاکستان کو ڈرانے اور آزمائش میں ڈالنے کا سبب بن گئی ہے۔ اس کے باوجود پاکستانی لیڈر درپیش چیلنج سے نظریں چرا رہے ہیں اور طالبان کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ادھر وسطی ایشیاء خاص طور پر تاجکستان اور ازبکستان کی فرغانہ وادی میں جو دونوں ملکوں کی سرحد پر ہے۔ پولیس طالبان کا پیچھا کر رہی ہے۔

طالبان اور ان کے حامی اسلامی دنیا اور مغرب کو ایک نئی قسم کی اسلامی انتہا پسندی سے روشناس کرا رہے ہیں۔ جس میں اعتدال کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ طالبان کی طرف سے اقوام متحدہ کی انسانی بہبود کے لئے کام کرنے والے اداروں اور ایجنسیوں یا امداد دینے والے بیرونی ممالک کے ساتھ مصالحت کرنے اور بین الاقوامی سطح پر تسلیم کئے جانے کے لئے اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنے سے انکار اور تمام مسلم حکمرانوں کو بدعنوان قرار دے کر مسترد کرنے پر اسلامی دنیا میں بحث کے دروازے کھول دیے ہیں۔ طالبان نے اسلامی بنیاد پرستی کو نئی صدی کے لئے نیا چہرہ اور نئی شناخت دی ہے جو اپنے سوا کسی سیاسی نظام کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں، وہ ہر نوع کی مصالحت کو مسترد کرتے ہیں۔

طالبان کی سیاسی اور فوجی تنظیم

عام افغانوں کو طالبان کے سامنے آنے سے پہلے امن کی امید تھی، کیونکہ اس وقت ان پر اجتماعی سیاسی لیڈر شپ حکمران تھی، جو مشاورت پر اور ہم خیالی پیدا کرنے پر یقین رکھتی تھی، کسی ایک طرف کا اجارہ یا غلبہ نہیں تھا۔ قندھار میں طالبان شوری کا دعویٰ ہے کہ وہ ابتدائی اسلامی مثال کی پیروی کر رہے ہیں۔ جہاں بحث کے بعد اہل ایمان میں ہم خیالی اور یک نظری پیدا ہوتی اور پھر عام لوگوں تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ طالبان شوریٰ، پشتون قبائلی جرگے کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ جرگے میں تمام خاندانوں کے سربراہ مل بیٹھ کر درپیش مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں میں جب پہلے پہل قندھار گیا تو مسائل پر بحث سے متاثر ہوا۔ بحث جو ساری رات جاری رہی۔ اس میں کمانڈروں، ملاؤں اور عام سپاہیوں سے رائے لی جاتی، اس کے بعد ملا عمر اپنا فیصلہ سناتے۔

اکثر افغان بھی اس حقیقت سے متاثر تھے کہ طالبان اپنے لئے طاقت کے طالب نہیں، ان کا اصرار تھا کہ وہ امن و قانون بحالی کر رہے ہیں تا کہ اچھے مسلمانوں پر مشتمل حکومت کو اقتدار اور اختیار سونپا جا سکے۔ 1994ء اور 1996ء کے درمیان جب کابل پر قبضہ ہوا طالبان کا فیصلہ کرنے کا طریقہ بدل گیا۔ اس میں مرکزیت آ گئی۔ رازداری سے کام لیا جانے لگا۔ آمرانہ احکام صادر ہونے لگے اور اصحاب اختیار تک رسائی ممکن نہ رہی۔ ملا عمر زیادہ طاقتور اور خود بین ہو گئے۔ باقی کے ملک کو دیکھنے اور سمجھنے اور لوگوں سے بات چیت کے لئے سفر پر جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تحریک کے اقتداری ڈھانچے میں وہ تمام خامیاں پیدا ہو گئی ہیں جو پیش رو مجاہدین اور کمیونسٹوں میں تھیں۔

MashalBooks.org

1996ء کے بعد طالبان نے اپنی اس خواہش کا برملا اظہار کر دیا کہ وہ دوسرے گروہوں کو شامل کیئے بغیر افغانستان کے اکیلے حکمران ہوں گے، ان کا موقف یہ ہے کہ ملک کی تنوع نسلوں کو طالبان تحریک میں نمائندگی حاصل ہے اور وہ یہ ثابت کرنے کے لئے باقی ماندہ ملک کو فتح کریں گے۔

طالبان نے ابتداء میں جو امیدیں دلائیں، وہ سابق مجاہدین کی لیڈرشپ کے بکھر جانے کا نتیجہ تھیں۔ جہاد کے دوران، مجاہدین کی لیڈرشپ، جس کا مرکز پشاور میں تھا، گروہ بندی کا بھی شکار تھی اور انفرادیت پسندی کا بھی۔ جماعتوں کو بندروں کے کرشماتی اثر نے اکٹھا رکھا ہوا تھا۔ کسی تنظیم کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جیسے جیسے جنگ تیز ہوتی اور پھیلتی گئی ان لیڈروں کا مغرب کی فوجی اور مالی امداد پر انحصار بڑھتا گیا۔ اسی مدد کے ذریعے وہ میدان جنگ میں لڑنے والے کمانڈروں اور گوریلوں کو اپنا وفادار بنائے رکھتے۔ وہ اپنا زیادہ وقت افغانستان کے اندر حمایت حاصل کرنے میں صرف کرتے۔ پشاور میں وہ ایک دوسرے کے خلاف شکوہ شکایت کرتے رہتے۔

پاکستان اس اختلاف کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہا۔ جنرل ضیاء الحق نے 1970ء میں اردن میں پاکستانی فوج کی کمان کی اور فلسطینیوں کو کچلنے میں شاہ حسین کی مدد کی۔ انہوں نے پہلے ہی بھانپ لیا کہ ایک متحدہ گوریلا تحریک، اس ملک کے لئے، جہاں اسے پناہ ملتی ہے، اس لئے خطرہ بن جایا کرتی ہے۔ کسی ایک لیڈر کے بغیر تحریک کو غیر متحد رکھ کر جنرل ضیاء الحق مجاہدین لیڈروں کو پاکستان اور مغرب کا ممنون احسان رکھنے میں کامیاب رہے۔ لیکن 1989ء میں سوویت فوج کے انخلا کے بعد کابل کی کمیونسٹ حکومت اور دوبارہ 1992ء میں نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمے پر سیاسی متبادل کی ضرورت پیش آئی تو مجاہدین کی لیڈرشپ اسے پورا کرنے میں ناکام رہی۔ پشاور میں مقیم مجاہدین لیڈروں کا اختلاف اتنا شدید تھا کہ اسے دور کرنا ممکن نہیں تھا۔ بھاری رشوت بھی کام نہ کر سکی۔ افغان لیڈر کا آپس میں باہمی اختلاف، افغانستان کے

مستقبل پر اسی حوالے سے گہرا اثر ہوا کہ ایک متفقہ حکومت کا قیام ممکن نہ ہو سکا۔ سوویت مخالف مزاحمتی لیڈر شپ کے باہمی اختلافات نے مجاہد کمانڈروں کو سخت مایوس اور بددل کیا۔ پشاور میں رہنے والے افغان لیڈروں کو مالی اور فوجی امداد دے کر ہم نوا بنانے کی جو روایت قائم ہوگئی تھی، کمانڈروں کو اس پر اعتراض تھا، جنگ کی نوعیت اور سختی کا تقاضا تھا کہ اس کے افغان لیڈر اپنے اختلافات دور کرتے اور باہم اتحاد کرتے، فیلڈ کمانڈروں میں بھی قریبی اتحاد اور تعاون کی ضرورت تھی۔

اسماعیل خان نے جولائی 1987ء میں صوبہ غور میں فیلڈ کمانڈروں کے پہلے اجلاس کا اہتمام کیا۔ اس میں بارہ سو کے لگ بھگ کمانڈر شریک ہوئے۔ وہ ملک کے ہر حصے سے آئے تھے، اس لحاظ سے یہ کمانڈروں کا نمائندہ اجلاس تھا۔ جس میں 20 قراردادیں منظور ہوئیں۔ جس میں سب سے اہم قرارداد وہ تھی جس میں طے کیا گیا تھا کہ افغانستان میں سیاسی تحریک چلانے اور اس کی رہنمائی کرنے کا اصل اختیار پشاور میں موجود لیڈروں کو نہیں بلکہ میدان جنگ میں لڑنے والے مجاہدین کو ہونا چاہیے۔ افغانستان کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق شہدا کے ورثا اور ان مسلمانوں کو ہے جو خندقوں میں داد شجاعت دے رہے ہیں، وہ جام شہادت نوش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کسی اور کو قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں، جولائی 1990ء کو 300 کمانڈر صوبہ پکتیا اور اکتوبر میں بدخشاں میں اکٹھے ہوئے لیکن نسلی اور ذاتی عداوتیں اور کابل میں سب سے پہلے داخل ہونے کی خواہش کے باعث کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا، دونوں اجلاس لا حاصل رہے۔ 1992ء میں دارالحکومت پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں مجاہدین میں جو مقابلہ ہوا، اس کے باعث جنوب اور شمال، پشتون اور غیر پشتون کی باہمی تقسیم کو عیاں کر دیا۔ احمد شاہ مسعود نے اگرچہ 1992ء میں کابل پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن وہ پشتون کمانڈروں سے مصالحت نہ کر سکا۔ اس سے اس کی سیاسی شہرت خاصی کم ہوگئی، وہ دوبارہ پشتونوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکا، حتیٰ کہ طالبان نے 1998ء میں شمالی

افغانستان بھی فتح کر لیا۔

مزاحمتی تحریک کی لیڈر شپ کا ایک تیسرا درجہ بھی تھا، جس میں وہ علماء، دانشور، تاجر، ٹیکنو کریٹس شامل تھے جو کابل سے نکل کر پشاور آ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر نے آزادانہ روش اپنائے رکھی۔ ان کا مزاحمتی تحریک میں شامل تمام عناصر سے مطالبہ تھا کہ وہ باہمی اختلافات ختم کر کے متحد ہو جائیں۔ لیکن ان پڑھے لکھے افغانوں کو پشاور کی جماعتوں نے کوئی اہمیت نہ دی اور نہ پاکستان نے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بیشتر پشاور چھوڑ کر غیر ممالک میں جا بسے، اس سے اہل ہنر کو بڑی مایوسی ہوئی، وہ ملک میں سیاسی حالات پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ 1992ء کے بعد جب ملک کی تعمیر نو کا مرحلہ آیا تو ان اصحاب علم وفن کی خدمات حاصل کرنا ممکن نہ ہوا۔ پشتون علماء اور مدرسوں کے اساتذہ، پوری مزاحمتی تحریک میں بکھرے ہوئے تھے، کہیں وہ کمانڈر تھے اور کہیں جماعتوں کے لیڈر تھے، لیکن وہ متحدہ اور طاقتور حیثیت حاصل نہ کر سکے جو تحریک میں اپنا اثر دکھاتی۔ 1992ء تک انفرادی طور پر بھی ان کے اثر میں نمایاں کمی ہو گئی۔ علماء طالبان کی طرز کی تحریک کے لئے کشش رکھتے تھے۔

1994ء میں جب طالبان سامنے آئے تو پرانی باہمی جھگڑوں میں الجھی ہوئی لیڈر شپ باقی رہ گئی تھی۔ جسے صدر برہان الدین ربانی متحد کرنے میں ناکام رہے۔ پشتون علاقوں میں لیڈر شپ کا مکمل خلا تھا۔ طالبان نے بجا طور پر سابق مجاہدین لیڈروں کو از کار رفتہ اور بدعنوان قرار دیا۔ طالبان اگرچہ بعض علماء کا لحاظ پاس کرتے کیونکہ وہ کبھی ان سے فیضاب ہوئے تھے لیکن طالبان نے انہیں کبھی اپنی تحریک میں کوئی سیاسی کردار نہیں دیا۔ طالبان آزاد روفیلڈ کے کمانڈروں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ 1992ء میں پشتونوں کو جو زک اٹھانا پڑی، اس کی ذمہ داری ان کمانڈروں پر آتی تھی، جن کمانڈروں نے طالبان کے سامنے ہتھیار ڈالے اور ہار مانی انہیں بھی طالبان نے اپنی فوجی تنظیم میں کوئی مقام یا رتبہ نہیں دیا۔ طالبان نے افغان دانشوروں اور ٹیکنو کریٹس کو

MashalBooks.org

بھی کلیتاً مسترد کر دیا، اس لئے کہ انہوں نے مغربی اور سوویت نظام تعلیم کے تحت علم حاصل کیا تھا۔ طالبان اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ طالبان جب منظر پر آئے تو اس وقت سوویت یونین اور کمیونسٹ اقتدار کا ڈھانچہ بکھر چکا تھا۔ مجاہدین لیڈر اپنی توقیر اور اہمیت کھو چکے تھے اور روایتی قبائلی لیڈرشپ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ طالبان کے لئے بچی کھچی پشتون لیڈرشپ کا صفایا کرنا آسان ہو گیا تھا۔ طالبان کو پشتونوں کی طرف سے کسی سیاسی چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اب انہیں قبائلی جمہوری اور عام لوگوں کی سطح پر تنظیم قائم کرنے کا موقعہ میسر تھا، وہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق عوام کی ضروریات پوری کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے، شاید وہ چاہتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے کوئی ایسا نظام قائم کرنے سے انکار کر دیا، جس میں غیر پشتون نسلی قبیلوں کے نمائندوں کو شامل کیا جا سکتا۔ پشتون علاقوں میں ان کی برتر حیثیت میں اس وقت تک مزید اضافہ ممکن نہیں جب تک مختلف النوع قوم کو ایک نئی طرز کی اجتماعی قیادت کے تحت متحد نہیں کیا جاتا۔ طالبان نے کیا یہ کہ ایک خفیہ سوسائٹی تشکیل دے لی، جسے قندھاری رازداری، اخفاء اور آمرانہ انداز سے چلاتے، بالکل اسی طرح جیسے کھمیر وج کمبوڈیا میں اور صدام حسین عراق میں چلاتے آئے ہیں۔

طالبان کی بنیادی اعلیٰ شوریٰ قندھار میں ہی رہی۔ ملا عمر 1996ء میں کابل جانے کے لئے پہلی بار اس شہر سے باہر گئے۔ انہوں نے قندھار کو ہی طالبان اور افغانستان کے اقتدار کا مرکز قرار دے لیا ہے۔ شوریٰ میں اکثریت ملا عمر کے اصل دوستوں اور حامیوں کی ہے، یہ سب درانی پشتون ہیں جو تین صوبوں قندھار، ہلمند اور عروض گان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن قندھاری کہلاتے ہیں۔ ابتدائی شوریٰ دس ارکان پر مشتمل تھی۔ تاہم فوجی کمانڈر، قبائلی سردار اور علماء شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کرتے، بعض اوقات اجلاس کے شرکا کی تعداد پچاس سے بڑھ جاتی۔ اس شوریٰ کے دس ارکان میں سے چھ درانی پشتون اور بدخشاں سے ایک تاجک مولوی سید غیاث الدین تھے، وہ طویل عرصے

سے پشتون پٹی میں رہتے چلے آ رہے تھے۔ جب تک طالبان پشتون علاقے میں پیش قدمی کر رہے تھے، شوریٰ کی ہی ہیت ترکیبی کافی سمجھی گئی۔لیکن ہرات اور کابل پر قبضہ ہو جانے کے بعد شوریٰ یکسر غیر نمائندہ ہو گئی۔ قندھاری شوریٰ نے اپنی اساس کو کبھی وسعت نہیں دی کہ غلزئی پٹھانوں سے غیر پٹھانوں کو اس میں نمائندگی مل جاتی، یہ ہمیشہ سے محدود رہی ہے۔ پوری قوم کی نمائندگی نہیں کر سکی۔ کابل کی شوریٰ جو قائم مقام وزراء پر مشتمل ہے اور فوجی شوریٰ دونوں ہی قندھاری شوریٰ کو اپنی رپورٹیں بھجواتی رہی ہیں۔ 1998ء میں کابل کی شوریٰ 17 ارکان میں سے آٹھ درانی تھے، پشتونوں کی تعداد دس تھی۔ تین غلزئی اور دو پٹھان ہیں۔ کابل شوری روزمرہ کے سرکاری مسائل نمٹاتی رہتی ہے، ان میں فوجی اور شہری مسائل بھی شامل ہوتے ہیں۔ اہم مسائل قندھار شوریٰ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، وہیں اصل فیصلے ہوتے ہیں۔ کابل شوریٰ اور اس کے سربراہ ملا محمد ربانی کے چھوٹے چھوٹے فیصلے بھی مثلاً صحافیوں کو سفر کی اجازت اور اقوام متحدہ کے منصوبوں کی منظوری ایسے مسئلے بھی قندھار شوریٰ کو بھجوائے جاتے ہیں۔ کابل شوریٰ کے لئے قندھار شوریٰ کی تائید اور توثیق حاصل کرنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ قندھار شعوریٰ کئی فیصلوں کو مسترد کر دیتی ہے۔ کابل شوریٰ کے لئے جو حکومت افغانستان کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ قندھار شوریٰ سے طولانی مشاورت کے بغیر کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ فیصلے کرانے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔

کابل ہرات اور مزار شریف میں جہاں پشتون اکثریت میں نہیں، طالبان کے نمائندے مثلاً گورنر، میئر، پولیس کے اعلیٰ افسر اور دوسرے سینئر منتظمین اکثر و بیشتر صورتوں میں قندھاری پشتون میں وہ مقامی بولی دری نہ سمجھتے ہیں اور نہ بولتے ہیں یا پھر نہایت ٹوٹی پھوٹی زبان بولتے ہیں۔ کسی بھی مقامی شوریٰ میں کوئی اہم شہری شامل نہیں۔ البتہ طالبان نے صوبائی گورنروں کے تقرر میں قدرے لچکدار رویہ اپنایا ہے۔ 1998ء میں گیارہ گورنروں میں سے صرف 4 قندھاری تھے۔ ماضی میں گورنر اور سینئر افسر بالعموم

مقامی معززین میں سے لئے جاتے تھے اور یوں مختلف نسلوں کی نمائندگی کی صورت بیدار ہو جایا کرتی تھی۔ طالبان نے یہ روایت ختم کر دی اور تمام اہم عہدوں پر باہر کے لوگ متعین کرنے شروع کر دیئے۔ تاہم طالبان گورنروں کے اختیارات بڑی حد تک کم کر دیئے گئے۔ گورنروں کے مالی وسائل محدود تھے۔ وہ اہم اقتصادی ترقیاتی کام کرنے، پاکستان اور ایران سے واپس آنے والے مہاجروں کو بسانے کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر اقتصادی، سیاسی اور سماجی کردار ادا کرنے کے اہل نہیں تھے۔ ملا عمر نے گورنروں کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ انہیں مقامی طور پر بااختیار ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ کیا جاتا اور بعض اوقات انہیں کمانڈر کی حیثیت سے میدان جنگ میں بھیج دیا جاتا۔

1997ء میں مزار شریف کی شکست کے بعد غلزئی پشتون کمانڈروں کی طرف سے تنقید کی جانے لگی کہ اس امر کے باوجود کہ فوج میں ان کی افرادی قوت زیادہ ہے، ان سے فوجی، سیاسی مسائل پر مشورہ نہیں لیا جاتا۔ طالبان کے مزار شریف میں تین ہزار بہترین فوجی ہلاک ہو گئے تھے۔ تین ہزار قیدی بنا لئے گئے تھے۔ دس کمانڈر ہلاک ہو گئے یا پکڑے گئے تھے، اس کے بعد طالبان مشرقی افغانستان کے غلزئی قبائیل سے نبتے افراد بھرتی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تاہم انہیں سیاسی اختیار یا قندھار شوریٰ میں نمائندگی دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ غلزئی اس سلوک سے بددل ہو کر فوج میں بھرتی ہونے سے احتراز کرنے لگے۔

طالبان کے فوجی ڈھانچے پر راز و اخفاء کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ملا عمر فوجوں کے سربراہ ہیں، لیکن ان کی حیثیت اور کردار کا تعین نہیں کیا گیا۔ ملا عمر کے ماتحت کوئی چیف آف جنرل سٹاف یا فوج اور فضائیہ کے لئے الگ سے کوئی سربراہ نہیں۔ کابل میں ہی فوج کے چار ڈویژن اور ایک آرمرڈ ڈویژن ہے۔ کوئی واضح فوجی تنظیم یا ڈھانچہ نہیں۔ افسروں کے تبادلے کی صورت میں ان کی جگہ کون لے گا یہ واضح نہیں۔ یونٹ کمانڈروں

کا مسلسل تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ انہیں کسی جگہ ٹک کر بیٹھنے اور اپنے فرائض یکسوئی سے ادا کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر 1997ء میں طالبان کو مزار شریف میں جو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی اس کے بعد قندوز میں جو فوج متعین کی گئی اس کی کمان میں تین مہینوں کے دوران تین مرتبہ تبدیلی کی گئی، یہی نہیں بلکہ آدھی فوج کو ہرات کے محاذ پر بھیج دیا گیا، اس طرح جو جگہ خالی ہوئی اسے کم تجربہ رکھنے والے پاکستانیوں اور افغان سے پر کیا گیا۔ فوجی شوریٰ جنگی منصوبے بنانے اور فوجی فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کی ذمہ دار ہے۔ عملاً کوئی فیصلہ کرنے کی اہل نہیں۔ فوجی حکمت عملی، اہم تقرریاں، مالی وسائل کی فراہمی اور تخصیص سے متعلق تمام تر فیصلے ملا عمر کرتے ہیں۔

طالبان کی طرف سے جبری بھرتی کے علاوہ کمانڈروں کو انفرادی طور پر مخصوص پشتون علاقوں سے اپنے طور پر بھرتی کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ان کی تنخواہ ادا کرنے اور میدان جنگ میں ان کی ضرورتیں پوری کرنا بھی انہی کمانڈروں کے ذمے ہے۔ اس کے لئے انہیں وسائل درکار ہیں، انہیں روپیہ پیسہ چاہیے، ایندھن چاہیے، خوراک چاہیے، ٹرانسپورٹ چاہیے، اسلحہ اور گولہ بارود چاہیے اور سب ضرورتیں فوجی شوریٰ ہی پوری کر سکتی ہے۔ فوجیوں کے اہل خانہ بھی مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔ آج ایک جگہ پر کل دوسری جگہ پر، فوجیوں کو بھی گھروں میں جانے کی اجازت ہے، وہ طویل عرصے تک میدان جنگ سے غیر حاضر رہ سکتے ہیں۔ طالبان کی فوج 25 ہزار سے 30 ہزار افراد پر مشتمل ہے لیکن جنگ کے وقت اس میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔

1999ء تک پاکستانی مدرسوں کے طلباء کی طالبان فوج میں تعداد 30 فیصد کے لگ بھگ تھی۔ وہ کچھ عرصہ جنگی خدمات انجام دے کر واپس چلے جاتے ہیں اور اپنی جگہ نئے طلباء بھرتی کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ غرض ایک بے قاعدہ فوج طالبان کی تحویل میں ہے۔ اسی کے برعکس احمد شاہ مسعود کے بارہ سے پندرہ ہزار کی باقاعدہ تربیت یافتہ فوج ہے۔ طالبان کی فوج قبائلی ملیشیاء اور لشکر کے مماثل ہے۔ جو ہمیشہ سے پشتون قبائیل کا

حصہ چلا آ تا ہے۔لشکر قبائیلی سرداروں، بادشاہوں کے حکم پر قبائیلی علاقے کے دفاع یا مقامی نوعیت کی جنگ کے لئے فوری طور پر تیار ہو جاتا ہے۔لشکر میں شامل ہونے والے رضا کاروں کو تنخواہ نہیں ملتی، مال غنیمت میں حصہ ملتا ہے۔ طالبان نے اپنے فوجیوں کو لوٹ مار سے منع کر رکھا ہے۔ ابتدائی عرصے میں جب وہ کوئی شہر فتح کرتے تو منظّم انداز میں کرتے لیکن 1997ء کے بعد جب مزار شریف فتح ہوا تو یہ روایت برقرار نہ رہی۔

طالبان فوجیوں کو باقاعدگی سے تنخواہ نہیں ملتی، وہ جب گھروں کو جاتے ہیں تو کمانڈر انہیں اچھی خاصی رقم دے دیتے ہیں۔ سابق کمیونسٹ فوج سے لئے جانے والے پیشہ وارانہ تربیت یافتہ فوجیوں کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ پشتون ٹینک ڈرائیور، توپچی، پائیلٹ، مکینک اسی زمرے میں آتے ہیں۔ وہ کرائے کے سپاہیوں کی طرح لڑتے ہیں۔ کابل پر جس کی حکومت ہوتی ہے، یہ اس کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔فوجی شوریٰ کے کئی ارکان قائم مقام وزیر ہیں۔ ان کے سبب کابل کی انتظامیہ میں افراتفری کا عالم ہے۔ وزیرِ صحت ملا محمد عباس 1997ء میں مزار شریف کی شکست کے بعد شمال میں طالبان کی پیشرو فوج کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے۔ انہیں وہاں سے نکال کر ایک اور حملے کے لئے ہرات بھیج دیا گیا۔ آخر میں وہ وزیرِ صحت کی حیثیت سے واپس آ گئے، چھ ماہ بعد اقوام متحدہ کی امدادی ایجنسیوں سے ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔ احسان اللہ احسان سٹیٹ بینک کے گورنر مقرر ہوئے۔ اسے نفع بخش نہ پا کر ایک ہزار قندھاری فوجیوں کی کمان کرنے لگے۔ اسی دوران وہ ہلاک ہو گئے۔ ہرات کے گورنر عبدالرزاق 1997ء میں ہرات میں گرفتار ہو گئے۔ بعد میں انہیں رہائی مل گئی۔ وہ 1994ء سے ملک بھر میں فوجی حملوں کی سربراہی کرتے آئے تھے۔ قندھار اور کابل شوریٰ کے تمام ارکان کسی نہ کسی وقت فوجی کمانڈر کی حیثیت میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ جسمانی طور پر معذور ارکان اس زمرے میں نہیں آتے۔ دیکھا جائے تو طالبان کا کبھی کمانڈر بننا اور کبھی ناظم انہیں مسائل کی بہتر تفہیم کرنے اور لڑنے والے سپاہیوں کے قریب اپنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں

بہت مددگار ثابت ہوا۔ تاہم کابل میں طالبان کی انتظامیہ کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب کوئی وزیر محاذ جنگ پر گیا ہوتا تو وزارت کوئی فیصلہ نہ کر پاتی، اس طریق کار کے باعث کوئی وزیر اپنے کام میں کوئی مہارت حاصل نہ کر سکا، نہ ہی اسے مقامی سطح پر اپنے لئے طاقت کی کوئی بنیاد ڈالنے کی مہلت میسر آ سکی۔

ملا عمر کسی وزیر کو سیاسی طور پر طاقتور ہوتے دیکھتے تو ایک لمحے کے نوٹس پر اسے محاذ پر بھیج دیتے، اس طرح جو الجھاؤ پیدا ہوا، اس سے کوئی موثر اور پائیدار حکومت قائم نہ ہو سکی اور نہ ہی تحریک کا کوئی باقاعدہ ہدف مقرر ہو سکا اور نہ ملک میں عمل و حرکت کی کوئی صورت قائم کی جا سکی۔ طالبان کی حد سے بڑھی ہوئی راز داری کا نتیجہ تھا کہ انہیں شہروں میں عوام، بین الاقوامی ذرائع ابلاغ، امدادی اداروں اور عالمی برادری کا اعتماد حاصل نہ ہو سکا۔ کابل پر قبضہ کرنے کے بعد بھی طالبان یہ بتانے سے انکار کرتے رہے کہ وہ افغانستان میں نمائندہ حکومت کے قیام کا کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ اقتصادی ترقی کے بارے میں ان کا کیا منصوبہ ہے۔ یہ بھی صیغہ راز میں رہا۔ طالبان کی حکومت کیسی ہوگی؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی، اس پر یہ اصرار کہ عالمی برادری ان کی حکومت کو تسلیم کر لے، دنیا کے لئے ناقابل فہم تھا۔ عالمی سطح پر شک کیا جانے لگا کہ طالبان حکومت کرنے کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ کابل شوریٰ کی ترجمانی کے فرائض شیر محمد ستانک زئی کے سپرد تھے، وہ انگریزی بول سمجھ لیتے تھے۔ انہوں نے پولیس مین کے طور پر ہندوستان سے تربیت حاصل کی تھی، وہ طالبان کی طرف سے اقوام متحدہ کی امدادی ایجنسیوں اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ سے معاملات طے کرنے پر مامور تھے۔ جلد ہی انکشاف ہوا کہ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں، وہ ملا عمر سے براہ راست رابطہ بھی نہیں کر سکتے تھے، وہ نہ تو کوئی پیغام انہیں پہنچا سکتے تھے اور نہ کوئی جواب لے سکتے تھے۔ امدادی ایجنسیوں کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کا پیغام ملا عمر تک پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ اس صورت حال میں شیر محمد کو کوئی افادیت نہ رہی۔

طالبان نے کابل کی بیوروکریسی میں چھوٹی سطح تک جو کانٹ چھانٹ کی، اس سے کنفیوژن میں مزید اضافہ ہوگیا۔ طالبان نے تمام تاجک، ازبک اور ہزارہ بیوروکریٹس کی جگہ پشتون تعینات کر دیئے۔ یہ بھی نہ دیکھا گیا کہ وہ اس کے اہل ہیں بھی یا نہیں۔ ماہر افسروں سے محروم ہو جانے پر وزارتوں کے لئے کام کرنا اور فرائض انجام دینا ممکن نہ رہا، ان کا وجود اور عدم وجود برابر ہو گیا۔

وزارتی دفاتر میں کارگزاری کا کوئی تعین نہیں تھا۔ فوجی یا سیاسی بحران چاہے کیسا ہی شدید ہوتا کابل اور قندھار میں سرکاری دفاتر صرف چار گھنٹوں کے لئے کھلتے۔ نظام الاوقات صبح آٹھ بجے سے دوپہر تک ہوتا۔ اس کے بعد نماز ادا کی جاتی، طویل قیلولہ کیا جاتا، معاشرتی تقاریب اور اجلاس رات کو کئے جاتے، وزیروں کی میزوں پر سے فائیل غائب ہوتے اور سرکاری دفاتر عوام سے خالی ہوتے۔ طالبان کے کارکن اور سرکاری ملازم اپنے فرائض منصبی انجام دینے کی بجائے گلی کوچوں میں نکل جاتے اور مردوں کو داڑھی رکھنے کی تلقین کرنے میں مصروف رہتے۔ دفتروں میں لوگوں کے استفسار کا جواب دینے والا کوئی نہ ہوتا۔ لوگوں نے وزارتوں سے توقع رکھنا ہی چھوڑ دی۔ شہری انتظامیہ میں عوام کی نمائندگی کی عدم موجودی سے یوں لگتا جیسے طالبان لوگوں کے دل جیتنے میں یقین نہیں رکھتے۔ ان کی حیثیت ایک قابض فوج کی ہے جس کا لوگوں کی بھلائی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ طالبان نے کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ وہ کب اور کیسے زیادہ مستقل اور نمائندہ حکومت قائم کریں گے، آیا وہ آئین دیں گے بھی یا نہیں۔ سیاسی طاقت کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی۔ ان مسائل پر طالبان کے رہنماؤں میں سے ہر ایک کی جداگانہ رائے تھی۔ طالبان حزب مخالف سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہیں لیکن صرف ایک شرط یہ کہ کوئی سیاسی جماعت مذاکرات میں حصہ نہیں لے گی۔ اکثر طالبان سیاسی جماعتوں سے آئے ہیں، اس سبب سے جو تضاد پیدا ہوتا ہے، وہ واضح ہے۔

''اسلام سیاسی جماعتوں کے خلاف ہے''۔ ایک وزیر نے طالبان کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جب امن قائم ہو جائے گا تو عوام اپنی پسند کی حکومت قائم کرسکیں گے۔ فی الحال سب سے پہلے اپوزیشن کو غیر مسلح کرنا لازم ہے۔ دوسروں کے نزدیک صرف طالبان پر مشتمل حکومت ہی قائم ہونی چاہیے۔ 1996ء کے بعد سے طاقت اور اختیار صرف ملا عمر کے ہاتھ میں مرتکز تھا۔ قندھار شوریٰ کی طرف رجوع کرنے کی بہت کم ضرورت پیش آتی۔ ملا عمر کے معتمد ملا وکیل نے بتایا کہ تمام فیصلے امیر المومنین کی رائے کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مشورہ کرنا ضروری نہیں۔ شریعت میں بھی یہی ہے۔ امیر جو بھی فیصلہ کرلے ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔ ریاست کا سربراہ امیرالمومنین ہوگا۔ ملا عمر اعلیٰ ترین حاکم ہوں گے، وہ جس فیصلے سے متفق نہیں ہوں گے، اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔ عام انتخابات کا شریعت میں کوئی جواز نہیں، اس لئے ہم انہیں مسترد کرتے ہیں۔

ملا عمر اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کے لئے کابل انتظامیہ پر کم اور قندھاری علماء اور مذہبی پولیس پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ قندھار کی اسلامی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولوی سید محمد پاسانی جنہوں نے ملا عمر کو شریعت کے بنیادی احکام پڑھائے اور سکھائے تھے، ملا عمر کے مشیر اعلیٰ بن گئے۔ انہوں نے لاقانونیت کے خاتمے کے لئے اسلامی سزائیں دینے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے 1997ء میں مجھے بتایا کہ 13 صوبوں میں 13 ہائی کورٹس ہیں، جن کی سربراہی ججوں کے پاس ہے، وہ جرائم کے ارتکاب پر اسلامی سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ میں خود نصف صدی سے دیہات میں مجرموں کو اسلامی سزائیں دیتا آیا ہوں۔ جہاد کے دوران مجاہدین کو بھی ان سزاؤں کے اطلاق کے سلسلے میں بتاتا رہا ہوں۔ ملا عمر سے قرب کی بنا پر قندھار کی اسلامی سپریم کورٹ ملک کی سب سے اہم عدالت بن گئی ہے۔ سپریم کورٹ صوبوں میں ججوں، قاضیوں اور نائب قاضیوں کا تقرر کرتی ہے۔ ان سب کا سال میں ایک یا دو مرتبہ قندھار میں اجتماع ہوتا ہے۔ جس

میں مقدمات پر بحث ہوتی ہے اور ان کے حوالے سے قانون شریعت کے اطلاق کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کابل میں ایک متوازی نظام انصاف موجود ہے۔ یہاں وزارت انصاف بھی ہے اور سپریم کورٹ برائے افغانستان بھی ہے۔ کابل کی سپریم کورٹ ہفتے میں 40 مقدمات کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ آٹھ شعبوں پر مشتمل ہے جو تجارت، جرائم اور عمومی قانون سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اسے اتنے اختیارات حاصل نہیں جتنے قندھار کی سپریم کورٹ کو حاصل ہیں۔ اٹارنی جنرل مولوی جلیل الدولہ مولوی زادہ کے مطابق تمام قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالا جا رہا ہے، جو قوانین اسلام سے متصادم ہیں، انہیں ختم کیا جا رہا ہے۔ پرانے قوانین کو بدلنے اور نئے قوانین رائج کرنے میں برسوں لگ سکتے ہیں۔

طالبان کے کنٹرول میں آنے والے علاقوں میں خراب ہوتی ہوئی اقتصادی صورت حال اور سیاست سے لاتعلقی اور بیگانگی کے علاوہ بڑے پیمانے پر ہونے والے فوجی نقصانات کے سبب اندرونی تقسیم در تقسیم کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ جنوری 1997ء میں طالبان کو قندھار کے علاقے میں جبری بھرتی کی بنا پر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ دیہاتیوں نے طالبان کے لئے بھرتی کرنے والے چار افراد کو قتل کر دیا۔ قندھار کے آس پاس کے کئی دیہات میں طالبان اور دیہاتیوں میں لڑائی ہوئی، جس میں دونوں طرف کے کئی افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ ان دیہات سے طالبان کو باہر نکال دیا گیا۔ بڑے بوڑھوں نے بتایا کہ ہمارے جو نوجوان طالبان میں شامل ہوتے ہیں، انہیں موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، گاؤں کے ایک بزرگ نے کہا کہ طالبان نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں امن دیں گے، لیکن اس کی بجائے انہوں نے جنگ کے سوا کچھ نہیں دیا۔ طالبان نے جون میں فوج کے 18 بھگوڑوں کو قندھار جیل میں موت کی سزا دے دی۔ وردک اور پلکتیا کے صوبوں میں جبری بھرتی کے ضمن میں اسی قسم کے واقعات پیش آئے۔

جبری بھرتی نے طالبان کی عدم مقبولیت میں اضافہ کیا ہے اور انہیں مجبوراً پاکستانی مدرسوں اور افغان مہاجروں میں سے نئی بھرتیاں کرنا پڑی ہیں۔ اپریل 1998ء میں کابل میں امریکی سفیر بل رچرڈسن کی آمد کے بعد سے قندھار شوریٰ اور کابل شوریٰ کے درمیان اختلافات ڈرامائی طور پر بڑھ گئے۔ کابل شوریٰ کے سربراہ ملا ربانی نے رچرڈسن سے طے پانے والے نکات پر عمل درآمد کرنے سے اتفاق کا اظہار کیا لیکن دوسرے ہی دن ملا عمر نے انہیں مسترد کر دیا۔ ملا ربانی طویل رخصت پر چلے گئے، جس کے دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اکتوبر 1998ء میں طالبان نے مشرقی افغانستان کے سب سے بڑے شہر جلال آباد سے 60 افراد گرفتار کئے۔ ان پر الزام تھا کہ وہ جنرل شاہنواز تانائی کے وفادار سابق فوجیوں سے مل کر انقلاب بپا کرنا چاہتے تھے۔ جنرل شاہنواز 1990ء میں نجیب اللہ کی فوج کو چھوڑ کر مجاہدین سے مل گیا تھا، اسی کے پشتون افسروں نے 1994ء کے بعد سے مسلسل طالبان کی حمایت کی تھی اور کئی ایک نے طالبان کی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ دسمبر میں طالبان نے ننگر ہار یونیورسٹی جلال آباد کے شعبہ طب کے طلباء پر فائرنگ کی، جس میں ایک طالب علم ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ شہر میں طالبان کے خلاف ہڑتال ہوئی اور احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ جلال آباد میں بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کے پیچھے اعتدال پسند ملا ربانی کے حامیوں کا ہاتھ بتایا جاتا تھا۔ ملا ربانی نے شہر میں اپنے لئے ایک سیاسی بنیاد قائم کر لی تھی۔ یہاں کے طاقتور تاجر جو پاکستان سے سمگلنگ کرتے تھے۔ طالبان سے نرم روی کا تقاضا کرتے تھے۔ جلال آباد کے واقعات کے بعد ملا ربانی کو کابل سے ایک بار پھر واپس قندھار بلا لیا گیا۔ وہ کئی مہینوں تک منظر سے غائب رہے 1998ء تک کابل شوریٰ کی خواہش تھی کہ طالبان اعتدال پسندی اپنائیں تاکہ اقوام متحدہ کی ایجنسیاں افغانستان واپس آ سکیں اور شہروں کو زیادہ بین الاقوامی امداد مل سکے۔ کابل شوریٰ اور جلال آباد شوریٰ کے طالبان لیڈروں نے محسوس کیا کہ قیمتوں میں اضافے، اشیائے

خوردنی کی کمی اور انسانی امداد میں کٹوتی کے باعث عوام میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ لیکن ملاعمر اور قندھار کے قائدین نے اقوام متحدہ کی امداد میں اضافہ منظور نہیں کیا، بلکہ اسے سرے سے مسترد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقوام متحدہ نے افغانستان سے انخلاء قبول کر لیا۔

1998۔99ء کے موسم سرما میں طالبان سپاہیوں نے لوٹ مار اور ڈکیتی کی کئی وارداتیں کیں، جن سے ظاہر تھا کہ اقتصادی مشکلات کے باعث فوج میں ڈسپلن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جنوری 1999ء میں کابل میں اس نوع کی ایک واردات میں ملوث طالبان سپاہیوں کے دائیں بازو اور بائیں پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ ان کے کٹے ہوئے اعضاء کو شہر کے مرکز میں درختوں سے لٹکا دیا گیا، تاکہ لوگ انہیں دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ جب تک یہ اعضاء گل سڑ نہیں گئے، وہیں لٹکے رہے۔ اگرچہ اندرونی اختلافات میں اضافہ ہو رہا تھا اور طالبان کی داخلی کمزوریوں کے بارے میں قیاس آرائیاں ہونے لگی تھیں۔ جس کے نتیجے میں طالبان میں خانہ جنگی شروع ہونے کا امکان تھا۔ ملاعمر کی برتر حیثیت، اختیارات میں اضافے اور تحریک پر مکمل کنٹرول نے صورت حال کو سنبھالا دیئے رکھا، اس طرح طالبان نے اپنے پیش رو مجاہدین کی طرح ایک فرد کی حکمرانی کا بندوبست کر لیا، جس میں کسی تنظیمی ڈھانچے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ دوسرے نسلی گروہوں یا مطمع ہائے نظر کو نمائندگی مل سکتی۔ اعتدال پسند اور سخت گیر طالبان روپوش ہو گئے۔ کیونکہ کوئی طالبان لیڈر ملاعمر سے اختلاف کرنے یا ان کی مخالفت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، اس طرح کی صورت حال بالآخر طالبان کے اندر کسی دھماکے پر منتج ہو سکتی ہے، جو طالبان کے مابین خانہ جنگی کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے پشتون ایک بار پھر تقسیم ہو سکتے ہیں اور عام آدمی کے لئے مزید مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔

عورتیں، بچے اور طالبان کلچر

مولوی کلام الدین طالبان کی مذہبی پولیس کے سربراہ ہیں، وہ بڑے قد کاٹھ کے قبائلی ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے، ناک لمبی اور موٹی، آنکھیں سیاہ، داڑھی کالی اور لمبی ہے، جو ان کی میز کو چھوتی ہے۔ ان کا نام اور جثہ شہر میں خوف پھیلا دیتا ہے۔ کسی کو ان کے سادہ سے دفتر میں جو کابل کے وسط میں ہے، جھانکنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ کم سے کم آدھی آبادی ان کے دفتر میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ انہوں نے عورتوں کو اس عمارت میں داخل ہونے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ ان کے دفتر سے جاری ہونے والے قاعدوں اور ضابطوں نے کابل کے شہریوں کی طرز زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ کابل بڑے تن آسان اور خوش رہنے کے عادی تھے، لیکن اب وہ دور ختم ہو گیا۔ عورتوں کو منظر سے یکسر غائب کر دیا گیا، وہ گھروں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔

مولوی کلام الدین امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عامل ہیں، وہ اپنے محکمے کو دینی نگرانی کا شعبہ قرار دیتے ہیں۔ گلی کوچوں میں ان ہزاروں پر جوش جوانوں کو جو ہاتھوں میں کوڑے، ڈنڈے اور کلاشنکوفیں لئے پھرتے ہیں۔ لوگ مذہبی پولیس کا نام دیتے ہیں اور ان پر طرح طرح کے نام دھرتے ہیں۔ میں 1997ء کے موسم گرما کے ایک دن مولوی کلام الدین کا انٹرویو لینے ان کے دفتر پہنچا۔ انہوں نے اسی روز نئے قواعد کا اعلان کیا تھا، جن کی رو سے عورتوں کو اونچی ایڑی کے جوتے پہننے پر پابندی لگا دی تھی۔

ایسے جوتے جو چلنے میں آواز کرتے ہوں، ان کا پہننا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ میک اپ کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جدید تراش خراش کا لباس زیب تن کرنا بھی نامناسب سمجھا جانے لگا۔ عورتوں کے لئے لازم قرار پایا کہ وہ باوقار طریقے سے پیش آئیں۔ خاموشی سے چلیں، چلتے میں کسی چیز کو ٹھوکر نہ ماریں کہ جس سے آواز پیدا ہوتی ہو۔ عورتیں سر سے پاؤں تک برقع میں لپٹی ہوتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح جوشیلے طالبان یہ دیکھ لیتے ہیں کہ انہوں نے میک اپ کیا ہے یا نہیں اور ان کے پاؤں میں کس طرح کے جوتے ہیں؟

نئے قاعدے کے تحت پہلے سے عائد پابندیوں کو باقاعدہ اپنا لیا گیا ہے۔ پہلے عورتوں کو کام کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ اب انہیں انسانی ہمدردی میں کام کرنے والی مغربی ایجنسیوں سے بھی ربط و تعلق ختم کرنے کا کہہ دیا گیا۔ البتہ میڈیکل شعبے کے سلسلے میں نرمی ہوتی گئی، یہ طے پایا کہ میڈیکل شعبے میں کام کرنے والی عورتیں ڈرائیور کے ساتھ نشست پر نہیں بیٹھ سکتیں، وہ کسی ایسی گاڑی میں سفر نہیں کر سکتیں، جس میں کوئی مغربی باشندہ موجود ہو۔ کابل میں لڑکیوں کی تعلیم بھی روک دی گئی۔ کیونکہ عملی تدریس میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی، جنہیں کام کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ افغان بچوں کی ایک پوری نسل تعلیم کے بغیر ہی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہزاروں تعلیم یافتہ خاندان کابل سے پاکستان بھاگ گئے ہیں تا کہ بچوں کو تعلیم دلا سکیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے مولوی کلام الدین سے پوچھا کہ طالبان نے عورتوں کو کام کرنے اور سکولوں میں جانے سے کیوں روک دیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم نے عورتوں کو تعلیم نہ دلائی تو لوگ ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ بالاخر ہمیں عورتوں کو تعلیم دلانا ہوگی لیکن اس وقت بے حد سخت مشکلات کا سامنا ہے۔ اپنے بھاری تن و توش کے باوجود وہ بڑے نرم گفتار ہیں، مجھے ان کی بات سمجھنے کے لئے بڑی توجہ دینا پڑی۔ انہوں نے کہا کہ ایک مسئلہ تو حفاظت اور سلامتی کا ہے۔ عورتوں کے لئے علیحدہ ٹرانسپورٹ کا

بھی بندوبست نہیں۔ سکولوں کے لئے علیحدہ عمارتیں بھی نہیں، عورتوں کو تعلیم دینے کے لئے جن سہولتوں کی ضرورت ہے، ان کا بھی فقدان ہے، عورتیں، مردوں سے مکمل طور پر علیحدہ ہونی چاہئیں، ہم میں ایسے مرد بھی موجود ہیں، جو عورتوں سے اچھی طرح پیش نہیں آتے، سوویت یونین کے خلاف جنگ میں ہم نے اس لئے بیس لاکھ جانیں گنوائی ہیں کہ ہم شرع کے پابند نہیں تھے۔ طالبان نے شریعت کے لئے جنگ لڑی ہے، وہ شریعت نافذ کرنے کے پابند ہیں، چاہے جو کچھ ہو۔ ہم یہ مقصد پورا کر کے رہیں گے۔

جب طالبان پہلی بار کابل میں داخل ہوئے تو انہوں نے مردوں کو لمبی داڑھی نہ رکھنے کی پاداش میں اور عورتوں کو برقعہ نہ اوڑھنے کی بنا پر مارا پیٹا۔ ہم نے عملہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ لوگوں کو سڑکوں پر سزا نہ دیں۔ انہیں بتائیں کہ شرع کے مطابق کس طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی اپنی کار کو پیچھے کی طرف چلانا چاہتا ہے تو ہم اس سے کہہ سکتے ہیں کہ پیچھے گاڑی ہے، اس لئے آپ اپنی گاڑی پیچھے نہ لے جائیں۔ مولوی کلام الدین یہ مثال دے کر مسکرائے۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس کے شعبے کی تنظیم نو کی گئی ہے، بالکل انہی خطوط پر، جن پر سعودی عرب میں کی گئی ہے۔ اس میں ہزاروں نوجوانوں کو جنہوں نے پاکستان کے مدرسوں میں معمولی تعلیم حاصل کی ہے، بھرتی کیا گیا ہے۔ یہ محکمہ طالبان کے لئے انٹیلی جینس کا بھی موثر وسیلہ ہے، اسے خاد ہی کی باقیات کہا جا سکتا ہے۔ خاد 1980ء کے عشرے میں افغانستان کی کمیونسٹ حکومت کا جاسوس ادارہ تھا، بعد میں اس کا نام بدل کر واد رکھ دیا گیا۔ اس کے پندرہ سے تیس ہزار پیشہ ور جاسوس تھے، ایک لاکھ کے لگ بھگ انفارمر تھے۔ انہیں بھی تنخواہ ملتی تھی۔ مولوی کلام الدین نے تسلیم کیا کہ فوج سرکاری دفاتر، وزارتوں، ہسپتالوں اور امدادی ایجنسیوں میں ان کے ہزاروں جاسوس ہیں۔ ہمارا عملہ مذہبی امور کے بارے میں پورا علم رکھتا ہے۔ ہمارا ادارہ کاملا" آزاد ہے۔ ہم وزارت انصاف یا سپریم کورٹ سے کوئی مشورہ نہیں کرتے اور نہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم صرف امیر المومنین

ملا محمد عمر کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ ان کے ضابطوں کی ریڈیو شریعت (کابل ریڈیو) سے باقاعدگی کے ساتھ تشہیر ہوتی ہے۔ یہ ضابطے آبادی کی معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوتے ہیں۔ کھیلوں کے موقع پر لوگوں کے لئے اعلان کیا گیا کہ وہ تالیاں نہ بجائیں بلکہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کریں۔ پہلے کھیلوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ کھیل کے دوران نماز کا وقت ہو جائے تو کھیل روک دیا جاتا ہے۔ کھلاڑی اور تماشائی صف بندی کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ پتنگ بازی جو کبھی کابلیوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا، پابندی لگا دی گئی ہے۔ عورتیں کسی بھی کھیل میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ طالبان کے نزدیک ان ضابطوں پر تنقید کرنا، چاہے ان کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہ ہو خلاف اسلام سمجھا جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام بھی عورتوں کو نجات دلانے کا کیا تھا۔ اسلام کا اعلیٰ ترین اور منزہ عن الخطا حکم عورتوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانا ہے۔ فرڈی نانڈ برڈل نے کہا کہ پہلے عورتوں کو نجات دلانے کا اعلان ہوا، بعد میں اس پر تدریجاً" عمل کر کے دکھایا گیا۔ طالبان تو اپنے فتوؤں کے بارے میں مسلم رپورٹروں کو استفسار کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہی معاملہ قرآن کی تفسیر اور تشریح کا ہے۔ غیر ملکی امدادی کارکنوں سے مختصراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ تم مسلمان نہیں اس لئے تمہیں اسلام کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا کوئی حق نہیں۔ اٹارنی جنرل مولوی جلیل اللہ مولوی زادہ کا کہنا تھا کہ طالبان سچے ہیں۔ ان کی قرآن کی تشریح صحیح اور اس کے علاوہ ہر بات غلط، انسانی کمزوری کا اظہار اور تقدس سے عاری ہے۔ شریعت ہمارا آئین ہے، اس لئے ہمیں کسی دوسرے آئین کی ضرورت نہیں۔ لوگ اسلام سے محبت کرتے ہیں، اسی لئے سب طالبان کے حامی ہیں۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اسے سراہتے ہیں۔

بہرحال افغان عورتوں اور افغان معاشرے کی بدحالی، طالبان کے آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ بیس برس کی مسلسل جنگ نے افغان معاشرے کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ نسلی برادری اور خاندانی ڈھانچہ جو مصیبت اور اقتصادی شدائد سے بچانے کا وسیلہ بنتا

MashalBooks.org

تھا، تباہ ہو گیا تھا۔ افغانستان انسانی احوال کے حوالے سے دنیا کا سب سے مفلوک الحال ملک بن گیا۔ ایک ہزار نوازئیدہ بچوں میں سے 163 زندہ نہیں بچتے، 18 فیصد کی یہ شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں یہ شرح 70/1000 ہے۔ ایک چوتھائی بچے پانچ برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں یہ تناسب ایک اور دس کا ہے۔ ایک لاکھ عورتوں میں سے، 1700 زچگی کے دوران ہی موت کے منہ کا نوالہ بن جاتی ہیں۔ مرد اور عورتیں بمشکل 44۔43 برس کی عمر کو پہنچ پاتے ہیں۔ جبکہ دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں مردوں اور عورتوں کی اوسط عمر 61 برس ہے۔ 29 فیصد لوگوں کو طبی امداد، 12 فیصد کو پینے کا صاف پانی میسر ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں یہ تناسب 80 اور 70 کا ہے۔ بچوں کی اموات کا سبب خسرہ اور اسہال ایسی بیماریاں ہیں، جن کا با آسانی علاج بھی ہو سکتا ہے اور جن سے مناسب پرہیز سے بچا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن طبی امداد کا انتظام ہے اور نہ ہی صاف پانی میسر ہے، اس لئے بچوں کی شرح اموات اتنی زیادہ ہے۔

طالبان کے آنے سے پہلے 90 فیصد لڑکیوں اور 60 فیصد لڑکوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دیہی علاقوں میں حالت اور بھی ابتر تھی۔ جہاں رہے سہے سکول بھی جنگ کے دوران تباہ ہو گئے۔ کہیں ایک سکول بھی نہ بچا۔ طالبان نے عورتوں کے بارے میں جو روش اپنائی اس سے حالات جو پہلے ہی خراب تھے مزید بدتر ہو گئے۔ کابل پر قبضہ ہونے کے تین ماہ میں طالبان نے شہر کے وہ سکول بند کر دیئے جس سے 001030 لڑکیاں اور 148000 لڑکے متاثر ہوئے۔ 11200 اساتذہ بے روزگار ہو گئے۔ ان میں 7800 عورتیں تھیں۔ طالبان نے کابل یونیورسٹی بھی بند کر دی، جس کے باعث 10،000 طلبا گھر بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔ ان میں 4000 خواتین تھیں۔ دسمبر 1998ء تک یونیسیف کے مطابق ملک کا نظام تعلیم تباہ ہو چکا تھا۔ اس میں سے نو لڑکیاں اور تین میں سے دو لڑکے سکول میں داخلہ نہیں لے سکتے تھے۔

بیرونی دنیا، افغان عوام کی ابتر اور مایوس کن صورت حال سے واقف نہیں تھی۔ 1980ء کے عشرے میں افغانستان میں جنگ کے دوران جو مسائل پیدا ہوئے، دنیا ان سے اتنی لاتعلق نہیں تھی۔ عالمی برادری نے امدادی کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ لیکن جیسے ہی افغانستان سے سوویت فوجیں نکلیں، یوں لگا کہ یہ آفت زدہ ملک عالمی برادری کی توجہ سے محروم ہوگیا۔ امیر ملکوں کی طرف سے امدادی رقوم بے حد کم ہو گئیں۔ انسانی امداد کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ 1996ء میں اقوام متحدہ نے انسانی امدادی پروگرام کے لئے 124 ملین ڈالر فراہم کرنے کی درخواست کی لیکن اسے صرف 65 ملین ڈالر ملے۔ 1997ء میں اس نے 133 ملین ڈالر مانگے تھے لیکن اسے صرف 56 ملین ڈالر ملے۔ اس سے اگلے برس 157 ملین ڈالر مانگے گئے لیکن صرف 53۔ ملین ڈالر دیئے گئے۔ 1999ء میں اقوام متحدہ نے صرف 113 ملین ڈالر کا مطالبہ کیا۔ دانشور برنیٹ روبن کا کہنا ہے کہ اگر افغانستان کی صورت حال خراب ہے تو اس لئے نہیں کہ افغان عوام بدصورت ہیں۔ افغانستان نہ صرف افغان عوام کے لئے آئینہ ہے بلکہ پوری دنیا کے لئے آئینہ ہے۔ ایک فارسی کہاوت کے مطابق اگر آئینے میں اپنی صورت بری نظر آتی ہے تو آئینہ نہ توڑو، اپنے چہرے کو توڑ دو۔ شہر پر طالبان کا قبضہ ہونے سے پہلے کابل کی عورتیں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی تھیں تو انہیں مایوسی ہی نظر آتی تھی۔

1996ء میں کابل کی ایک چھوٹی سی بیکری میں بی بی زہرہ سے ملا، وہ بیوہ تھی، اس نے چند نوجوان عورتوں کو ساتھ ملایا اور نان بنانے شروع کر دیئے۔ افغان مرد، عورتیں، بیوائیں، یتیم اور جسمانی طور پر معذور تمام لوگ نان ہی کھاتے ہیں۔ عالمی فوڈ پروگرام نے شہر میں بیکریاں قائم کرنے کے لئے مالی امداد دی ہے۔ 25 ہزار خاندان بیواؤں کی سربراہی میں اور سات ہزار خاندان معذور افراد کی قیادت میں یہ بیکریاں چلا رہے ہیں۔ چار لاکھ افراد کی گزر بسر انہی بیکریوں پر ہے۔ بی بی زہرہ کا تنور پہلے 1993ء

میں گلبدین حکمت یار کے راکٹوں سے تباہ ہوا۔ 1995ء میں طالبان کی گولہ باری کا ہدف بنا، زہرہ چھ بچوں اور بوڑھے ماں باپ کی کفیل ہے۔ اس نے زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ جہاں کبھی اس کا مکان کھڑا تھا، عالمی فوڈ پروگرام کو بیکری کے لئے دیا۔ اس نے کہا کہ میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ کیا تمہیں اس پر ہماری زندگی اور ہمارے ملک کا المیہ نہیں دکھائی دیتا۔ صورت حال روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ ہم گداگر ہو گئے ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے اقوام متحدہ پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ افغانوں کی یہ طرز زندگی تو نہیں تھی۔ عورتیں تھک چکی ہیں، بے حد مایوس ہیں، اندر سے اجڑ گئی ہیں۔ ہم ہر لمحے امن کی دعا کرتے ہیں۔ امن کے انتظار میں رہتے ہیں۔

بی بی زہرہ اور اس کے بچوں پر جو مصیبت آن پڑی ہے، وہ انہی تک محدود نہیں، سبھی افغان بچوں کا حال یکساں ہے، بلکہ کئی ایک کا تو اس سے بھی برا ہے۔ ''بچوں کو بچاؤ'' پروگرام کے تحت جو کھیل کا ایک میدان بنایا گیا ہے، اس میں ناتوان اور مرجھلے سے بچے، جھولوں میں جھول رہے ہیں۔ اس میدان میں جگہ جگہ چلے ہوئے گولے، ان کے پھٹے ہوئے خول پڑے ہیں اور ایک تباہ شدہ ٹینک بھی ہے، میدان کے گرد جلے ہوئے درختوں کے ٹھنٹھ کھڑے ہیں۔ عورتیں اور بچے جنگ کی تباہ کاریوں کا ہدف بنے ہیں۔ بچوں کو بچاؤ پروگرام کی ڈائریکٹر صوفی ایلسین نے مجھے بتایا کہ بچوں اور بڑوں کے لئے خوراک نہیں ہے، سبھی غذائیت کی کمی کا شکار ہیں۔ مائیں بچوں کے حال پر کڑھتی ہیں کہ کب کوئی راکٹ آن گرتا ہے۔ اس خوف سے عورتیں نفسیاتی دباؤ میں ہیں۔ ان میں سے کئی ایک ہسٹریا کی مریض بن گئی ہیں۔ بچے جب بڑوں کو ایک دوسرے کو قتل کرتے دیکھتے ہیں اور مائیں ان کی ضرورتیں پوری نہیں کر پاتیں تو ایسے میں بچے اپنی ماؤں کی بات کیسے سن اور مان سکتے ہیں۔ بچوں پر اس درجہ دباؤ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر اعتماد کرنا بھول گئے ہیں۔ والدین نے بچوں سے بات چیت کرنا ترک کر دی ہے۔ وہ انہیں یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ کیا ہو رہا ہے۔

یونیسیف کی جانب سے ڈاکٹر لیلا گپتا نے کابل کے بچوں کے بارے میں جو سروے کیا ہے اس کے مطابق اکثر بچوں نے بدترین تشدد ہوتے دیکھا ہے، ان کے زندہ رہنے کی امید نہیں، جن بچوں کا انٹرویو کیا گیا ان میں سے دو تہائی ایسے تھے جنھوں نے راکٹ سے کسی کے ہلاک ہونے اور انسانی اعضا اور لاشوں کو بکھرے دیکھتا ہے۔ 70 فیصد بچوں کے خاندان کا ایک نہ ایک فرد جنگ میں ہلاک ہو چکا ہے۔ بچوں نے بڑوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے۔ انہیں ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں، آنکھوں کے سامنے کٹتے مرتے لوگ یاد آتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کو اکیلا پن ستاتا ہے۔ کئی بچے کہتے ہیں کہ زندہ رہنا بے سود ہے۔ خاندانی زندگی کا ہر ضابطہ جنگ میں تباہ ہو گیا ہے۔ جب بچے اپنے ماں باپ پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں اور ماں باپ اپنے بچوں کا تحفظ نہ کر سکیں تو بچے حقیقی دنیا میں کس کے سہارے زندگی بسر کریں۔

افغانستان میں بچوں پر جس وسیع پیمانے پر افتاد پڑی ہے، دنیا کے کسی دوسرے ملک کی خانہ جنگی میں بچوں پر اتنی مصیبتیں نہیں پڑیں۔ افغانستان میں جنگی سردار 12 برس تک کی عمر کے بچوں سے سپاہیوں کا کام لیتے ہیں، کئی بچے یتیم تھے۔ ان کا کوئی خاندان نہیں تھا۔ ان پر تعلیم اور روزگار کے تمام دروازے بند تھے۔ بس سپاہی بھرتی ہونا اور جنگ کی آگ کا ایندھن بننا ہی ان کا مقدر بن گیا تھا۔ طالبان کا پاکستانی مدرسوں سے جو تعلق تھا۔ اس سے ہزاروں بچوں کو سپاہی بننے اور جنگ میں حصہ لینے کی ترغیب ملی۔ کئی کئی یونٹ بچوں کے تھے، یہ بچے توپ خانے کے لئے گولے لاتے، فوجی سامان کی نقل وحمل کرتے، فوجی تنصیبات کی حفاظت کرتے اور جنگ میں حصہ لیتے۔ 1998ء میں بین الاقوامی سطح پر سپاہیوں کی کم سے کم عمر 15 کی بجائے 18 برس مقرر کرنے کی کوشش کی گئی۔ امریکہ، پاکستان، ایران اور افغانستان نے اس کی مخالفت کی۔ 1999ء میں شائع ہونے والی ایک ایمنسٹی انٹرنیشنل رپورٹ میں بتایا گیا کہ دنیا بھر میں 18 برس سے کم عمر کے تین لاکھ سے زائد بچے سپاہیوں کی حیثیت سے بھرتی کئے گئے ہیں۔ کابل

پر طالبان کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہاں کی عورتوں اور بچوں کے مصائب میں اضافہ ہو گیا۔

1995۔96ء کے دوران میں جس کابلی عورت سے ملا، وہ جانتی تھی کہ طالبان نے کابل پر قبضہ کر لیا تو زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اس عرصے میں کوئی رپورٹر بھی گلی، دکان یا دفتر میں کسی بھی کابلی خاتون سے بات کر سکتا تھا۔ ایک عورت نصیبہ گل تھی۔ اس کی عمر 27 برس تھی، اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، وہ جدید دنیا کا حصہ بننے کی خواہش مند تھی۔ اس نے 1990ء میں کابل یونیورسٹی سے گریجویشن کی تھی، ایک این جی او میں اچھی ملازمت کر رہی تھی، اس نے لمبا سکرٹ اور اونچی ایڑی کا جوتا پہن رکھا تھا۔ شاید ہی کبھی اس نے اپنا چہرہ ڈھانپا ہو، ایک چھوٹا سا رومال اپنے سر پر ڈال لیتی تھی، وہ بھی اس وقت جب اسے شہر میں سے گزرنا ہوتا۔ نصیبہ نے کہا کہ طالبان عورتوں کو مٹی میں جلا دینا چاہتے ہیں، کوئی غریب ترین اور قدامت پسند عورت بھی نہیں چاہے گی کہ طالبان افغانستان پر حکمرانی کریں۔ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے مساوی قرار دیا ہے اور ان کی عزت کرنے کی تلقین کی ہے، لیکن طالبان کے اقدامات سے لوگ اسلام کے خلاف ہوئے جا رہے ہیں۔ نصیبہ کے خدشات بے جواز نہیں تھے، طالبان نے جب کابل پر قبضہ کیا تو عورتیں منظر سے ہٹ گئیں۔ نصیبہ کو کام کرنے سے روک دیا گیا اور وہ پاکستان چلی گئی۔

طالبان لیڈر افغانستان کے جنوبی پشتون صوبوں کے نہایت غریب انتہائی قدامت پسند اور بہت کم پڑھے لکھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ملا عمر کے گاؤں کی عورتیں برقعہ پہن کر باہر نکلتی تھیں۔ کوئی لڑکی بھی سکول نہیں جا سکتی تھی، اس لئے کہ کوئی سکول تھا ہی نہیں۔ ملا عمر اور ان کے رفقاء کا معاشرتی ضابطہ، تجربہ اور عورتوں کے بارے میں رویہ سب کچھ خودساختہ تھا وہ اپنی حکمت عملیوں کا جواز قرآن سے پیش کرتے تھے۔ بعض ایجنسیوں نے مئوقف اختیار کیا کہ افغان ثقافتی روایت کا احترام کیا جانا چاہے لیکن ایک

ایسے ملک میں جہاں کئی نسلوں کے لوگ رہتے ہیں اور ترقی کے مختلف مدارج میں ہیں، وہاں معاشرے میں عورتوں کے کردار کے بارے میں روایت اور ثقافت کا کوئی متفقہ معیار کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ طالبان سے پہلے کسی افغان حکمران نے لباس کے سلسلہ میں کوئی ضابطہ مقرر کرنے پر کبھی اصرار نہیں کیا تھا کہ مرد لمبی داڑھی رکھیں گے اور عورتیں برقعہ پہنیں گی۔

افغانستان کے باقی ماندہ حصے کا جنوب سے دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔ مشرق کی جانب رہنے والے افغان پشتون، پاکستانی پشتونوں سے بہت متاثر تھے۔ وہ اپنی لڑکیوں کو سکولوں میں بھیجتے، طالبان کے مقتدر ہونے کے بعد بھی بچیوں کو تعلیم دلاتے رہے۔ انہوں نے دیہات میں سکول جاری رکھے یا پھر اپنے خاندان پاکستان بھیج دیئے۔ یہاں جیسا کہ سویڈش کمیٹی کی طرح کی امدادی ایجنسیوں نے 600 پرائمری سکول جاری کر رکھے تھے، ان میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔ ان میں 30 ہزار لڑکیاں تھیں، جب پشتون سرداروں نے لڑکیوں کے لئے سکول کھولنے کا مطالبہ کیا تو طالبان گورنروں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پاکستان میں افغان مہاجر کیمپوں میں ہزاروں لاکھوں افغان لڑکیاں تعلیم پا رہی تھیں۔ پشتون پٹی سے باہر تمام نسلوں کے لوگ تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کرتے رہے۔ افغانستان کی طاقت، اس کے نسلی تنوع میں مضمر تھی۔ یہاں جتنے قبیلے اور قومیتیں تھیں، خواتین کے اتنے ہی کردار تھے۔

افغانستان کے شہر اور بھی زیادہ مختلف النوع تھے، قندھار ہمیشہ سے ہی قدامت پسند تھا لیکن ہرات میں پڑھی لکھی عورتیں، فرانسیسی دوسری زبان کے طور پر بولتی تھیں اور فیشن میں شاہ ایران کے دربار کی خواتین کی پیروی کرتی تھیں۔ کابل کی 40 فیصد عورتیں کام کرتی تھیں، کیمونسٹ حکومت کے دور میں اور 1992ء سے قبل کی مجاہدین حکومت کے عرصے میں بھی وہ مختلف فرائض انجام دیتی رہیں۔ تعلیم اور کام کے لحاظ سے وہ روایتی لباس کی جگہ سکرٹ اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنتیں اور میک اپ کرتیں۔ وہ فلمیں

دیکھنے جاتیں، کھیلوں میں حصہ لیتیں، شادی بیاہ کی تقاریب میں گانے گاتیں اور رقص کرتیں۔ فہم وفراست سے کام لیا جاتا تو لوگوں کے دل جیتنے کے لئے طالبان کو عورتوں سے متعلق اپنی پالیسی میں لچک پیدا کرنا چاہیے تھی اور جن علاقوں پر انہوں نے قبضہ کیا وہاں کے موجود حقائق کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن انہوں نے کابل کو طرح طرح کی برائیوں کا گہوارہ سمجھ لیا۔ جہاں عورتوں کو طالبان کے معیار کے مطابق ڈھالنے کے لئے مارا پیٹا جانے لگا۔ شمالی علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کو گمراہ قرار دے کر انہیں پھر سے مسلمان بنانا شروع کر دیا۔ اس کے لئے جبر کو روا سمجھا گیا۔

طالبان کا غیر مفاہمانہ رویہ ان کے داخلی سیاسی رجحان اور بھرتی حاصل کرنے کی ضرورت نے مشکل کیا تھا۔ یتیم، آوارہ، جنگ میں بے گھر اور بے در ہو جانے اور مہاجر کیمپوں میں پرورش پانے والے طالبان کی صفوں میں شامل کئے جانے لگے۔ ان سب کی مردوں کی سوسائٹی میں تربیت ہوئی تھی۔ مدرسوں کے تقدس، عورتوں پر کنٹرول اور پایان کار مدرسوں سے ان کے اخراج کو مردانگی کی علامت اور طلباء کی جہاد سے طبعی مطابقت کی توثیق سمجھا جانے لگا۔ عورتوں کے کردار کی نفی نے طالبان کو ان عناصر میں ایک جھوٹا جواز فراہم کر دیا۔ ایک افغان این جی او کے افغان سربراہ سمیع ولی کا کہنا تھا کہ عورتوں کی مخالفت کی جڑیں اسلام یا ثقافتی کردار میں نہیں بلکہ طالبان کے سیاسی عقائد اور نظریات میں ہیں۔ طالبان مسلم مردوں کی ایک نئی پود ہیں، جو جنگ کے کلچر کی پیداوار ہے، جس نے اپنی بلوغت کی زندگی، اپنے خاندانوں سے یکسر الگ تھلگ رہتے ہوئے گزاری ہے۔ افغان سوسائٹی میں عورتیں روایتی طور پر سماجی رویہ کی اصلاح کا وسیلہ رہی ہیں، اس اعتبار سے وہ افغان ثقافت میں طاقت کی علامت کا درجہ رکھتی ہیں۔

طالبان لیڈر مجھ سے بار بار کہتے رہے ہیں کہ اگر وہ عورتوں کو زیادہ آزادی یا انہیں سکولوں میں جانے کی آزادی دے دیں تو ہمیں ماننے اور ہمارا ساتھ دینے والے یہ

دیکھ کر مایوس ہو جائیں گے کہ ہم نے دباؤ میں آ کر اصولوں پر سمجھوتہ اور مصالحت کر لی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ نئے بھرتی ہونے والوں کو جنسی مواقع ملے تو وہ کمزور پڑ جائیں گے اور وہ پہلے سے جوش و جذبے کے ساتھ نہیں لڑ سکیں گے۔ غرض عورتوں پر جبر، طالبان کا اسلامی تجدد معاشرے کی تطہیر، فوج کے اخلاق اور کردار کو بہتر بنائے رکھنے کا ذریعہ تسلیم کیا جانے لگا۔ اقوام متحدہ کے خلاف طالبان کی مزاحمت اور مغربی حکومتوں کی طرف سے انہیں سمجھوتہ بازی اور اپنی پالیسیوں میں اعتدال پیدا کرنے پر آمادہ کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، جنس کا مسئلہ انہیں بے اثر کرنے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ مغرب سے سمجھوتہ بازی کو وہ اپنی شکست سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہم اب تک جو کرتے رہے ہیں، غلط تھا اس لئے سمجھوتے سے انکار میں ہماری برتری اور فتح ہے۔

سخت گیر طالبان نے بیرونی دنیا کی دلیل لوٹا کر اسی کے سر ڈال دی۔ ان کا کہنا تھا کہ مغرب پر لازم ہے کہ وہ اپنی پوزیشن میں اعتدال پیدا کرے اور طالبان کو اپنے دل میں جگہ دے، نہ یہ کہ طالبان عالمگیر انسانی حقوق تسلیم کرتے پھریں۔ اٹارنی جنرل مولوی جلیل الدولہ مولوی زادہ کا کہنا تھا کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ جس نوع کی تعلیم اقوام متحدہ چاہتی ہے، وہ ایک ملحدانہ تعلیم ہے، جو عورتوں کو بے حیائی سکھاتی ہے اور حرام کاری کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے اسلام کے لئے تباہی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک میں جہاں حرام کاری عام ہو جاتی ہے، وہ ملک تباہ ہو جاتا ہے اور ملحدوں کے قبضے میں چلا جاتا ہے کیونکہ وہاں کے مرد عورتوں کی طرح بن جاتے ہیں اور عورتیں اپنا دفاع نہیں کر سکتیں۔ جسے بھی ہم سے بات کرنی ہے، اسلامی حدود میں رہتے ہوئے بات کرے، قرآن مجید لوگوں کے مطابق اپنے آپ کو نہیں ڈھال لیتا بلکہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھالیں اور قرآن کے تقاضے پورے کریں۔ طالبان اس امر کی وضاحت نہیں کر سکتے کہ اسلام کی طرح کا دین جس کی

جڑیں نہایت گہری ہیں حرام کاروں کے ہاتھوں نقصان کیسے اٹھاتا ہے۔ تمام قبائلی پشتون، پشتون ولی کی بھی پیروی کرتے ہیں۔ یہ معاشرتی ضابطہ ہے جو قبائلی جرگے کو روایتی قوانین کے تحت فیصلے کرنے اور سزائیں دینے کا اختیار دیتا ہے۔ خاص طور پر زمین اور عورت پر مالکانہ حقوق اور قتل کے معاملے میں فیصلہ سناتا اور سزا تجویز کرتا ہے۔ پشتون ولی اور شرع کے درمیان جو خط امتیاز ہے وہ بالعموم غیر واضح رہتا ہے۔ طالبان شریعت سے زیادہ پشتون ولی کی سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ لیکن پشتون ولی پر درآمد کے کئی درجے ہیں۔ اس کا زیادہ تر پشتون پٹی میں اطلاق ہوتا ہے۔ کہیں نرم اور کہیں سخت۔ غیر پشتون نسلی گروپوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ طالبان نے پشتون ولی اور شرعی قوانین کا نسلی گروپوں پر سختی سے نفاذ کرنا چاہا، جس سے ملک میں مختلف نسلوں کے باہمی فاصلے بڑھ گئے۔ غیر پشتونوں نے سمجھا کہ ملک بھر میں قندھاری پشتون قوانین کے نفاذ کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ سیاسی حالات ایسے نہیں تھے جن میں طالبان سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتے۔ ہر شکست کے بعد طالبان عورتوں کے بارے میں اپنی پالیسیوں پر زیادہ سختی سے عمل کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کے خلاف وہ جتنے سخت اقدامات کریں گے، شکست خوردہ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کا موجب ہوں گے۔ ہر فتح کے بعد وہ مزید سخت گیری کرنے لگتے، مقصد مفتوحہ آبادی کو طالبان کی طاقت سے مرعوب کرنا ہوتا۔ طالبان کو میانہ روی اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے عالمی برادری کا تقاضا، بے نتیجہ ثابت ہوتا۔ ان کا اصرار کہ وہ جنگ کے بعد عورتوں کو تعلیم دلانے کی اجازت دے دیں گے، بے معنی ثابت ہوا۔ 1995ء میں ہرات پر قبضے سے افغانوں اور بیرونی دنیا پر عیاں ہو گیا کہ طالبان عورتوں کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، ہرات ازمنہ وسطیٰ سے اسلام کا مرکز چلا آتا ہے، یہاں مسجدیں ہیں، مدرسے ہیں، قدیم لبرل اسلامی روایت ہے، یہ اسلامی فنون، دستکاریوں، تصویروں، موسیقی، رقص، قالین سازی کا مرکز ہے، یہاں کی حسیناؤں کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔ ہراتی

باشندے فاتح تیمور کی ملکہ گوہر شاد کا قصہ بڑے جذب وشوق سے سناتے ہیں۔ اس نے 1405 میں تیمور کی وفات کے بعد اپنا دارالحکومت تاشقند سے ہرات منتقل کر لیا تھا۔ ایک دن ملکہ نے یاقوتی ہونٹوں والی 200 خوبصورت کنیزوں کے ساتھ ہرات کے مضافات میں اس مسجد اور مدرسے کا معائنہ کیا، جو ملکہ نے بنوایا تھا۔ مدرسے کے طلباء سے کہا گیا کہ ملکہ اور ان کے ساتھ آنے والی کنیزوں کی آمد سے پہلے مدرسہ خالی کر دیا جائے۔ ایک طالب علم اپنے کمرے میں سوتا رہ گیا، اسے ملکہ کی ایک حسین وجمیل کنیز نے جگایا، کنیز جب واپس ملکہ کے پاس آئی تو اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی، وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ وہ طالب علم کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی، ملکہ نے طالب علم کو سزا دینے کی بجائے اپنی تمام کنیزوں کو تمام طالب علموں سے شادی کرنے کا حکم دیا، تا کہ آئندہ انہیں ترغیب گناہ نہ ملے۔ ملکہ نے ہر طالب علم کو لباس دیا۔ اس کی تنخواہ مقرر کر دی اور کہا کہ جب تک طلباء کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی، شوہر اور بیوی ہر ہفتے ایک دوسرے سے مل لیا کریں۔ یہ کہانی ہرات میں اسلام اور مدرسے کی تعلیم کی میانہ روی اور انسانی روایت کی غماز ہے۔

طالبان ہرات کی تاریخ اور روایت سے واقف نہیں، وہ ہراتی عورتوں کو گھروں میں بند کرنے آئے ہیں، انہوں نے لوگوں کو صوفیا کے مزاروں پر جانے سے منع کر دیا۔ طالبان نے مجاہدین کے کمانڈر اسماعیل خان کی برسوں کی کوشش اور محنت پر پانی پھیر دیا، جو اس نے آبادی کو تعلیم دلانے کے لئے کی تھی۔ لڑکیوں کے سبھی اور لڑکوں کے اکثر سکول بند کر دیئے گئے۔ سکولوں کی بندش کی ایک علت یہ تھی کہ ان میں خواتین پڑھاتی تھیں۔ ہسپتالوں کو عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ کر دیا گیا۔ حمام بند کر دئے گئے اور عورتوں کا بازار میں نکلنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ طالبان کی زیادتیوں کے خلاف سب سے پہلے عورتوں نے آواز بلند کی۔ 17 اکتوبر کو ایک سو عورتوں نے شہر کے حماموں کی بندش کے خلاف گورنر کے دفتر کے باہر احتجاجی مظاہرہ

کی۔ طالبان کی مذہبی پولیس نے عورتوں کو مارا پیٹا اور پھر گرفتار کر لیا۔ پولیس نے گھر گھر جا کر مردوں سے کہا کہ وہ عورتوں کو گھروں سے باہر نہ نکلنے دیں۔

ہرات کے ان واقعات کو عالمی ذرائع ابلاغ اور اقوام متحدہ نے عمومی طور پر نظرانداز کیا لیکن مغربی این جی اوز نے اپنی آئندہ کی سرگرمیوں کے حوالے سے عورتوں سے ہونے والے سلوک کے مضمرات کا اندازہ کر لیا۔ یونیسیف اور بچوں کو بچاؤ پروگرام نے غور و خوض اور طالبان سے بے نتیجہ مذاکرات کے بعد ہرات سے اپنا تعلیمی پروگرام معطل کر دیا۔ محسوس کیا گیا کہ جیسا لڑکیوں کو تعلیم دلانا بھی منع کر دیا گیا ہے۔ اس مد میں کوئی منصوبہ کیوں بنایا جائے؟ امداد بند ہو جانے کا طالبان پر کوئی اثر نہیں ہوا، انہوں نے باور کر لیا کہ اقوام متحدہ کے دوسرے ادارے عورتوں کے تعلق میں ان کے مئوقف کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ دوسرے وہ امداد دینے والوں کو منقسم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اقوام متحدہ کے ادارے کوئی ایک موقف اپنانے اور اس کی بنا پر طالبان سے مذاکرات کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ہر ایجنسی کی یہی کوشش تھی کہ وہ طالبان سے اپنے طور پر الگ سے معاملہ کر لے۔ اس طرح اقوام متحدہ نے اپنے ہی اصولوں پر سودے بازی کر لی۔ جبکہ طالبان عورتوں پر پابندی بڑھاتے گئے، ایک یورپی این جی او کے سربراہ نے مجھ سے کہا کہ اقوام متحدہ پھسلن پر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چھوٹی چھوٹی سودے بازی سے عالمی برادری کو بھی مطمئن کیا جا سکتا ہے اور طالبان کو بھی، لیکن درحقیقت یہ بے فائدہ ثابت ہوا۔ 1996ء میں جب طالبان نے کابل پر قبضہ کیا تو دنیا کو عورتوں کے بارے میں ان کی پالیسیوں کا علم ہوا۔

طالبان نے سابق صدر نجیب اللہ کو پھانسی پر لٹکایا اور عورتوں سے بدسلوکی شروع کی تو عالمی ذرائع ابلاغ میں اس کا وسیع پیمانے پر چرچا ہوا۔ عالمی لیڈروں کے احتجاجی بیانات آنے لگے، ان میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ایونیسف، یونیسکو اور مہاجروں کے ادارے کے سربراہ شامل تھے۔ لیکن طالبان پر کوئی اثر نہیں ہوا، کابل میں بیوٹی ہیئر اور

میک اپ کے سیلون بند کر دیئے گئے۔ عورتوں کے حمام بھی بند ہو گئے۔ حمام واحد جگہ تھی جہاں گرم پانی میسر تھا۔ درزیوں سے کہا گیا کہ وہ عورتوں کے کپڑے سینے کے لئے ان کا ماپ نہیں لیا کریں گے بلکہ اپنی مستقل گاہک عورتوں کا ماپ یاد رکھیں گے۔ فیشن میگزین جلا دیئے گئے، ایک امریکی رپورٹر نے لکھا ''اپنے ناخنوں کو پالش لگاؤ، اپنی کسی سہیلی کی تصویر لو، بانسری بجاؤ، تھاپ پر تالی بجاؤ، کسی غیر ملکی کو چائے کی دعوت پر بلاؤ تو تم نے طالبان کے ضابطے کی خلاف ورزی کی۔ کابل کی حد تک تو اقوام متحدہ کی کسی پالیسی کی عدم موجودگی کو نظر انداز کیا جاتا رہا لیکن بعد میں یہ سیکنڈل بن گیا، خواتین کی طرف سے اقوام متحدہ پر تند و تیز تنقید ہونے لگی۔ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کو بالآخر ایک مشترکہ موقف اپنانا پڑا۔ ایک بیان جاری ہوا، جس میں تمام انسانوں میں مساوات اور وقار کے تحفظ، جنس، نسل، ذات برادری اور مذہب کی بنا پر امتیاز نہ کرنے کا ذکر تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کی اسی دستاویز میں کہا گیا تھا کہ بین الاقوامی ایجنسیاں مقامی رسم و رواج اور ثقافت کا بڑا دھیان رکھتی ہیں۔ یہ اقوام متحدہ کی کلاسیکی سودے بازی اور مصلحت کوشی تھی، جس کی بنا پر طالبان نے اس وعدے کے باوجود کہ امن بحال ہونے کے بعد وہ تعلیم نسواں کی اجازت دے دیں گے، عورتوں پر تعلیم کے دروازے بند رکھے۔ اکتوبر 1996ء تک اقوام متحدہ کو کابل میں عورتوں کے لئے آٹھ منافع بخش منصوبے ترک کرنا پڑے کیونکہ عورتوں کو ان میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اگلے اٹھارہ مہینوں کے دوران اقوام متحدہ این جی اوز مغربی حکومتوں اور طالبان کے درمیان مذاکرات کے کئی دور ہوئے، لیکن ان سے کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس وقت تک پتہ چل گیا کہ قندھار میں طالبان علما کی ایک سخت گیر لابی اقوام متحدہ سے پیچھا چھڑانے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ طالبان نے پیچ مزید کس دیا۔ انہوں نے لڑکیوں کے لئے گھروں میں قائم سکول بھی بند کر دیئے، پہلے انہیں جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تھی، اب اسے منسوخ کر دیا گیا۔ عورتوں کو جنرل ہسپتالوں میں جانے سے بھی روک دیا گیا۔ مئی

MashalBooks.org

1997ء میں مذہبی پولیس نے امریکی این جی او کے انٹرنیشنل عملے کی پانچ خواتین ارکان کو مارا پیٹا اور پھر مطالبہ کیا کہ تمام امدادی منصوبوں کے لئے صرف متعلقہ وزارت سے ہی اجازت لینا کافی نہیں، بلکہ وزارت داخلہ،صحت عامہ پولیس اور پرہیزگاری کے فروغ اور ہر طرح کے گناہ کے سدباب کرنے والے شعبے کی اجازت لینا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ افغانستان میں انسانی امداد کی مسلمان کارکن خواتین کو کارڈ بھی ساتھ رکھنا لازمی ہے۔ آخر میں جولائی 1997ء میں طالبان نے زور دیا کہ اقوام متحدہ اور این جی اوز اپنے دفاتر سے نکل کر ایک احاطے میں ہو جائیں۔ یہ جگہ پولی ٹیکنیک کی تباہ شدہ عمارت تھی۔ یورپین یونین نے مزید انسانی امداد دینا بند کر دی تو اقوام متحدہ اور این جی اوز نے کابل چھوڑ دیا۔

افغانستان کی عورتوں کی جو درگت بنی اس کے سبب سے یہ حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ شہروں کے مردوں خصوصاً پشتونوں کو طالبان کے ہاتھوں کچھ کم ذلت نہ اٹھانا پڑی۔ کابل کے تمام مردوں کو پوری داڑھی رکھنے اور بڑھانے کے لئے چھ ہفتوں کی مہلت دی گئی۔ اس کے باوجود کہ بعض نسلوں مثلاً ہزارہ قبیلہ کے مردوں کے داڑھی نکلتی ہی نہیں یا کم نکلتی ہے۔ داڑھی مرد کی مٹھی کے برابر ہونی لازمی ہے، اس سے کم تراشی نہیں جا سکتی۔ شاید اسی بنا پر یہ مذاق کیا جاتا ہے کہ افغانستان کا درآمد برآمد کا سب سے بڑا کاروبار مردوں کی داڑھیوں کے بالوں کا ہے یا مردوں کو افغانستان جانے کے لئے ویزے کی ضرورت نہیں، اس کا باریش ہونا ہی کافی ہے۔ مذہبی پولیس گلیوں میں قینچیاں لئے کھڑی ہوتی ہے، وہ سروں کے لمبے بال کاٹتی اور لمبے بال رکھنے والوں کی پٹائی کرتی رہتی ہے۔ مردوں کے لئے شلوار ٹخنوں سے اونچی باندھنا اور نماز پنجگانہ ادا کرنا لازم ہے۔ لڑکوں سے بداخلاقی کرنے والوں کے لئے کڑی سزا مقرر ہے۔ ایسے خطا کاروں کو نہ صرف پیٹا جاتا ہے بلکہ ان کا منہ کالا کر کے بازار میں پھرایا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں ان پر دیوار گرا دی جاتی ہے۔ فروری 1998ء میں قندھار کے تین افراد کو لواطت کی

بنا پر موت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ انہیں کھڑا کر کے ٹینک کی ٹکر سے دیوار ان پر گرا دی گئی، ان میں سے دو تو ہلاک ہو گئے، ایک کی جان بچ گئی، یہ منظر خود امیرالمومنین ملا عمر نے خود آ کر دیکھا۔ طالبان کے اخبار ''انیس'' میں اس کی خبر بھی چھپی، کابل میں بھی دو افراد کو اسی طرح ہلاک کیا گیا۔ لواطت کی سزا کے بارے میں اختلاف ہے۔ ملا محمد حسن نے بتایا کہ ہمارے دینی رہنماؤں میں اس ضمن میں اتفاق نہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ مجرموں کو کسی اونچی عمارت پر کھڑا کر کے نیچے گرا دیا جائے یا ان پر دیوار گرا دینی چاہیے۔ بعض کے خیال میں مجرموں کو ایک گڑھے میں دبا کر اوپر دیوار گرانی چاہیے۔
طالبان نے ہر طرح کی تفریح پر پابندی لگا دی تھی۔ افغانستان ایسے غریب اور محروم ملک میں تفریحات ویسے بھی بہت کم ہیں، افغان سینما گھروں میں فلم دیکھنے کے شائق ہیں لیکن طالبان نے فلم، ویڈیو، ٹی وی، موسیقی اور رقص پر پابندی لگا رکھی ہے۔ ملا محمد حسن نے مجھے بتایا کہ ہمیں احساس ہے کہ لوگوں کو کچھ نہ کچھ تفریح ضرور چاہیے لیکن اس کے لئے انہیں پارکوں میں جانا چاہیے، جہاں وہ پھولوں کو دیکھیں اور اس طرح اسلام کے بارے میں سیکھیں۔ وزیر تعلیم ملا عبدالحنفی کا کہنا تھا کہ طالبان موسیقی کے اس لئے خلاف ہیں کہ اس سے دل میں ایک کسک سی پیدا ہوتی ہے اور جس سے اسلام کی تفہیم میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ شادی بیاہ کی تقاریب میں بھی گانا بجانا اور ناچنا منع کر دیا گیا اور یوں صدیوں پرانی روایت ختم ہو گئی۔ جس سے سینکڑوں موسیقاروں اور رقاصوں کا روزگار وابستہ تھا، جو لوگ بے روزگار ہوئے ان میں سے اکثر پاکستان بھاگ گئے۔

گھروں میں دیواروں پر تصویریں اور فوٹو لٹکانا بھی منع کر دیا گیا ہے۔ افغانستان کے ایک 62 سالہ معروف مصور محمد مشعل ہرات کی پانچ سو سالہ تاریخ پر ایک بہت بڑی دیواری تصویر بنا رہے تھے، طالبان نے ان کی موجودگی میں اس پر سفید رنگ پھیر دیا۔ قصہ کوتاہ طالبان کلچر کے تصور ہی کو نہیں مانتے، انہوں نے سال نو کی خوشی منانے کی تقریب نوروز کو خلاف اسلام کہہ کر ممانعت کر دی ہے۔ ایران کے شمسی کیلنڈر کے پہلے

دن، موسم بہار کا قدیم تہوار منایا جاتا تھا۔ اس روز لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں پر جاتے تھے۔ اب انہیں یہ تہوار منانے اور قبروں پر جانے کی اجازت نہیں۔ یکم مئی کو مزدوروں کا دن منانے کو کمیونسٹوں کے کھاتے میں ڈال کر خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ محرم میں عزاداری منع ہو گئی ہے، عید پر مسرت اور شادمانی کے اظہار پر بھی قدغن لگ گئی ہے۔ اکثر افغان اس پر سخت بددل ہیں کہ اسلامی دنیا نے طالبان کی انتہا پسندی کی مذمت نہیں کی۔ پاکستان، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں نے افغانستان سے عورتوں کی تعلیم پر پابندی اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف ایک بیان بھی جاری نہیں کیا نہ انہوں نے شریعت کی اس شرح پر جو طالبان کر رہے ہیں حرف گیری کی ہے۔ ایشیائی مسلم ممالک بھی خاموش ہیں۔ اسلام میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، ایران نے اس کا بڑا زوردار دفاع کیا ہے۔ آیت اللہ احمد جنتی نے 1996ء میں ایک بیان میں کہا تھا کہ طالبان نے لڑکیوں کے سکول جانے اور عورتوں کے گھروں سے باہر جا کر کام کرنے کی ممانعت کر کے اور وہ بھی اسلام کے نام پر اپنی فرسودہ پالیسیوں کا اظہار کیا ہے۔ تشدد، تنگ نظری، عورتوں کے حقوق سلب کرنے اور اسلام کو بدنام کرنے سے بڑھ کر بری بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ 1998ء میں مزار شریف میں ایرانی سفارت کاروں کی ہلاکت کے بعد طالبان کی پالیسیوں پر ایران کی تنقید میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہو گیا ہے۔ مزار شریف میں ازمنہ وسطیٰ کی اس خوب رو شاعرہ رابعہ بلخی کا مزار ہے، جس نے اپنے دور کی ایک عشقیہ کہانی منظوم کی، وہ اپنے غلام عاشق کے ساتھ سوئی ہوئی تھی کہ اس کے بھائی نے اس کے بازو کاٹ دیئے، اس نے اپنی آخری نظم اپنے خون سے اس وقت لکھی جب وہ مر رہی تھی۔ صدیوں تک ازبک نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس کے مزار پر حاضری دیتے اور اپنی محبت کے پروان چڑھنے کی دعائیں مانگنے چلے آ رہے تھے۔ طالبان نے آ کر اس کی قبر کو ممنوع علاقہ قرار دے دیا۔

MashalBooks.org

منشیات اور طالبان کی معیشت

قندھار شہر سے دو میل کے فاصلے پر پوست کے کھیت ہیں، جو افق تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ 1997ء کے موسم بہار میں کسان بڑی احتیاط سے نوخیز، سبز اور نرم پتوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ چند ہفتے پہلے ہی پودے بوئے گئے تھے۔ جڑی بوٹیاں تلف کی گئیں، کھاد چھڑکی گئی، 1980ء کے بعد سوویت فوج نے جو آبی ذخیرے تباہ کر دیئے تھے، ان کی تعمیر نو کی گئی، تاکہ کھیتوں کو سیراب کیا جا سکے۔ چند ہفتوں میں پتے پوری طرح نکل آئیں گے۔ سرخ پھول کھل اٹھیں گے، حتیٰ کہ ان کی پتیاں جھڑ جائیں گی اور پوست نمایاں ہونے لگیں گی۔ پوست کے بیج بونے کے چار ماہ بعد پوست کے ڈوڈے پک کر تیار ہو جائیں گے، پھر تیز دھار چھریوں سے ان پر خراشیں لگائی جائیں گی، انہیں انگلیوں سے دبایا جائے گا، اب ان سے دودھ کی طرح سفید مواد نکلنے لگے گا، دوسرے دن یہ جمنے اور بھورا رنگ اختیار کرنے لگے گا۔ یہ افیون ہے، جسے کھرچ کر اتار لیا جائے گا۔ یہ عمل ہر چند روز بعد دوہرایا جائے گا۔ حتیٰ کہ مواد نکلنا بند ہو جائے گا۔ خام افیون جمع کر کے اسے کوٹ کر چپاتی کی شکل دے لی جائے گی اور پلاسٹک کے تھیلوں میں بھر کر الگ رکھ دی جائے گی اور خریدار کا انتظار کیا جائے گا۔ اچھی قسم کی افیون، اچھی طرح سیراب کئے جانے والے کھیتوں سے حاصل ہوتی ہے، اس کا رنگ کالا بھورا ہوتا ہے اور یہ چپکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تمام جنگی سرداروں، خاص طور پر طالبان کے لئے یہ سرمائے کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہے۔

ایک معمر کسان ولی جان نے جس کے منہ میں دانت نہیں تھے، کہا کہ ہم طالبان کے ممنون احسان ہیں جنہوں نے ہمیں تحفظ فراہم کیا ہے۔ اب ہم امن کے ساتھ اپنے کھیت بوتے اور فصل تیار کرتے ہیں۔ پوست کی فصل پر میرے خاندان کے چودہ افراد کی گزر بسر کا انحصار ہے۔ دیہی علاقے میں طالبان نے امن وسلامتی کا جو ماحول پیدا کیا ہے وہ پوست کی کاشت کے لئے بے حد سازگار ہے۔ ولی جان اپنے چھوٹے سے قطعہ زمین سے ہر سال 45 کلوگرام افیون حاصل کرتا ہے اور تقریباً 1300 ڈالر کماتا ہے، ولی جان کو پتہ ہے کہ افیون جب ہیروئن کی شکل میں لندن اور نیویارک پہنچتی ہے تو اس سے پچاس گنا زیادہ قیمت حاصل ہوتی ہے، تاہم اسے جو کچھ مل جاتا ہے وہ اسی سے خوش ہے۔

قندھار کے نواحی دیہات میں افیون کے عوض جو سرمایہ آتا ہے، اس کے طفیل یہاں تعمیرات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ پورے افغانستان میں اگر کہیں تعمیر ہو رہی ہے تو یہی ایک علاقہ ہے، طالبان نے ولی جان جیسے کاشت کاروں کو افیون پیدا کرنے کی اجازت دے رکھی ہے، حالانکہ اسلام نے منشیات پیدا کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ قندھار میں انسداد منشیات کے شعبہ کے سربراہ عبدالرشید نے اپنے فرائض کی توجیہہ کرتے ہوئے بتایا کہ حشیش چونکہ مسلمان اور افغان استعمال کرتے ہیں اس لئے اسے اگانے کی ممانعت ہے لیکن افیون مغرب میں کافر استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان یا افغان نہیں۔ پوست کی کاشت کے کچھ دوسرے سیاسی تقاضے بھی ہیں۔ مثلاً افیون پیدا کرنے سے کاشت کاروں کو اچھی قیمت ملتی ہے، ہم کاشت کاروں کو پوست کی جگہ گندم اگانے پر مجبور نہیں کر سکتے، اس لئے کہ اگر انہیں پوست اگانے سے منع کیا گیا تو وہ طالبان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، چنانچہ ہم پوست اگاتے ہیں اور گندم پاکستان سے لے لیتے ہیں۔

گورنر محمد حسن اس عجیب وغریب پالیسی کے حق میں ایک اور رائے رکھتے ہیں۔ انہوں

نے کہا کہ منشیات بری ہے، ہم پوست کی جگہ دوسری نقد آور فصلیں اگانا چاہتے ہیں۔ لیکن سردست یہ ممکن نہیں کیونکہ ہمیں بین الاقوامی طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ آئندہ دو برس میں ملا عمر امریکہ اور اقوام متحدہ کو پوست کی کاشت ختم کرنے کی پیش کش کرنے والے تھے۔ شرط یہ ہے کہ طالبان کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا جائے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ملک کے 90 فیصد علاقے پر کنٹرول کرنے والی تحریک نے بین الاقوامی برادری کو یہ پیش کش کی ہے۔

طالبان نے منشیات سے حاصل ہونے والے سرمائے پر مبنی معیشت کو باقاعدہ بنانے کی ضرورت کا احساس کر لیا ہے۔ جب پہلے پہل انہوں نے قندھار فتح کیا تو اعلان کیا کہ وہ تمام منشیات ختم کر دیں گے، امریکہ کے سفارت کاروں نے اس سے متاثر ہو کر طالبان سے فوری رابطہ کیا، تاہم طالبان نے چند مہینوں میں باور کر لیا کہ انہیں افیون کے ذریعے سرمایہ فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے اگر انہوں نے پوست پر پابندی لگائی تو کاشت کار ناراض ہو جائیں گے۔ انہوں نے منشیات کا کاروبار کرنے والوں سے زکوٰۃ وصول کرنا شروع کر دی۔ زکوٰۃ آمدنی کا 2۔5 فیصد ہوتی ہے اور اس طرح جو سرمایہ مہیا ہوتا ہے وہ غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ طالبان نے ان سے افیون کی مالیت کا 20 فیصد بطور زکوٰۃ لینا شروع کر دیا ہے۔ کمانڈر اور صوبائی گورنر انفرادی طور پر سرمائے کی فراہمی اور سپاہیوں کو معاوضوں کی ادائیگی کے لئے الگ سے ٹیکس وصول کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض خود افیون کی تجارت کرنے لگے ہیں یا انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو اس کاروبار میں آڑھتی کے طور پر لگا لیا ہے۔

دریں اثناء طالبان نے حشیش کے خلاف موثر مہم کا آغاز کیا ہے۔ حشیش ٹرک ڈرائیوروں کے استعمال کا نشہ ہے، اس مہم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے اگر افیون پر پابندی لگانے کی مہم شروع ہوئی تو یہ بھی نہایت کامیاب ثابت ہوگی، قندھار کے دو گوداموں میں حشیش کے ہزاروں تھیلے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ حشیش کاشت کاروں

MashalBooks.org

اور کاروباری لوگوں سے ضبط کی گئی ہے، عام آدمی کہتے ہیں کہ جب سے طالبان نے حشیش پر پابندی لگائی ہے، وہ اسے پیتے ہوئے گھورتے ہیں۔ جولوگ چھپ کر حشیش پیتے رہے، ان کی اصلاح کے لئے عجیب طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔عبدالرشید نے بتایا کہ جب ہم حشیش کا کوئی سمگلر پکڑتے ہیں تو ہم اس سے سچ اگلوانے کے لئے بری طرح پیٹے اور پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ دن میں دو تین بار انہیں کئی گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں رکھتے ہیں۔ یہ بڑا اچھا علاج ہے، بعد میں انہیں جیل میں بند کر دیتے ہیں، رشید نے حشیش کے عادی دو تین خوفزدہ افراد کو جیل سے بلوا کر مجھ سے ملوایا۔انہوں نے تسلیم کیا کہ طالبان نے انہیں سزا کی صورت میں جو صدمہ پہنچایا ہے، وہ بہت موثر ثابت ہوا ہے۔ بخت محمد نے بتایا کہ جب مجھے مارا پیٹا جاتا ہے یا ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے تو بھی حشیش کے بارے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ بخت محمد دکاندار ہے، حشیش کا کاروبار کرتا ہے،اب وہ تین ماہ کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔

1992ء سے 1995ء کے درمیانی عرصے میں افغانستان نے ہر سال 2200۔2400 میٹرک ٹن افیون پیدا کی۔ وہ اس باب میں برما کا حریف ہے، جہاں دنیا میں سب سے زیادہ خام افیون پیدا ہوتی ہے۔ 1996ء میں افغانستان نے 2250 میٹرک ٹن افیون پیدا کی۔ اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام کے مطابق قندھار نے اکیلے 3160 ہیکٹر رقبے پر اگائی گئی پوست کی فصل سے 120 میٹرک ٹن افیون حاصل کی۔ 1995ء میں 2400 ہیکٹر رقبے سے 79 میٹرک ٹن افیون پیدا ہوئی تھی۔ 1997ء میں جب طالبان کے کنٹرول میں کابل تک توسیع ہوئی تو افیون کی پیداوار میں محیرالعقول اضافہ ہوگیا۔جس کا اوسط 25 فیصد تھا اور پیداوار 2800 میٹرک ٹن تھی۔ پاکستان سے آنے والے لاکھوں پشتون مہاجر طالبان کے کنٹرول کے علاقوں میں پوست کی کاشت کرنے لگے ہیں اور اس سے خاصی آمدنی حاصل کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام کے مطابق افیون کی تجارت سے ہونے والی

آمدنی کا صرف ایک فیصد کاشت کاروں کو اور 5۔2 فیصد افغانستان اور پاکستان کے ڈیلروں کو ملتا ہے۔ 5 فیصد ان ملکوں میں صرف ہوتا ہے، جن کے راستے ہیروئن گزر کر مغربی ملکوں میں پہنچتی ہے۔ باقی کا منافع یورپ اور امریکہ میں ہیروئن کے کاروبار سے وابستہ افراد میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس لاکھ افغان کاشتکاروں کو پوست کی کاشت سے سالانہ 100 ملین ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ طالبان کم سے کم 10 ملین ڈالر ٹیکسوں میں وصول کرتے ہیں۔

1980ء کے بعد سے تمام مجاہدین جنگی سردار منشیات سے ملنے والے سرمائے کو اپنی فوجی مہموں پر یا نجی ضرورتوں پر صرف کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اس سرمائے سے پشاور میں مکانات خریدے ہیں اور کاروبار شروع کیا ہے۔ نئی جیپ گاڑیاں لی ہیں اور غیر ملکی بنکوں میں سرمایہ جمع کیا ہے۔ وہ منشیات کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہونے سے انکار کرتے ہیں، لیکن اپنے مخالف مجاہدین پر یہ کاروبار کرنے کا الزام ضرور دھرتے رہے ہیں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی اتنا دیانتدار ہو کہ منشیات پر کنٹرول کرنے کے عزم ارادے کا مجاہدین کی طرح اظہار کرتا ہو۔ اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام اور امریکہ کے مطابق 96 فیصد افغان ہیروئن، ان علاقوں سے آتی ہے جو طالبان کے کنٹرول میں ہیں۔ طالبان نے افیون کی پیداوار کے لئے میسر رقبے میں توسیع کی ہے، ان کی فتوحات اور تجارت میں وسعت آنے سے افیون کی نقل وحمل کے لئے نئے راستے کھلے ہیں اور نئی آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ہر مہینے ہمنہ سے جہاں افیون کی پچاس فیصد کاشت ہوتی ہے، ٹیوٹا لینڈ کروزر گاڑیوں کے کئی قافلے لمبے سفر پر نکلتے ہیں۔ ان میں سے بعض جنوب کی طرف بلوچستان کے صحرائی علاقے سے گزرتے پاکستان کے مکران ساحل کی بندرگاہوں تک پہنچتے ہیں، باقی کے قافلے مغربی ایران میں داخل ہوتے ہیں اور تہران سے ہٹ کر گزرتے مشرقی ترکی میں پہنچتے ہیں، باقی کے قافلے شمال مغرب کی جانب ہرات اور ترکمانستان کو جاتے ہیں۔ 1997ء تک ہیروئن کا

کاروبار کرنے والوں نے قندھار اور جلال آباد سے ہیرون خلیجی ریاستوں، ابوظہبی، شارجہ وغیرہ میں پہنچانے کے لئے طیارے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔

افغانستان کی ہیروئن کی پیداوار میں اضافے سے وسطی ایشیاء بری طرح متاثر ہوا۔ سوویت قبضے کے دوران روسی مافیا نے افغانستان سے جو تعلقات استوار کئے، ان کے ذریعے ہیروئن وسطی ایشیاء سے روسی، بالٹک اور یورپ پہنچائی جانے لگی۔ تاجکستان اور کرغیزستان افیون کی نقل وحمل کے لئے اہم راستے بنا لئے، یہی نہیں بلکہ خود بھی افیون پیدا کرنے لگے۔ پہلے افغانستان میں بننے والے افیون کو پاکستان کی لیبارٹریوں میں صاف کیا جاتا تھا، لیکن جب وہاں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور لیبارٹریاں تباہ کی جانے لگیں تو ہیروئن کا کاروبار کرنے والوں نے افغانستان میں اپنی لیبارٹریاں قائم کر لیں۔ افیون کو ہیروئن بنانے کے لئے جو کیمیاوی مادہ استعمال ہوتا ہے وہ وسطی ایشیاء کے راستے افغانستان سمگل کیا جانے لگا۔

ہیروئن کی پیداوار میں دھماکہ خیز اضافہ، افغانستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں ہوا۔ پاکستان 1980ء کے عشرے میں ہیروئن پیدا کرنے والے ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ یہاں ہیروئن کی سالانہ پیداوار 800 میٹرک ٹن اور پوری دنیا کے لئے سپلائی ہونے والی ہیروئن کا 70 فیصد تک پہنچ گئی۔ سی آئی اے اور آئی ایس آئی کی چھتری تلے منشیات کی تجارت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ افغان مجاہدین نے اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا۔ 1792ء کے ایک جائزے میں منشیات سے متعلق امریکی پالیسی کی ناکامی کے حوالے سے بتایا گیا کہ 1980ء کے عشرے میں بدعنوانی، مخفی اقدامات اور منشیات باہم اس طرح گڈمڈ ہو گئے کہ پاکستان میں منشیات کی ترسیل، علاقائی سلامتی اور جنگ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں رہا۔ ویت نام کی طرح جہاں سی آئی اے نے کمیونسٹ مخالف گوریلوں کو منشیات کی تجارت سے صرف نظر کیا اس طرح امریکہ نے افغانستان میں منشیات کے کاروبار میں مجاہدین اور پاکستان کے کاروباری افراد اور فوجی

عناصر کے عمل دخل کو نظر انداز کئے رکھا۔

1980ء کے عشرے میں اس ملی بھگت کا ہلکا سا عکس نمایاں ہوا۔ نیچے جو کچھ ہو رہا تھا یہ اس کے عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ 1983ء میں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمٰن نے کوئٹہ میں آئی ایس آئی کے پورے عملے کو اس بنا پر ہٹا دیا کہ وہ منشیات کی تجارت اور سی آئی اے کی طرف سے مجاہدین کے لئے دیئے جانے والے اسلحے کی فروخت میں ملوث تھا۔ 1986ء میں میجر ظہور الدین آفریدی کو پشاور سے 220 کلوگرام اعلیٰ گریڈ کی ہیروئن کراچی لے جاتے ہوئے پکڑا گیا۔ اتنی بڑی مقدار میں ہیروئن پہلے کبھی نہیں پکڑی گئی تھی۔ دو مہینے بعد فضائیہ کے ایک افسر فلائٹ لیفٹیننٹ خلیل الرحمٰن اسی راستے پر 220 کلوگرام ہیروئن لے جاتا ہوا پکڑا گیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ ہیروئن لے جانے کی اس کی یہ پانچویں بار تھی۔ دو دفعہ پکڑی جانے والی ہیروئن کی قیمت 600 ملین ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ اس سال امریکہ نے پاکستان کو جتنی امداد دی تھی، یہ اس کے برابر تھی۔ دونوں افسروں کو کراچی میں رکھا گیا، جس سے وہ پراسرار انداز میں فرار ہو گئے۔ لارنس لف شلٹز نے لکھا کہ آفریدی اور رحمٰن معاملات سے پتہ چلا کہ فوج بھی ہیروئن کا ناجائز کاروبار کرنے کا ایک باقاعدہ ادارہ بن گیا ہے، جس سے آئی ایس آئی اور افغانستان کا تعلق ہے۔ 1980ء میں امریکی ڈرگ ایڈمنسٹریشن پاکستان میں 17 کل وقتی افسر تھے، جنھوں نے منشیات کا کاروبار کرنے والے 40 بڑے اداروں کی نشان دہی کی، ان میں سے بعض کو اعلیٰ سرکاری افسروں کی سرپرستی حاصل تھی، اس عشرے کے دوران ان میں سے ایک ادارے کو بھی نہیں توڑا جا سکا۔ صاف عیاں ہے کہ سی آئی اے مجاہدین اور پاکستانی افسروں کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ تھا۔ سی آئی اے نہیں چاہتی تھی کہ مجاہدین اور پاکستانی افسروں اور منشیات کی ترسیل کے ذمہ دار افراد اور امریکہ کے انسداد منشیات کے ادارے کے باہمی رابطے کا اس طرح انکشاف ہو، جو ان میں سے کسی کے لئے بھی خفت کا موجب ہو۔ انسداد منشیات کے امریکی ادارے

MashalBooks.org

کے کئی افسر چاہتے تھے کہ انہیں کوئی اور کام سونپا جائے، ایک افسر نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ سی آئی اے نے انہیں فرائض انجام دینے کی اجازت نہ دی تھی۔

جہاد کے دوران مجاہدین اور کابل کی کمیونسٹ فوج کے افسروں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ منشیات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا طریقہ بڑا آسان تھا۔ افغانستان کے لئے اسلحہ لے جانے والے گدھے، اونٹ اور ٹرک واپس خالی آتے تھے۔ اب وہ افیون لانے لگے۔ سی آئی اے اور آئی ایس آئی پشتون سرداروں کو ان کے علاقوں سے اسلحہ گزارنے کے لئے رشوت دیتی تھیں۔ اسی مقصد سے افیون اور ہیروئن کے لیے بھی رشوت دی جانے لگی۔ فوج کا ٹرانسپورٹ کا ادارہ نیشنل لاجسٹک سیل (این ایل سی) اپنے ٹرکوں کے ذریعے سی آئی اے کا جنگی ساز و سامان کراچی کی بندرگاہ سے لے کر پشاور اور کوئٹہ کے راستے افغانستان پہنچاتا تھا۔ با اثر ڈیلروں نے اسی کے ذریعے افیون اور ہیروئن کراچی بھجوانا شروع کر دی۔ فوج، حکومت اور سی آئی اے کے درمیان اعلیٰ سطح کے افسروں کے تعاون سے نہ سہی لیکن ان کے علم کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ ہر ایک نے سوویت یونین کو شکست دینے کے برتر مقصد کے پیش نظر تعرض کرنا مناسب نہ سمجھا، منشیات کا انسداد، ان میں سے کسی کے ایجنڈے پر نہیں تھا۔

1992ء میں جنرل آصف نواز، پاکستانی فوج کے چیف مقرر ہوئے، انہوں نے پاکستانی مسلح افواج میں بن جانے والے ڈرگ مافیا کی بیخ کنی کے لئے سنجیدہ کوششوں کا آغاز کیا۔ ہیروئن سے آنے والا سرمایہ پاکستانی معیشت، سیاست اور معاشرے میں داخل ہو گیا تھا۔ اسلام آباد میں انسداد منشیات کے مغربی اداروں نے منشیات کا ناجائز کاروبار کرنے والے با اثر افراد پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔ ان میں سے کئی ایک وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت 1988ـ(90ء) میں اور نواز شریف کے دور 39(ـ)0991 میں فوجی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ منشیات کا کاروبار کرنے والوں نے بے نظیر کی پاکستانی پیپلز پارٹی اور نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ کے اعلیٰ عہدوں کے

MashalBooks.org

امیدواروں کو سرمایہ فراہم کرنا شروع کر دیا۔ صنعت اور تجارت میں منشیات سے حاصل ہونے والا سرمایہ لگنے لگا۔ ملک میں کالے دھن کی ریل پیل ہوگئی، جس کا پاکستان کی مجموعی معیشت میں حصہ 30 فیصد کے لگ بھگ تھا۔ یہ کالا دھن زیادہ تر منشیات کے ناجائز کاروبار سے حاصل ہوا تھا۔

افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء کے بعد امریکہ اور مغرب نے اسلام آباد پر پاکستان میں افیون کی پیداوار کم کرنے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اگلے عشرے 1989۔(99ء) میں امریکہ اور مغرب نے منشیات پر قابو پانے کے مقصد سے پاکستان کو 100 ملین ڈالر کی امداد دی تو پوست کی کاشت میں نمایاں کمی ہوگئی۔ 800 ٹن کی بجائے 1997ء میں 24 ٹن اور 1999ء میں صرف دوٹن افیون پیدا ہوئی۔ صوبہ سرحد میں کاشت کاروں کو پوست کی جگہ متبادل فصلیں کاشت کرنے کی ترغیب دی گئی، جو بہت موثر ثابت ہوئی۔ تاہم منشیات کا کاروبار کرنے والوں اور ٹرکوں کے مالکوں نے میدان نہیں چھوڑا، طالبان کے آنے کے بعد افغانستان سے افیون اور ہیروئن کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ پاکستان میں تو افیون پیدا ہونا بند ہوگئی تھی لیکن وہ ہیروئن کی برآمد کے لئے ایک اہم وسیلہ ضرور بن گیا۔ اسی کے راستے منشیات باہر بھجوائی جانے لگیں۔ وہی ڈیلر، ٹرک ڈرائیور، مدرسے اور سرکاری وسائل جو طالبان کو اسلحے، ایندھن اور خوراک پہنچانے کا وسیلہ تھے، وہ منشیات کی نقل وحمل کا ذریعہ بن گئے۔

پاکستان بری عادات کا شکار ہونے لگا، 1998ء میں کلنٹن انتظامیہ نے اسلام آباد پر الزام لگایا کہ وہ ہیروئن کی پیداوار اور برآمد روکنے کی بہت کم کوشش کر رہا ہے۔ امریکہ نے یہ تصدیق کرنے سے انکار کر دیا کہ پاکستان ہیروئن کی پیداوار روکنے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ البتہ امریکہ نے اپنی سلامتی کے مفاد میں اتنا ضرور کہہ دیا کہ پاکستان انسداد منشیات پر یقین رکھتا ہے۔ منشیات کا مسئلہ اب افغانستان اور پاکستان تک محدود نہیں رہا تھا۔ منشیات باہر بھجوانے کے کئی راستے کھل گئے تھے۔ علاقے میں

منشیات کے استعمال میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہو گیا۔ 1998ء تک 58 فیصد افیون علاقے کے اندر استعمال ہونے لگی تھی۔ 42 فیصد باہر بھجوائی جاتی تھی۔ 1979ء تک پاکستان میں ہیروئن کا نشہ کرنے والا ایک شخص بھی نہیں تھا۔ 1996ء میں نشہ کرنے والوں کی تعداد 6 لاکھ 50 ہزار ہو گئی تھی۔ 1992ء میں یہ بڑھ کر 30 لاکھ ہو گئی۔ ہیروئن کے نشے اور منشیات سے آنے والے سرمائے کے باعث امن و قانون کے مسائل پیدا ہو گئے۔ بیروزگاری بڑھ گئی، نسلی اور فرقہ پرست انتہا پسندوں نے اپنے آپ کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ ایران کی حکومت نے بھی تسلیم کیا کہ وہاں 1998ء میں نشہ کرنے والوں کی تعداد بارہ لاکھ کے قریب تھی لیکن تہران میں ایک سرکاری افسر نے مجھے بتایا کہ یہ تعداد 30 لاکھ کے لگ بھگ تھی اور یہ اس صورت میں تھا کہ ایران منشیات کا شدید مخالف ہے۔ اس بات میں شاید ہی کوئی دوسرا ملک اس کا حریف ہو۔ ایران میں جس کسی سے بھی چند اونس ہیروئن پکڑی جاتی ہے، اسے موت کی سزا دے دی جاتی ہے۔ ایران نے منشیات کی لعنت سے بچنے کے لئے پاکستان سے کہیں زیادہ بڑھ کر اقدامات کئے ہیں۔ 1980ء کے بعد سے ایران نے افغانستان سے منشیات لانے والے ٹرکوں کے قافلوں کو رکوانے کے لئے جو اقدامات کئے، ان میں اس کی سیکیورٹی فورس کے 2500 افراد جاں بحق ہوئے، ستمبر 1998ء میں ایران نے طالبان سے کشیدگی کے بعد افغانستان کے ساتھ اپنی سرحد بند کر دی۔ ایران کی سیکیورٹی فورس نے اس سرحد سے، چند ہفتوں میں پانچ ٹن ہیروئن پکڑی۔ سرحد بند ہو جانے سے ہیروئن کی برآمد رک گئی، جس کے سبب سے طالبان کو بڑا مالی خسارہ ہوا۔ ہیروئن ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان اور کرغیزستان کے راستے سمگل ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں ان وسطی ایشیائی جمہوریتوں میں بھی ہیروئن کا نشہ کرنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ 1998ء میں تاجکستان افغانستان سرحد پر ایک ٹن افیون اور 200 کلوگرام ہیروئن پکڑی گئی۔ جنوری 1999ء میں تاجکستان کے صدر امام علی رحمانون نے ایک بین

الاقوامی پریس کانفرنس میں بتایا کہ افغانستان سے ہر روز ایک ٹن منشیات ان کے ملک میں سمگل ہو کر آ رہی ہے۔ اسی نسبت سے نشے کے استعمال میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ازبکستان کا کہنا تھا کہ 1998ء کے دوران افغانستان سے گیارہ فیصد زیادہ منشیات سمگل ہو کر آئیں۔

میں نے ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد میں فائیو سٹار ہوٹلوں کے باہر ہیروئن کھلے عام بکتے دیکھی۔ ہوٹلوں کے اندر روسی اور ترکمانی مرد اور عورتیں کاروبار کے لئے افغانستان کی سرحد پر جانے کا اکثر ذکر کرتے سنے گئے۔ 1997ء میں حکام نے دو ٹن ہیروئن اور 83 ٹن حشیش پکڑی۔ 1999ء میں ترکمانستان جس کا رویہ طالبان کے حق میں نرم اور مصالحانہ ہے۔ افغان ہیروئن کی بیرون ملک نکاسی کا بڑا وسیلہ بن گیا، بدعنوان ترکمانستانی افسر یہ تبدیلی لانے میں پیش پیش رہے۔ کرغیزستان کے صدر عسکر آقائیف نے جنوری 1999ء میں مجھے بتایا کہ ان کا ملک ہیروئن کی برآمد کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ اس وجہ سے جرائم زیادہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک افغانستان میں خانہ جنگی ختم نہیں ہوتی اور امن قائم نہیں ہوتا، اس وقت تک منشیات کی لعنت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک افغانستان میں امن قائم نہیں ہو جاتا، منشیات کے خلاف جنگ نہیں جیتی جا سکتی، خانہ جنگی پورے علاقے کے عدم استحکام کا موجب ہے۔ افغانستان سے ہیروئن کا جو سیلاب اٹھا ہے وہ علاقے کی سیاست اور معیشت پر اثر انداز ہونے لگا ہے۔ یہ معاشروں کو اپاہج کرنے اور پہلے سے کمزور اور ناتواں ریاستوں کی معیشت کو مسخ کرنے کا سبب بن گیا ہے۔ ایک طرف منشیات کی بنا پر امارت حاصل کرنے والے ہیں، دوسری طرف روز افزوں غربت کی اسیر آبادی ہے۔ اسلام آباد میں ایک مغربی سفیر نے کہا کہ منشیات اس علاقے کی سیاست پر جتنی اب اثر انداز ہے، پہلے کبھی نہیں تھی۔ وہی سیاست کا رخ متعین کرنے لگی ہے۔ ہم اسلامی بنیاد پرستی دہشت گردی، علاقے کے بعض ملکوں کی اقتصادی تباہی کے زمرے میں منشیات کے تباہ

کن اثرات کو بھی شامل کرنے لگے ہیں۔

خراب ہوتی ہوئی صورت حال نے عالمی برادری کو طالبان سے مذاکرات کرنے کی تحریک کی ہے۔ چھ ماہ کی خفیہ گفت وشنید کے بعد اکتوبر 1997ء میں اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام نے طالبان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جس کے تحت طالبان نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا کہ اگر عالمی برادری متبادل فصلیں اگانے کے لئے سرمایہ فراہم کرے تو افغانستان میں پوست کی کاشت ختم کی جاسکتی ہے۔ پروگرام کے سربراہ نے معطی ملکوں سے 25 ملین ڈالر دینے کے لئے کہا۔ اس رقم سے آئندہ دس برس میں پوست کی جگہ دوسری فصلیں بونے کی صورت نکالی جاتی۔ افغانستان میں پیدا ہونے والی ہیروئن کا 80 فیصد یورپ اور 50 فیصد پوری دنیا کو جاتا ہے۔ ارلاچی کا کہنا تھا کہ ہم دنیا کو سپلائی ہونے والی ہیروئن میں نصف کمی کرنا چاہتے ہیں اور نئی نقدآور فصلیں متعارف کرانا چاہتے ہیں۔ آبپاشی کے نظام کی اصلاح، نئی صنعتوں کا قیام اور قانون کی عمل داری بھی اس پروگرام کا حصہ ہے۔ طالبان نے اس معاہدے پر کبھی عمل درآمد نہیں کیا۔

1998ء میں افغانستان سے اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کے نکل جانے کے بعد معاہدہ یکسر بے اثر ہو کر رہ گیا۔ چھ ماہ بعد ارلاچی نے مایوسی کے عالم میں بتایا کہ افغانستان دنیا کے سب سے مشکل علاقوں میں سے ہے۔ منشیات کی پیداوار پر قابو پانے کے لئے وسیع تر سیاسی مفاہمت کی ضرورت ہے۔ اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام کے مقاصد سے ہمدردی رکھنے اور ان کی تکمیل میں مدد پر کمربستہ رہنے والے بھی کچھ ایسے پرامید نہیں تھے۔ 1993ء سے 1997ء کے درمیان ڈرگ کنٹرول پروگرام نے منشیات کے انسداد کے لئے عالمی معطی ملکوں سے 1644 ملین ڈالر طلب کئے تھے، لیکن اسے صرف نصف رقم ملی۔

افیون کے برآمدی ٹیکس طالبان کی آمدنی اور جنگی معیشت کو سہارا دینے کا وسیلہ بن گئے۔ 1995ء میں پروگرام کا اندازہ تھا کہ پاکستان اور افغانستان کو منشیات کی برآمد

سے سالانہ 50 ارب روپے کی آمدنی ہو رہی ہے۔ 1998ء میں ہیروئن کی برآمد سے ہونے والی آمدنی دوگنی ہو گئی اور 3 ارب ڈالر تک پہنچ گئی۔ منشیات سے ملنے والی رقم سے اسلحہ، گولہ بارود اور ایندھن حاصل کیا جاتا۔ اسی سے سپاہیوں کے لئے خوراک اور کپڑے فراہم ہوتے، تنخواہیں دی جاتیں۔ ٹرانسپورٹ کے مصارف پورے کئے جاتے اور سپاہیوں کے لئے ایسی تفریح کا اہتمام کیا جاتا، جس کی طالبان قیادت اجازت دیتی۔ طالبان کے حق میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ماضی کے برعکس رقم کا کوئی حصہ بھی طالبان لیڈروں کی جیبوں میں نہیں جاتا تھا۔ وہ بے حد سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن منشیات کا کاروبار کرنے والے افغان اور پاکستانی بڑے مالدار ہو گئے۔

منشیات کے کاروبار کے ساتھ ساتھ روایتی افغان ناجائز تجارت خوب پھلی پھولی، اس تجارت کا دائرہ پاکستان اور خلیجی ریاستوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس ناجائز تجارت سے علاقے کے ملکوں میں معیشت کو بے اندازہ نقصان پہنچا۔ افغان راہداری تجارت کا باب 15 میں تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ طالبان کی سرکاری آمدنی کا زیادہ تر حصہ (3 ارب ڈالر سالانہ) اس ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔ قندھار، کابل اور ہرات میں کسٹمز افسر اپنی یومیہ آمدنی کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے، لیکن ہر روز تین سو ٹرک قندھار سے ایران اور ہرات کے راستے وسطی ایشیاء جاتے ہیں اور 200 ٹرک جلال آباد اور کابل کے راستے شمال کی طرف جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ افغانستان کو ہر روز کتنی آمدنی ہو جاتی ہے۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء خوراک اور ایندھن کی غیر قانونی تجارت نے ہمسایہ ملکوں کی صنعت کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ آمدنی اور سرکاری محاصل میں خاصی کمی ہوئی ہے، خوراک کی فراہمی میں بھی رخنہ پڑتا رہا ہے اور ہمسایہ ملکوں کی معیشت پر جہاد کے زمانے میں کہیں بڑھ کر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

طالبان کو کسٹمز کے ذریعے جو آمدنی ہوتی ہے، وہ سٹیٹ بینک آف افغانستان کے توسط سے تقسیم، ہوتی ہے، تمام صوبوں میں بنک کی شاخیں کھولی جا رہی ہیں لیکن کھاتوں

میں یہ درج نہیں ہوتا کہ رقم کہاں سے آئی اور کہاں خرچ ہوئی۔ سرکاری آمدنی جنگ کے کھاتے میں شمار نہیں ہوتی۔ جنگی مصارف کا سارا انتظام قندھار میں ملا عمر کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رقم منشیات کی مد سے حاصل ہوتی ہے یا پاکستان، سعودی عرب اور دوسرے معطی ملکوں سے ملتی ہے۔ خزانے کے نائب وزیر مولوی عارف اللہ عارف نے تسلیم کیا کہ ہماری آمدنی کے ذرائع میں کسٹمز، معدنیات اور زکوٰۃ شامل ہے۔ جنگ کے لئے آمدنی کے مزید وسائل بھی ہیں۔ یہ سٹیٹ بینک کے حوالے سے میسر نہیں آتے، جنگ ملا عمر کے براہ راست انصرام میں ہے۔ انہوں نے ٹین کی پیٹیوں میں ہر طرح کے کرنسی نوٹ بھر کر اپنی چارپائی کے نیچے رکھ لیئے ہیں۔ طالبان کو اقتصادی ماہرین کی خدمات حاصل ہوتیں تو شاید وہ بجٹ بنانے کی سوچتے لیکن وہ اس تکلف سے مبرا ہیں۔ وزارت خزانہ میں کوئی مستند ماہر اقتصادیات یا بنکر نہیں تھے، وزیر اور ان کے نائبین مدرسوں کے پڑھے لکھے ہیں، تھوڑا بہت علم رکھنے والے بیوروکریٹس کو نکال باہر کیا گیا ہے۔ سرمائے کی کمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1997ء میں وزارت خزانہ نے پورے ملک کی انتظامیہ اور فروری 1997ء سے جنوری 1998ء کے مالی سال کے ترقیاتی پروگراموں کے لئے ایک لاکھ ڈالر کا مساوی بجٹ منظور کیا۔ اصل میں یہ رقم تو صرف تنخواہوں کے لئے بھی ناکافی ہے۔

طالبان میں شامل چند ملا تاجروں نے جو صنعت اور بیرونی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے حق میں ہیں لیکن طالبان کی لیڈر شپ ان کی حمایت کرنے میں سنجیدہ نہیں۔ معدنی وسائل اور صنعتوں کے وزیر مولوی احمد جان سعودی عرب میں قالینوں کا کاروبار کرتے تھے۔ طالبان میں شامل ہونے کی غرض سے انہوں نے اپنا یہ کاروبار چھوڑ دیا۔ وہ افغانستان میں صنعتوں کے قیام اور فروغ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم افغانستان کو ایک جدید ملک کے طور پر ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس وسیع معدنی، تیل اور گیس کے وسائل ہیں جو غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لئے اپنے اندر دلچسپی کا سامان

MashalBooks.org

رکھتے ہیں۔ جنوب کا کنٹرول حاصل کرنے سے پہلے ملک میں کوئی صنعت نہیں تھی۔ اب ہم نے پاکستان اور افغان تاجران کی مدد سے قالین سازی کی فیکٹریاں کھول لی ہیں، انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ طاقتور قندھار شوریٰ کے بہت کم ارکان اقتصادی مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں، کیونکہ وہ جنگ میں بری طرح مصروف ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں بالخصوص پاکستانی تاجروں کو سرمایے کاری کی ترغیب دلانے کے لئے احمد جان نے فیکٹری لگانے کے خواہش مند افراد کے لئے مفت قطعہ زمین کی پیش کش کی ہے۔ لیکن ملک کا انتظامی ڈھانچہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس صورت میں وہی لوگ سرمایہ لگا سکتے ہیں جو خود ہی سڑکیں بنائیں، بجلی پیدا کریں اور مکانات تعمیر کریں۔ پشاور اور کوئٹہ میں رہنے والے پاکستانی اور افغان ٹرانسپورٹر اور تاجر جو پہلے ہی سمگلنگ یا افغانستان سے لکڑی کی تجارت میں مصروف ہیں، معدنیات نکالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ملک میں تعلیم یافتہ پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے موجود نہیں۔ 2991ء کے بعد سے مہاجروں کی جو مختلف لہریں شہروں سے اٹھتی رہی ہیں، ان میں تمام پڑھے لکھے، تربیت یافتہ، پیشہ ور، حتیٰ کہ ٹیلی فون آپریٹر، الیکٹریشن اور مکینک تک ملک چھوڑ گئے ہیں۔ فنانس، معیشت اور سماجی شعبے کا انتظام ملا تاجروں، کاروباری افراد، ٹرک ٹرانسپورٹروں اور اسمگلروں کے ہاتھ میں ہے، جن کے نزدیک قوم کی تعمیر کا مطلب صرف یہ ہے کہ سمگلنگ کی مارکیٹ کی توسیع ہو اور علاقے میں ٹرکوں کے آنے جانے میں آسانی ہو جائے۔ ایک ایسا ہی ملا عبدالرشید ہے وہ خونخوار دکھائی دیتا ہے۔ ہلمند کا رہنے والا ہے اور طالبان کمانڈر سمجھا جاتا ہے۔ اپریل 1997ء میں اس نے ایک پاکستانی فوجی دستے کو جو منشیات کے سمگلروں کا پیچھا کرتا ہوا بلوچستان سے افغانستان کے علاقے میں آ گیا تھا، پکڑ لیا۔ اس بنا پر وہ خاصا بدنام ہوا۔ اس نے پاکستانی فوجی سپاہیوں کو پکڑ کر قندھار بھیج دیا۔ اس پر پاکستان سے جھگڑا ہو گیا۔ ہلمند میں اس کی سنگ مرمر کی کانیں ہیں، جن میں 500 کان کن کام کرتے ہیں۔ ان میں کوئی انجینئر نہیں، ان کے پاس کوئی

ساز وسامان نہیں، نہ انہیں بجلی میسر ہے اور نہ ہی کان کنی کے ضمن میں کسی قسم کی مہارت حاصل ہے۔ ان کے پاس ایک ہی طریقہ ہے کہ بارود سے کان کو اڑاؤ اور سنگ مرمر حاصل کرو۔ لیکن اس طرح سنگ مرمر ٹوٹ جاتا ہے یا اس میں گہری خراشیں آ جاتی ہیں۔

طالبان کی بیرونی سرمایہ کاری کے بارے میں طلب اس وقت پیدا ہوئی، جب ارجن ٹائین کی تیل کمپنی بریداس اور امریکہ کمپنی یونوکال، ترکمانستان سے جنوبی افغانستان کے راستے پاکستان تک گیس پائپ لائن بچھانے کے لئے طالبان کی حمایت حاصل کرنے کی دوڑ میں شامل ہوئیں۔ اس منصوبے میں وہ افغان اور پاکستانی تاجر دلچسپی لینے لگے، جنہوں نے قندھار میں اور ہرات تک جانے والی سڑک کے کنارے پٹرول پمپ تعمیر کئے تھے۔ انہوں نے سڑکیں تعمیر کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ 1999ء میں امریکہ کے ایک گروپ نے طالبان کو کابل سے قندھار کے درمیان موبائیل ٹیلی فون کا نظام قائم کر کے دیا۔ یہ سرگرمیاں باقاعدہ معیشت کی تعمیر نو کے ضمن میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتی تھیں، ان کا واحد مقصد طالبان کو سمگلنگ کے کاروبار میں سہولت فراہم کرنا اور تاجروں اور سمگلروں کے لئے آسانی پیدا کرنا تھا۔ جب تک خانہ جنگی ختم نہیں ہوتی اور ایک ایسی حکومت قائم نہیں ہو جاتی، جو کم سے کم استحکام اور عوام کی وفاداری کی ضمانت دے، نہ تو غیر ملکی سرمایہ کاری کی راہ کھل سکتی ہے اور نہ تعمیر نو کے سلسلے میں سنجیدہ کوششوں کا آغاز ہو سکتا ہے۔

دریں اثناء افغانستان کی حیثیت ایک ایسے اقتصادی بلیک ہول کی رہے گی، جو علاقے میں پہلے ہی گونا گوں اقتصادی بحرانوں کا شکار ہے۔ وہ عدم استحکام اور انتشار کی لہریں پھیلاتا رہے گا۔ افغانستان کا انتظامی ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے۔ کسی پسماندہ ملک میں بھی جتنی شہری سہولتیں ہو سکتی ہیں وہ افغانستان میں سرے سے ناپید ہیں، پانی نہیں، بجلی نہیں، ٹیلی فون نہیں، سڑکیں نہیں۔ ایندھن کی فراہمی کا کوئی مستقل انتظام نہیں۔ اگر ہیں

بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ خوراک، پانی، رہائش اور دوسری بنیادی ضروریات پوری کرنے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اگر کہیں ہے تو اتنا مہنگا کہ اکثر لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

جنگ کے دوران شہروں اور دیہی علاقوں میں جو لاکھوں بارودی سرنگیں بچھائی گئی تھیں، وہ بحالی کے سلسلے میں بے حد دشواریاں پیدا کرنے کا موجب ہیں۔ زرخیز زمینوں کو زیر کاشت لانا اور میسر آبی وسائل سے فائدہ اٹھانا ان سرنگوں کے باعث مشکل ہو گیا ہے۔ 1979ء کے بعد سے بارودی سرنگوں کے پھٹنے کے باعث چار لاکھ افراد ہلاک اور چار لاکھ زخمی ہو چکے ہیں۔ 13 فیصد افغان خاندانوں کا ایک نہ ایک فرد یا تو ہلاک ہوا ہے یا جسمانی طور پر معذور ہو چکا ہے۔ ان بارودی سرنگوں کے پھٹنے سے ہر مہینے 300 افراد ہلاک یا معذور ہو جاتے ہیں۔ اقوام متحدہ اور این جی اوز کی طرف سے بارودی سرنگیں صاف کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ سرنگوں کا کھوج لگانے کے لئے چار ہزار خاص آلات سے کام لیا جا رہا ہے۔ اندازہ ہے کہ شہری اور دیہی علاقوں سے بارودی سرنگیں صاف کرنے میں کم سے کم دس برس لگیں گے۔ چھ سال کی وسیع پیمانے کی کوششوں سے کابل کے پانچ سو مربع میل علاقے میں سے 200 مربع میل علاقے میں بارودی سرنگیں صاف نہیں کی جا سکیں۔

بارودی سرنگوں کے علاوہ اکثر کابلیوں کو جو دوسرا اہم مسئلہ درپیش ہے وہ افغانی لوگوں کے حصول کا ہے کہ انہی سے اشیائے خورد و نوش خریدی جا سکتی ہیں۔ دکانیں ایران اور پاکستان سے اسمگل شدہ اشیائے خوراک سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن لوگوں کے پاس انہیں خریدنے کے لئے پیسے نہیں، افغان سرجن، جو ملک سے فرار نہیں ہوئے، انہیں پانچ ڈالر کے مساوی ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ ریڈ کراس سے انہیں جو مدد ملتی ہے اسی کے سہارے وہ زندگی گزار رہے ہیں۔ تنخواہوں کی ایک سے تین ڈالر ماہانہ کی اوسط ہے۔ شہروں میں لوگوں کی اکثریت کا تمام تر دارومدار اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کی امداد اور رعایتی نرخوں پر

ملنے والی خوراک پر ہے۔ کابل کی بارہ لاکھ کی آبادی کے پچاس فیصد کا دارومدار مغربی ملکوں کی ایجنسیوں کی غذائی امداد پر ہے۔

اقوام متحدہ کو مسلسل یہ مسئلہ درپیش ہے کہ آیا اس کی انسانی بنیادوں پر دی جانے والی امداد جنگ کو طول دینے کا سبب ہے؟ کیونکہ اس طرح جنگی سرداروں کو سول آبادی کے ضمن میں کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہ کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ طالبان تکرار کرتے رہتے ہیں کہ وہ عام افغانوں کے ذمہ دار نہیں، اللہ ہی مسبب الاسباب ہے، وہی انہیں روزی دے گا۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اقوام متحدہ اور این جی اوز اگر اپنا ہاتھ کھینچ لیں اور خوراک مہیا کرنا چھوڑ دیں تو عام افغانوں، بیواؤں اور بچوں کے مصائب میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

1998ء میں اقتصادی صورت حال مزید خراب ہو گئی۔ شمالی افغانستان میں تین تباہ کن زلزلے آئے۔ ہزارہ جات پر طالبان کے قبضے سے وسطی افغانستان میں وسیع پیمانے پر بھوک پڑ گئی۔ قندھار میں سیلاب آنے سے دیہات اور فصلیں زیر آب آ گئیں۔ اگست 1998ء میں امریکہ کی طرف سے مزائیلوں کے حملے کے نتیجے میں مغربی امدادی ایجنسیاں ملک سے نکل گئیں۔ اس سے شہری آبادی کو امداد ملنا بند ہو گئی۔ 1998۔99ء کی شدید سردی میں کابل کے گلی کوچوں میں غذائی قلت کے مظاہرے دیکھنے میں عام مل جاتے تھے۔ معدودے چند افراد کو بمشکل ایک وقت کی روٹی میسر آتی تھی۔ گھروں کو گرم کرنے کا کوئی سامان نہیں تھا۔ بس ایک صورت تھی کہ ملک میں امن قائم ہو جاتا۔ جس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ عالمی خوراک پروگرام میں 1998ء میں غذائی اجناس کی پیداوار کا اندازہ 3ء85 ملین ٹن تھا۔ اس سے پہلے سال کی پیداوار سے پانچ فیصد زیادہ 1978ء بعد غذائی پیداوار کے لحاظ سے یہ سب سے اچھا سال تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ طالبان کے قبضے میں دیہی علاقوں میں امن و قانون کی حالت قدرے بہتر ہوئی ہے۔ لڑائی میں کمی آئی ہے اور مہاجروں نے واپس آ

کر کھیتی باڑی شروع کر دی ہے۔ تاہم پاکستان میں 12 لاکھ اور ایران میں 14 لاکھ افغان مہاجر ابھی تک موجود ہیں۔ 1992ء اور 1999ء کے درمیان 40 لاکھ مہاجر واپس آ چکے ہیں۔ طالبان اور اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کو شہروں میں غذائی قلت پر قابو پانے کے لئے 7 لاکھ 50% ٹن گندم درآمد کرنا پڑی۔ صاف عیاں ہے کہ افغانستان میں اقتصادی تباہی طالبان کی پیدا کردہ نہیں ہے، انہیں یہ خانہ جنگی سے ورثے میں ملی ہے، جو 1992ء سے مختلف گروہوں نے برپا کر رکھی ہے۔ لیکن طالبان سمیت کسی بھی دھڑے نے سول آبادی کی ضرورتیں پوری کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ مغربی ممالک عطیئے میں امداد دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ خانہ جنگی جاری رہے اور باہم برسرپیکار دھڑے ذمہ داری کا ثبوت نہ دیں تو ایسے میں مزید مالی امداد کے مطالبے کی تسکین کیسے ہو! افغان عوام کو جو مصیبت اٹھانا پڑی وہ بڑی سنگین اور وحشت ناک ہے۔ 1998ء تک اقوام متحدہ کے افغانستان کے لئے افسر رابطہ الفریڈو وٹسچی سسٹاری نے کہا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مالی امداد کم سے کم ہوتی چلی گئی، ہمیں جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی، بمشکل ان کے نصف حاصل کر سکتے، جنگی سردار ملک کی تعمیر نو سے برائے نام دلچسپی بھی نہیں رکھتے۔ افغانستان کا اقتصادی بلیک ہول روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے جو زیادہ سے زیادہ اپنی ہی آبادی کو نگل رہا ہے۔

MashalBooks.org

عرب، افغان اور اسامہ بن لادن

طورخم میں، درہ خیبر کے سرے پر ایک زنجیر پاکستان اور افغانستان کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ پاکستان کی طرف شلوار قمیص اور دستار میں ملبوس فرنٹیئر سکاؤٹس کھڑے ہیں، سوویت فوج کے انخلاء کے بعد اپریل 1989ء میں، میں کابل سے واپس پاکستان آ رہا تھا، لیکن راستہ بند تھا، سفر سے تھک گیا تھا۔ اس لئے سرحد پر افغانستان کی طرف گھاس پر لیٹ کر انتظار کرنے لگا۔ اچانک میرے پیچھے ایک ٹرک آ کر رکا، اس میں مجاہدین تھے، لیکن وہ افغان نہیں تھے، وہ کھلتے رنگ کے عرب، نیلی آنکھوں والے وسط ایشیائی اور چینیوں کی سی شباہت رکھنے والے تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں اور پگڑیوں میں ملبوس تھے، انہوں نے کلاشنکوفیں پکڑ رکھی تھیں اور ان کے جسموں پر گولیوں سے بھری پٹیاں لٹک رہی تھیں۔ ان میں صرف ایک افغان تھا جو ترجمانی کا کام بھی کرتا تھا اور رہنمائی کا بھی۔ 30 غیر ملکیوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو ترجمان کے فرائض انجام دیتا اور رہنمائی کا بھی۔ ان میں سے کوئی بھی پشتو، دری یا اردو نہیں بول سکتا تھا۔ ہم سرحد کھلنے کے انتظار میں تھے۔ ہم نے آپس میں بات چیت کرنا شروع کر دی، اس گروہ میں فلپائن کے مورد قبیلے، مصر، سعودی عرب، کویت اور چین کے صوبہ سنجیلنگ کے لوگ تھے۔ اس کے ساتھ آنے والا افغان گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی کا رکن تھا۔ گروہ کے ارکان سرحد کے قریب ایک کیمپ میں تربیت حاصل کر رہے تھے، وہ ہفتہ وار

چھٹی پر پشاور جا رہے تھے۔ جہاں سے انہیں گھر سے آئی ہوئی ڈاک لینا تھی، کپڑے بدلنا تھا اور سیر ہو کر کھانا کھانا تھا۔ وہ مجاہدین سے مل کر جہاد کرنے آئے تھے، انہیں اسلحہ چلانے، بم بنانے اور فوجی داؤ پیچ سیکھنا تھے اور پھر اپنے ملکوں میں جا کر جہاد میں حصہ لینا تھا۔

اس شام وزیراعظم بےنظیر بھٹو نے اسلام آباد میں صحافیوں کو ڈنر دینے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مدعوئین میں لیفٹننٹ جنرل حمید گل بھی شامل تھے، وہ آئی ایس آئی کے سربراہ اور صدر ضیاء الحق کی موت کے بعد فوج میں اسلامی نظریے کے سب سے پرجوش مبلغ ہیں۔ جنرل گل سوویت فوجوں کے انخلاء کے بعد فتح مندی کے جذبے سے سرشار تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اسلامی ملکوں سے جو پاکستان کے حلیف ہیں، انتہا پسندوں کو بلا کر آگ سے نہیں کھیل رہے ہیں؟ کیا یہ لوگ اپنے ملکوں میں تفرقہ نہیں ڈالیں گے اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کے لئے مشکلات کھڑی کرنے کا موجب نہیں ہوں گے؟ جنرل نے جواب دیا کہ ہم جہاد میں مصروف ہیں۔ یہ جدید دور پہلا اسلامی بریگیڈ ہے، کمیونسٹوں کے اپنے بین الاقوامی بریگیڈ ہیں، مغرب کے پاس نیٹو ہے، مسلمان متحد ہو کر ایک مشترکہ محاذ کیوں قائم نہ کریں؟ یہ عرب افغان اتحاد کا پہلا اور واحد جواز پیش کیا گیا، اگرچہ اس میں نہ تو کوئی افغان تھا اور نہ کوئی عرب۔

تین برس پہلے 1986ء میں سی آئی اے کے سربراہ ولیم کیسی نے تین اہم اقدامات کر کے، جو اس وقت نہایت خفیہ رکھے گئے تھے۔ سوویت یونین کے خلاف جنگ کو تیز کیا تھا، انہوں نے امریکی کانگریس کو قائل کیا کہ وہ مجاہدین کو امریکی ساخت کے سٹنگر مزائیل اور طیارہ شکن مزائیل دیں جو مجاہدین کو سوویت طیارے مار گرانے کے کام آئیں گے۔ امریکی مشیر اس اسلحے کو چلانے کی تربیت دیں، اس وقت تک امریکی اسلحہ یا افراد جنگ میں براہ راست استعمال نہیں کئے گئے تھے۔ سی آئی اے برطانیہ کے ایم آئی 6 اور آئی ایس آئی نے تاجکستان اور ازبکستان میں اشتعال انگیز گوریلا حملے کرنے سے

متعلق منصوبے پر اتفاق کیا۔ سوویت یونین کی ان مسلم ریاستوں سے ہی افغانستان میں سوویت فوج کو اسلحہ اور دوسرا ساز و سامان پہنچتا تھا۔ یہ کام آئی ایس آئی کے پسندیدہ مجاہد لیڈر گلبدین حکمت یار کو سونپا گیا۔ مارچ 1987ء میں چھوٹے چھوٹے یونٹوں نے شمالی افغانستان کے اڈوں سے دریائے آمو عبور کر کے، تاجکستان کے دیہات پر راکٹوں سے حملہ کیا۔ یہ خبر پا کر سی آئی اے کا سربراہ ولیم کیسی بہت خوش ہوا، اس نے پاکستان کے اپنے دوسرے خفیہ دورے میں مجاہدین گروپوں کا جائزہ لینے کی خاطر صدر ضیاء الحق کے ساتھ افغان سرحد عبور کی، کیسی نے آئی ایس آئی کی خواہش کے مطابق دنیا بھر سے مجاہد مسلمانوں کو بھرتی کر کے پاکستان لائے اور افغان مجاہدین سے مل کر لڑنے پر آمادہ کرنے کی حامی بھر لی۔ آئی ایس آئی 1982ء سے اس رجحان کی محرک چلی آ رہی تھی، اب دوسرے شرکاء نے بھی اس کی اپنے اپنے طور پر حمایت شروع کر دی۔ صدر ضیاء اسلامی اتحاد قائم کرنے، پاکستان کو اسلامی دنیا کا لیڈر بنانے اور وسطی ایشیاء میں مسلم اپوزیشن منظّم کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ واشنگٹن یہ دکھانا چاہتا تھا کہ پوری اسلامی دنیا افغانوں اور ان کے امریکی پشت بانوں سے مل کر سوویت یونین کے خلاف نبرد آزما ہے۔ سعودی موقع سے فائدہ اٹھا کر وہابیت کو فروغ دینے اور ناراض عناصر سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔ اس کھیل کے شرکاء میں سے کسی نے بھی ان رضا کاروں کے بارے میں یہ نہیں سوچا کہ ان کے اپنے مقاصد ہیں اور یہ سوویت یونین کے خلاف اپنی نفرت کا رخ آخر کار اپنی حکومتوں اور امریکنوں کے خلاف موڑ دیں گے۔

پاکستان نے پہلے سے ہی غیر ممالک میں اپنے سفارت خانوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جو کوئی آئے اور مجاہدین کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتا ہو، اسے پوچھ گچھ کے بغیر ویزہ دے دیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں اخوان المسلمین، سعودی عرب میں عالم اسلامی اور فلسطینی اسلامی مجاہدین نے رضا کار بھرتی کئے اور انہیں پاکستان بھیج دیا۔ آئی ایس آئی اور

جماعت اسلامی نے ان مجاہدوں کو خیر مقدم کرنے کے لئے استقبالیہ کمیٹیاں قائم کیں اور ان کے قیام اور تربیت کا انتظام کیا، پھر انہیں مجاہدین کے گروپوں خاص طور پر حزب اسلامی میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ اس سارے انتظام کے لئے سرمایہ سعودی انٹیلی جینس نے فراہم کیا۔ فرانسیسی دانشور اولیور رائے کے مطابق یہ سعودیوں، اخوان المسلمین اور جماعت اسلامی کا مشترکہ منصوبہ تھا اور اس تنظیم میں آئی ایس آئی کا ہاتھ تھا۔ 1982ء سے 1992ء تک کے عرصے میں مشرقی وسطیٰ شمالی اور مشرقی افریقہ، وسطی ایشیاء اور مشرقی بعید کے 43 اسلامی ملکوں سے 35000 مسلم انتہا پسند، افغان مجاہدین سے آ ملے۔ لاکھوں غیر ملکی مسلمانوں نے ان سینکڑوں مدرسوں میں داخلہ لے لیا، جنہیں وہاں کی فوجی حکومت مالی امداد فراہم کر رہی تھی۔ بالآخر ایک لاکھ مسلمان انتہا پسندوں کا پاکستان اور افغانستان سے براہ راست رابطہ قائم ہو گیا اور انہوں نے جہاد کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ پشاور کے قریب اور افغانستان میں قائم کیمپوں میں ان انتہا پسندوں کا آپس میں پہلی مرتبہ ملاپ ہوا اور انہوں نے مل کر تربیت حاصل کی اور مل کر ہی لڑائی میں حصہ لیا۔ انہیں پہلی مرتبہ دوسرے ملکوں کی اسلامی تحریکوں کے بارے میں علم ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ عملی اور نظریاتی روابط قائم کئے جو آئندہ کے لئے ان کے کام آئے۔

انٹیلی جینس اداروں میں سے کسی نے بھی دنیا بھر کے ہزاروں مسلم انتہا پسندوں کو باہم اکٹھا کرنے کے مضمرات پر غور نہ کیا۔ عالمی نقطہ نظر سے تاریخی تناظر میں کیا ضروری تھا؟ طالبان یا سوویت سلطنت کا بکھرنا؟ ایک سابقہ امریکی قومی سلامتی کے مشیر زبگنیو برزنسکی کے اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس نے صحیح کہا کہ چند مسلمانوں کا جوش جہاد یا وسطی یورپ کی آزادی اور سرد جنگ کے خاتمے میں سے کسے اہم سمجھنا چاہیے؟ امریکی شہریوں پر صورت حال کے مضمرات اس وقت کھلے، جب افغانستان میں تربیت پانے والے مسلم انتہا پسندوں نے 1993ء سے نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر اڑا دیا، اس

میں چھ افراد ہلاک اور ایک ہزار زخمی ہوئے۔

سموئیل ہنٹنگ ٹن نے لکھا کہ جنگ کا نتیجہ اسلامی تنظیموں کے اتحاد کی صورت میں نکلا، جن کا مقصد تمام غیر مسلم طاقتوں کے خلاف اسلام کو بڑھاوا دینا تھا۔ اس کے علاوہ ماہر اور تجربہ کار لڑاکوں، تربیتی کیمپوں، نقل و حمل کی سہولتوں، دنیائے اسلام میں افرادی اور تنظیمی روابط۔ خاصی بھاری مقدار میں فوجی ساز و سامان، 300 سے 500 تک سوویت مزائیل اور سب سے اہم طاقت کا احساس اور مقاصد کی تحصیل پر خود اعتماد اور مزید فتوحات کی خواہش بھی، جنگ کے نتائج میں شامل ہے۔ اکثر انتہا پسندوں کا خیال تھا کہ اگر افغان جہاد نے سوویت یونین کی سپر طاقت کو شکست دے دی ہے تو وہ دوسری سپر طاقت امریکہ اور اپنے ملکوں کی حکومتوں کو بھی شکست دے سکتے ہیں۔ اس دلیل کی منطق یہ تھی کہ افغان جہاد نے سوویت حکومت کو گھٹنوں کے بل گرنے پر مجبور کر دیا ہے حالانکہ سوویت نظام کی شکست اور انحطاط متعدد داخلی اسباب اور وجوہ کا نتیجہ تھا، جن میں جہاد بھی ایک محرک کہا جا سکتا ہے، لیکن اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں امریکہ نے اسے سوویت ریاست کی شکست اور کمیونسٹ نظام کی ناکامی سے تعبیر کیا، وہاں انتہا پسندوں نے اسے اسلام کی فتح قرار دیا۔ انتہا پسندوں کا یہ خیال ان کے حوصلے بڑھانے اور ساتویں اور آٹھویں صدی سے مسلمانوں کی عالمگیر کامیابیوں کی یاد تازہ کرنے کا سبب بنا۔ ان کا موقف تھا کہ قربانیوں سے شہداء کے خون سے ایک نئی اسلامی امہ کو جنم دیا جا سکتا ہے اور مزید فتوحات کی جا سکتی ہیں۔

ان ہزاروں غیر ملکی انتہا پسندوں میں ایک نوجوان سعودی طالب علم اسامہ بن لادن بھی شامل تھا۔ وہ تعمیرات کا کام کرنے والے ایک ارب پتی محمد بن لادن کا بیٹا ہے۔ محمد بن لادن شاہ فیصل کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ ان کی کمپنی نے مکہ معظّمہ میں خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ~صل٢~ کی توسیع اور آرائش کے ٹھیکوں میں بڑی دولت کمائی۔ آئی ایس آئی کی طویل عرصے سے خواہش تھی کہ سعودی خفیہ ایجنسی

''استخبارات'' کے سربراہ شہزادہ ترکی بن فیصل، سعودی دستے کی قیادت پر کسی شہزادے کو مامور کریں تاکہ جہاد سے سعودی شاہی خاندان کے تعلق خاطر کے مسلمانوں کو پتہ چل سکے۔ اب تک صرف غریب سعودی شہری طلباء، ٹیکسی ڈرائیور اور بدو جہاد کرنے آتے رہے، لیکن کوئی معروف سعودی شہزادہ، افغانستان کے پہاڑوں میں جہاد کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ بن لادن اگرچہ سعودی شاہی خاندان کے فرد نہیں، لیکن انہیں شاہی خاندان کے افراد کا قرب حاصل ہے اور اتنے امیر ضرور ہیں کہ سعودی دستے کی قیادت کر سکیں۔ شہزادہ ترکی اور جنرل حمید گل ایک مشترکہ نصب العین کی خاطر باہم دوست اور اتحادی بن گئے۔

پشاور میں ورلڈ مسلم لیگ اور اخوان المسلمین کا دفتر عرب افغان مجاہدوں کا مرکز تھا۔ ایک اردنی فلسطینی عبداللہ اعظم اس کے منتظم تھے۔ اسامہ بن لادن ان سے جدہ یونیورسٹی میں ملے تھے اور انہیں اپنے قائد کے طور پر محترم سمجھنے لگے تھے۔ 1989ء میں عبداللہ اعظم اور ان کے دو بیٹے پشاور میں بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ 1980ء کے عشرے میں عبداللہ اعظم نے حکمت یار اور افغان اسلامی دانشور عبدالرسول سیاف سے قریبی تعلقات قائم کر لئے۔ سعودی عرب نے سیاف کو وہابیت کے فروغ کے لئے پشاور بھیجا تھا۔ انہیں اور مکتب خدمت کو سعودی عرب سے مالی امداد ملتی تھی۔ یہ مکتب 1984ء میں قائم ہوا تھا۔ نئے افراد بھرتی کرنا اور عطیات وصول کرنا اس کے ذمے تھا۔ سعودی انٹیلی جینس، سعودی ہلال احمر، عالمی مسلم لیگ عرب شہزادوں اور مساجد سے عطیات اسی مکتب کے ذریعے وصول اور تقسیم کئے جاتے ہیں۔

ایک دہائی کے بعد یہ مکتب انتہا پسند تنظیموں کا مرکز بننے والا تھا۔ جنہوں نے 1998ء میں عالمی ٹریڈ سنٹر اور افریقہ میں امریکی بغاوت خانوں میں بموں کے دھماکے کرائے۔ افغانستان آنے سے پہلے بن لادن نے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، وہ 1957ء میں پیدا ہوئے، اپنے یمنی باپ کی 57 اولادوں میں سے ان کا سترہواں نمبر

تھا، ان کی ماں سعودی تھی، باپ نے کئی شادیاں کر رکھی تھیں۔ بن لادن نے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں برنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری کے لئے داخلہ لیا لیکن جلد ہی اسلامک سٹڈیز کی طرف منتقل ہو گئے۔ وہ لمبے پتلے، چھ فٹ پانچ انچ قد اور لمبے ہاتھ پاؤں کے باریش شخص ہیں، وہ اپنے تمام ساتھیوں سے اونچے ہیں، جو انہیں ایک خاموش طبع نیک، پرہیزگار شخص کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی سوچا نہیں تھا کہ لادن کوئی غیر معمولی کام کر دکھائیں گے۔ ان کے والد نے افغان جہاد کی حمایت اور مالی امداد بھی کی۔ اس لئے جب لادن نے افغان جہاد میں شریک ہونے کا عندیہ ظاہر کیا تو خاندان نے بخوشی اجازت دے دی، وہ 1980ء میں پہلے پشاور آئے اور مجاہدین کے لیڈروں سے ملے۔ وہ اکثر سعودی عرب جاتے اور عطیات لاتے رہتے۔ 1982ء میں انہوں نے پشاور میں ہی بس جانے کا ارادہ کیا، وہ اپنی کمپنی کے انجینئروں اور بھاری تعمیراتی مشینیں اور ساز و سامان لائے اور مجاہدین کے لئے سڑکیں اور ڈپو تعمیر کرنے لگے۔ 1986ء میں انہوں نے خوست ٹنسل کمپلکس تعمیر کرنے میں مدد دی۔ سی آئی اے پاکستان کی سرحد کے قریب پہاڑوں میں جنگی ساز و سامان کا ڈپو اور تربیتی مرکز بنانے کے لئے سرمایہ فراہم کر رہی تھی۔ بن لادن نے پہلی مرتبہ خوست میں عرب افغان مجاہدوں کے لئے اپنا تربیتی کیمپ قائم کیا، جس نے انہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔

بن لادن نے بعد میں بتایا کہ افغانستان میں روسی دہریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سعودی عرب نے اپنے نمائندے کے طور پر مجھے چنا ہے۔ میں پاکستان میں افغانستان کی سرحد کے قریبی علاقے میں آباد ہوا، سعودی عرب اور پوری عرب اور اسلامی دنیا کے رضا کار میرے پاس آنے لگے۔ یہاں میں نے اپنا پہلا تربیتی کیمپ قائم کیا، جہاں پاکستانی اور امریکی افسران رضا کاروں کی تربیت کے لئے ہتھیار امریکی دیتے اور سرمایہ سعودی عرب کی طرف سے آتا۔ میں نے محسوس کیا کہ صرف افغانستان میں لڑنا ہی

ہمارے لئے کافی نہیں ہے ہمیں تمام محاذوں پر لڑنا تھا۔کمیونسٹوں سے بھی اور مغربی کلچر و تشدد سے بھی۔

بن لادن کا کہنا ہے کہ وہ سوویت دستوں پر چھاپہ ماروں کے ساتھ حملہ کرتے رہے ہیں۔تاہم انہوں نے زیادہ تر اپنی دولت اور سعودی عطیات سے مجاہدین کے منصوبے تیار کرنے میں مدد دی اور افغانوں میں وہابیت کی تبلیغ کا کام کیا۔ 1989ء میں اعظم کے انتقال کے بعد انہوں نے اعظم کی تنظیم کی باگ دوڑ سنبھال لی اور فوجی اڈہ قائم کیا، جو افغان عرب مجاہدین اور ان کے خاندانوں کی مدد کرنا اور ان میں ایک وسیع البنیاد اتحاد کا اہتمام کرنا تھا۔ بن لادن کی مدد سے کئی ہزار عرب انتہا پسندوں نے کنسر، ندرستان اور بدخشان کے صوبوں میں اڈے قائم کر لئے لیکن ان کے انتہا پسندانہ وہابی طور طریقوں کو افغانوں کی اکثریت ناپسند کرنے لگی۔ علاوہ ازیں وہابی پشتون مجاہدین کے ساتھ ان کے گہرے ربط وتعلق نے غیر پشتون اور شیعہ فرقے کے افغانوں کو افغان اتحاد سے بدظن کر دیا۔ بعد میں احمد شاہ مسعود نے عرب افغان اتحاد کو تنقید کا نشانہ بنایا۔انہوں نے کہا کہ جہاد کے برسوں میں میرے دھڑے کے عرب افغان اتحاد سے اچھے تعلقات نہیں تھے، اس کے برعکس عبدالرسول سیاف اور گلبدین حکمت یار سے ان کے بہت گہرے مراسم تھے۔ 1992ء میں جب میرا دھڑا کابل میں داخل ہوا تو عرب افغان حکمت یار کی فوجوں کی صفوں میں شامل تھے اور ہمارے خلاف لڑ رہے تھے۔ ہم عربوں سے کہیں گے کہ وہ ہمارے ملک سے نکل جائیں۔ بن لادن نے ہمیں فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔ 1997ء میں کابل سے باہر نکالے جانے پر وہ اظہار خیال کر رہے تھے۔

1990ء تک بن لادن مجاہدین کے اندرونی اختلافات سے بد دل ہو کر اپنے خاندانی کاروبار میں شرکت کے لئے سعودی عرب واپس چلے گئے۔ انہوں نے ان چار ہزار عرب افغان مجاہدوں کی امداد اور فلاح کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جو مکہ اور مدینہ میں آباد

ہو گئے تھے، جو مجاہد میدان جنگ میں کام آئے ان کے پسماندگان کے لئے مالی امداد کا بھی بندوبست کیا۔ کویت پر عراق کے حملے کے بعد انہوں نے شاہی خاندان کو تحریک کی کہ سعودی سلطنت کے دفاع کے لئے عوام کو منظم اور سعودی عرب کے سابق سپاہیوں کو عراق سے لڑنے کے لئے تیار کریں اور ان پر مشتمل فوج قائم کریں۔ اس کی بجائے شاہ فہد نے امریکیوں کو آنے کی دعوت دے دی۔ 5 لاکھ 40 ہزار امریکی فوجی سعودی عرب پہنچنے شروع ہوئے تو بن لادن کو شدید صدمہ پہنچا۔ بن لادن نے شاہی خاندان پر کھلے بندوں تنقید کی اور سعودی علماء سے کہا کہ وہ ملک میں غیر مسلموں کو رکھنے کے خلاف فتوے جاری کریں۔ کویت کی آزادی کے بعد بھی جب 20 ہزار امریکی سعودی عرب میں ہی مقیم رہے تو ان کی تنقید بڑھ گئی۔ 1992ء میں سعودی عرب کے وزیر داخلہ شہزادہ نائف سے ملاقات میں انہوں نے شہزادے کو اسلام کا غدار کہا۔ شہزادہ نائف نے شاہ فیصل سے شکایت کی، جس پر بن لادن کو ناپسندیدہ فرد قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود انہیں شاہی خاندان کے ایسے کئی افراد کی حمایت حاصل تھی، جو شہزادہ نائف کو پسند نہیں کرتے۔ شہزادے کے سعودی انٹیلی جینس اور آئی ایس آئی سے تعلقات تھے۔

1992ء میں اسامہ بن لادن سوڈان چلے گئے۔ جہاں سوڈانی لیڈر حسن ترابی کی قیادت میں اسلامی انقلاب کی تیاری ہو رہی تھی۔ بن لادن نے سعودی شاہی خاندان پر تنقید جاری رکھی، جس کے سبب سے شاہی خاندان ان سے اس درجہ ناراض ہو گیا کہ 1994ء میں ان کی سعودی عرب کی شہریت ہی چھین لی گئی۔ سوڈان میں اپنی دولت اور رابطوں کی بنا پر بن لادن کے اپنے گرد افغان جنگ بیشتر سپاہیوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے، وہ سب عراق پر امریکی فتح اور عرب حکمرانوں کے رویے سے، جنہوں نے امریکی فوج کو خلیج کے علاقے میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ سخت دل برداشتہ تھے۔ امریکہ اور سعودی عرب نے سوڈان پر بن لادن کو رکھنے کی بنا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا تو سوڈانی حکام نے بن لادن کو سوڈان سے چلے جانے کا کہہ دیا۔

مئی 1996ء میں اسامہ بن لادن واپس افغانستان آئے۔ وہ ایک چارٹرڈ طیارے پر درجنوں عرب انتہا پسندوں کو ساتھ لے کر جلال آباد پہنچے۔ اس قافلے میں خاندان کے افراد، تین بیوائیں اور تیرہ بچے شامل تھے۔ ستمبر 1996ء میں کابل اور جلال آباد پر طالبان کے قبضہ ہونے تک وہ جلال آباد شوریٰ کی حفاظت میں رہے۔ اگست 1996ء میں انہوں نے پہلی بار امریکیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور کہا کہ امریکیوں نے سعودی عرب پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ ظلم و جبر اور بے دری کی دیواریں، گرمیوں کی بارش کے بغیر نہیں گرائی جاسکتیں۔ 1997ء میں انہوں نے ملا عمر کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا اور قندھار چلے گئے۔ اب وہ طالبان کی حفاظت میں تھے۔ سی آئی اے نے بن لادن کی سرگرمیوں اور دوسرے اسلامی انتہا پسندوں کے تعلق پر نظر رکھنے کے لئے ایک سیل قائم کر دیا۔ اگست 1996ء میں امریکی وزارت خارجہ کے ایک بیان میں بن لادن کو دنیا بھر میں اسلامی انتہا پسندانہ سرگرمیوں کی مالی امداد کرنے والوں میں شامل قرار دیا۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ بن لادن صومالیہ، مصر، سوڈان، یمن اور افغانستان میں دہشت گردوں کے کیمپوں کی مالی امداد کر رہے ہیں۔ اپریل 1996ء میں صدر بل کلنٹن نے دہشت گردی کے خلاف قانون پر دستخط کئے، جس کے تحت امریکہ کو دہشت گرد تنظیموں کے اثاثے ضبط کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس قانون کے تحت سب سے پہلے بن لادن کے 250۔300 ملین ڈالر ضبط کئے گئے۔ چند ماہ بعد مصری انٹیلی جینس نے بتایا کہ بن لادن 1000 انتہا پسندوں کو تربیت دے رہے ہیں، جو عرب ملکوں میں اسلامی انقلاب لانے کے لئے کام کریں گے۔

1997ء کے اوائل میں سی آئی اے نے ایک دستہ پشاور بھیجا، اسے افغانستان سے بن لادن کو پکڑ لانے کا مشن سونپ دیا گیا۔ اس دستے کی مدد کے لئے افغان اور پاکستانی نامزد کئے گئے۔ لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ پشاور میں امریکی اقدامات کے پیش نظر بن لادن قندھار کی محفوظ حدود میں چلے گئے۔ 23 فروری 1998ء کو خوست

کیمپ میں القاعدہ سے وابستہ تمام گروپوں نے بین الاقوامی اسلامی فرنٹ کی جانب سے ایک منشور جاری کیا، جس میں یہودیوں اور نصارا کے خلاف جہاد کا اعلان کیا گیا۔ اس منشور میں کہا گیا کہ امریکہ نے سات برس سے اسلامی ملکوں میں مقدس ترین مقامات پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس علاقے کے وسائل کو لوٹ رہا ہے، حکمرانوں کو حکم دے رہا ہے۔ عوام کو ذلیل اور پڑوسیوں کو دہشت زدہ کر رہا ہے اور اپنے اڈوں کو ہمسایہ مسلم عوام کے خلاف لڑنے کا وسیلہ بنا رہا ہے۔ اجلاس نے فتویٰ جاری کیا، جس میں امریکیوں اور ان کے اتحادیوں کو، چاہے وہ سویلین ہوں یا فوجی قتل کرنا ہر مسلمان کا فرض قرار دیا اور کہا کہ وہ یہ فرض جس ملک میں بھی ممکن ہو ادا کرے۔ بن لادن نے جو نئی پالیسی بنائی، اس کے تحت صرف سعودی شاہی خاندان اور امریکیوں ہی کو ہدف نہیں بنایا، بلکہ پورے مسلم مشرق وسطیٰ کو آزاد کرانے کا مقصد مقرر کیا گیا۔ 1998ء میں جب عراق پر امریکی فضائی حملوں میں اضافہ ہوا تو بن لادن نے تمام مسلمانوں سے کہا کہ وہ امریکیوں اور انگریزوں سے مقابلہ اور جنگ کریں اور انہیں ہلاک کر دیں۔

اگست 1998ء میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں پر بمباری کے بعد، جس سے 220 افراد ہلاک ہوئے، اسلامی دنیا اور مغرب میں بچہ بچہ اسامہ بن لادن کے نام سے واقف ہو گیا۔ 13 دن بعد بن لادن کو امریکی سفارت خانوں پر حملوں کا منصوبہ بنانے کا ملزم قرار دیتے ہوئے امریکہ نے خوست اور جلال آباد کے قریب بن لادن کے کیمپوں پر سترکروز مزائیل داغے، کئی کیمپ جو طالبان نے عرب افغان اور پاکستانی انتہا پسندوں کے حوالے کئے تھے، ان مزائیلوں کی زد میں آئے۔ البدر کیمپ جو بن لادن کے کنٹرول میں تھا۔ خالد بن ولید کیمپ اور معاویہ کیمپ پاکستانی حرکت الانصار کی تحویل میں تھے، وہ اہم ہدف تھے۔ حرکت الانصار کے کیمپوں میں کشمیر میں ہندوستانی فوج کے خلاف لڑنے والوں کو تربیت دی جاتی، امریکی مزائیلوں کے حملے میں سات باہر کے انتہا پسند ہلاک ہوئے، ان میں تین یمنی، دو مصری، ایک سعودی اور

ایک ترک تھا۔ سات پاکستانی اور 20 افغانی بھی ہلاک ہوئے۔

نومبر 1998ء میں امریکہ نے بن لادن کو پکڑنے والوں کو پانچ ملین ڈالر انعام دینے کا اعلان کیا۔ بن لادن کے اس دعوے پر کہ امریکہ کے خلاف استعمال کے لئے اور نیوکلیائی ہتھیار حاصل کرنا، اس کا اسلامی فرض ہے۔ امریکہ مزید ناراض ہوا، بن لادن نے کہا کہ مسلمانوں کے لئے مسلمانوں پر کافروں کے حملے کو روکنے کے لئے ہتھیار حاصل نہ کرنا گناہ ہے۔ امریکہ سے دشمنی، دینی فریضہ ہے، جس کے ادا کرنے کا اجر اللہ کی طرف سے ملے گا۔ افریقہ میں امریکی سفارت خانوں پر بموں کے حملے کے بعد چند ہفتوں کے اندر کلنٹن انتظامیہ نے اسلامی دنیا میں امریکہ کے خلاف ہر حملے کے لئے بن لادن کو موردالزام گرداننا شروع کر دیا۔

نیویارک کی ایک عدالت کی طرف سے بن لادن کے خلاف فیصلے کے بعد 1993ء میں میگا دیشو اور صومالیہ میں ہلاک ہونے والے 18 امریکی سپاہیوں، 1995ء میں ریاض میں 5 امریکیوں کی ہلاکت اور 1996ء میں ایران میں 19 امریکی سپاہیوں کی ہلاکت کی ذمہ داری بھی اسامہ بن لادن پر ڈال دی گئی۔ 1992ء میں عدن میں جو بمباری ہوئی، اس میں بھی لادن ہی کا ہاتھ ہونے کا ناٹک کیا گیا تھا۔ 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بموں کے دھماکے 1994ء میں فلپائن میں صدر کلنٹن کو قتل کرنے کے منصوبے، 1995ء میں ایک درجن امریکی سویلین طیاروں کو بموں سے اڑانے کی سازش میں بھی بن لادن ہی کو ملوث قرار دیا گیا۔ ان واقعات کے لئے لادن کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بارے میں بعض امریکی ماہر بھی شک کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن کلنٹن انتظامیہ کی طرف سے مونیکا لیونسکی سے صدر کلنٹن کے تعلق سے توجہ ہٹانے اور دہشت گردی کے واقعات کی نامعلوم وجوہ کی پردہ پوشی کے لئے سارا ملبہ لادن کے سر ڈالا جانے لگا اور اسے امریکہ کے خلاف عالمگیر سازش کا مرکز ومحور کیا جانے لگا۔

واشنگٹن یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ افغان جہاد جو سی آئی اے کی حمایت سے شروع

ہوا، اس نے اسلامی دنیا میں درجنوں بنیاد پرست تحریکوں کو ہوا دی، جن کی قیادت ایسے انتہا پسندوں کے ہاتھ میں ہے، جنہیں امریکنوں سے زیادہ اپنی بدعنوان اور نا اہل حکومتوں کے خلاف شکایات ہیں۔ 1992۔93ء میں مصری اور الجزائری لیڈروں نے اعلیٰ ترین سطح پر واشنگٹن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ افغانستان میں از سر نو سفارت کاری کے ذریعے وہاں قیام امن میں مدد دے تا کہ عرب افغان انتہا پسندوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ نہ مل سکے۔ واشنگٹن نے اس مشورے کو نظر انداز کیا اور افغانستان کی طرف توجہ نہ کی، حتیٰ کہ وہاں خانہ جنگی نے شدت اختیار کر لی۔

الجزائریوں کے خدشات صحیح تھے کیونکہ عرب افغان انتہا پسندوں کی طرف سے پہلا وار الجزائر ہی ہوا۔ 1991ء میں اسلامی سالویشن فرنٹ نے پارلیمانی انتخابات میں دیہی علاقوں سے 60 فیصد نشستیں جیت لیں۔ الجزائری فوج نے انتخابات کے نتائج منسوخ کر دیئے۔ جنوری 1992ء میں صدارتی نظام کے قیام کا اعلان کر دیا اور دو ماہ کے اندر ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، جس میں 1999ء تک 70 ہزار جانیں تلف ہوگئیں۔ اسلامک سالویشن فرنٹ کو اس سے بھی زیادہ انتہا پسند اسلامی جہاد نے پیچھے چھوڑ دیا۔ جس نے 1995ء میں اپنا نام بدل کر آرمڈ اسلامی گروپ رکھ لیا۔ اس کی قیادت عرب افغان کے ان عناصر کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے افغانستان کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یہ وہابیوں کے حامی تھے اور الجزائر سے خون کی ندیاں بہانے شمالی افریقہ کو عدم استحکام کا شکار کرنے اور فرانس میں اسلامی بنیاد پرستی کو فروغ دینے کا ادعا رکھتے تھے۔ آگے جو کچھ پیش آنے والا تھا الجزائر اس کا نقطہ آغاز تھا۔ اسلامی گروپوں نے مصر میں بموں کے جو دھماکے کیئے ان کے پیچھے افغانستان کی جنگ میں تربیت پانے والے اسلامی انتہا پسند تھے۔

بن لادن اسلامی دنیا میں ہونے والے متشددانہ اقدامات کرنے والوں کو اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ وہ افغانستان میں ایک ساتھ رہے اور ایک ساتھ جنگ میں شریک

ہوئے۔ بن لادن کی تنظیم کی توجہ افغان جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں اور ان کے خاندانوں کی مدد کرنے اور ان سے رابطہ رکھنے پر مرکوز تھی۔ ممکن ہے انہوں نے ان کی مالی امداد کی ہو اور ان کے بعض اقدامات کی تائید بھی کی ہو، لیکن ان کے اپنے اپنے ملک میں کیا مقاصد ہیں؟ ان کی لادن کو کم ہی خبر تھی۔ لادن ہمیشہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتے رہے، وہ کوئی دینی عالم یا مدرس نہیں تھے، اس لئے وہ فتویٰ جاری کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے فتوے دیئے، مغرب میں ''امریکہ کے لئے موت'' کی اپیل کو فتویٰ ہی کی شکل میں دیکھا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلامی دنیا میں اس کا قانونی جواز تسلیم نہیں کیا گیا۔ عرب افغان اتحاد کے جن افراد نے انہیں جہاد کے دوران دیکھا، ان کا کہنا ہے کہ وہ نہ تو دانشور ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں کیا کیا جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک نہ تو وہ اسلامی انقلاب کے لینن ہیں اور نہ اسلامی انقلاب کے بین الاقوامی شارح اور مبلغ، جس طرح چی گوہرا تیسری دنیا میں انقلاب کا مبلغ تھا۔

لادن کے سابق افغان کا کہنا ہے کہ وہ نہایت جلد اثر پذیر ہونے والے ہیں، وہ ایسے لوگوں کے متلاشی رہتے ہیں جو اسلام اور جدید دنیا کے بارے میں ان سے زیادہ علم رکھتے ہوں۔ عالم جوانی میں وہ جن لوگوں سے متاثر ہوئے ان میں ڈاکٹر ایمن الظواہری، سابق امیر مصری اسلامی جہاد، شیخ عمر عبدالرحمٰن کے دو بیٹے شامل ہیں۔ اسلامی جہاد مصر میں خلاف قانون قرار دی جا چکی ہے۔ شیخ عمر عبدالرحمٰن نابینا مسلم مبلغ ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بموں کے حملے کے سلسلے میں امریکہ میں قید ہیں۔ وہ مصر میں الجامعہ اسلامیہ کے سربراہ تھے، یہ تنظیم بھی خلاف قانون قرار پا چکی ہے۔ افغان جہاد کے توسط سے لادن کی سوڈان کے قومی اسلامی محاذ، لبنان میں حزب اللہ اور غزہ اور مغربی کنارے میں انتہا پسند اسلامی فلسطینی تحریک حماس کے رہنماؤں سے ربط، تعلق قائم ہوا۔ قندھار میں چیچنیا، بنگلہ دیش، فلپینز، الجزائری، کینین، پاکستانی اور افریقن، امریکن مسلمان ان کے ساتھ رہے۔ ان میں سے اکثر لادن کے مقابلے میں زیادہ پڑھے لکھے

اور زیادہ معلومات رکھنے والے تھے۔ ان کے نام امریکہ کے مطلوب افراد کی فہرست میں شامل ہیں، اس بنا پر وہ افغانستان سے باہر سفر نہیں کر سکتے، انہیں مالی امداد اور پناہ کی ضرورت تھی، جو اسامہ بن لادن ہی انہیں مہیا کر سکتے تھے۔

افریقہ میں بموں کے حملوں کے بعد امریکہ نے عالمگیر مہم شروع کی اور درجن بھر اسلامی ملکوں سے 80 سے زیادہ اسلامی انتہا پسند گرفتار کر لئے گئے۔ یہ ممالک بلاک کی شکل میں واقع ہیں اور ان میں تنزانیہ، کینیا، سوڈان، یمن، پاکستان، بنگلہ دیش، ملائشیا اور فلپائن شامل ہیں۔ دسمبر 1998ء میں ہندوستان کے حکام نے کلکتہ میں امریکی قونصلیٹ کو بم سے اڑانے کی سازش کرنے کے الزام میں بنگلہ دیش انتہا پسندوں کو گرفتار کر لیا۔ سات افغانوں کو جو جعلی اطالوی پاسپورٹوں پر ملائشیا پہنچے تھے، بم پھینکنے کا منصوبہ بنانے کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔

ایف بی آئی کے مطابق دسمبر 1998ء میں یمن سے جو مغربی سیاح اغوا ہوئے تھے، اس منصوبے کے لئے اسامہ بن لادن نے ہی سرمایہ مہیا کیا تھا۔ فروری 1999ء میں بنگلہ دیش حکام نے بتایا کہ بن لادن نے ڈھاکہ میں حرکت الجہاد کو ایک ملین ڈالر بھیجے، اس تنظیم کے کچھ ارکان افغانستان میں لڑ چکے تھے، اس کے لیڈروں کا کہنا تھا کہ وہ بنگلہ دیش کو طالبان کی طرز کی اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ مغربی افریقہ میں ماریطانیہ کے دارالحکومت میں کئی انتہا پسند پکڑے گئے۔ جنہیں افغانستان میں بن لادن نے تربیت دی تھی، ان کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ وہ بموں کے دھماکے کرنے کا مشن رکھتے ہیں۔ دریں اثناء قاہرہ کی ایک فوجی عدالت میں الجہاد کے 107 ارکان کے خلاف مقدمے کی سماعت کے دوران مصری انٹیلی جینس کے افسروں نے گواہی دی کہ الجہاد کو مالی مدد دے رہے ہیں۔ فروری 1999ء سی آئی اے نے دعویٰ کیا کہ بن لادن نے سٹیلائٹ کے ذریعے پیغام رسانی کا جو نظام قائم کر رکھا ہے، اس کے ذریعے لادن کے حامیوں کو سعودی عرب، البانیہ، آذر بائیجان، تاجکستان، یوگنڈا، یوروگوائے اور آوری

کوسٹ میں امریکی تنصیبات پر بموں سے حملہ کرنے سے باز رکھا جا سکا۔ امریکہ نے 1999ء میں دہشت گردی کی روک تھام کے لئے 7ء 6 بلین ڈالر منظور کئے، جبکہ دہشت گردی کے انسداد کے لئے ایف بی آئی کا بجٹ 118 ملین ڈالر سے بڑھ کر 286 ملین ڈالر ہو گیا۔ اس نے اس مقصد سے 650 ایجنٹ رکھے، جو 1998ء میں رکھے گئے ایجنٹوں سے دگنے تھے۔

تاہم عرب افغان تنظیم کے اصل سرپرستوں، پاکستان اور سعودی عرب کو سب سے زیادہ خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ اس لئے کہ انہیں اپنی سرگرمیاں محدود کرنا پڑ گئی تھیں۔ مارچ 1997ء میں پشاور کے قریب ایک افغان مہاجر کیمپ میں تین عرب اور دو تاجک انتہا پسند پولیس سے 36 گھنٹے کے مقابلے میں ہلاک ہو گئے۔ وہ انتہا پسند وہابی تحریک سے وابستہ تھے، انہوں نے اسلام آباد میں اسلامی ملکوں کے سربراہ اجلاس میں بم چلانا تھا۔

پاکستان کی طرف سے حوصلہ افزائی ہونے پر طالبان اور اسامہ بن لادن عرب افغان، پاکستانی پارٹی حرکت الانصار میں حصہ لینے لگے، جو کشمیر میں ہندوستانی فوج سے لڑنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ عربوں نے وادی کشمیر میں وہابی طرز کے قواعد وضوابط نافذ کئے، جس سے اصل کشمیری مجاہدوں کی عزت نفس مجروح ہوئی۔ امریکی حکومت نے 1996ء میں حرکت الانصار کو دہشت گرد تنظیم قرار دیا تو اس نے اپنا نام حرکت المجاہدین رکھ لیا۔ خوست میں امریکی مزائیلوں کے حملے سے جتنے بھی پاکستانی جاں بحق ہوئے تھے، انصار سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ 1999ء میں انصار نے اعلان کیا کہ وہ وہابی طرز کا لباس پہننے کی پابندی لگائیں گے، چنانچہ انہوں نے جین اور جیکٹ پہننا ممنوع قرار دے دیا۔ 15 فروری 1999ء میں انہوں نے تین کشمیری کیبل ٹیلی ویژن آپریٹروں کو گولی مار کر زخمی کر دیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ مغربی سیٹلائیٹ کے نشریے دکھاتے تھے۔ انصار نے پہلے پہل کشمیر کے مسلمانوں کی آزادانہ روایات کا احترام کیا لیکن جیسے جیسے عرب افغان تنظیم

کا اثر اور رسوخ بڑھا کشمیری تحریک کی حیثیت پر حرف آنا شروع ہو گیا اور یوں ہندوستان کو پراپا گنڈے کا ایک موضوع مل گیا۔

جب واشنگٹن نے وزیراعظم نواز شریف پر اسامہ بن لادن کو گرفتار کرنے میں مدد دینے کے لئے زور دینا شروع کیا تو پاکستان کے لئے ایک مشکل پیدا ہو گئی۔ آئی ایس آئی کے بن لادن سے قریبی رابطے اور یہ حقیقت کہ لادن کشمیری انتہا پسندوں کو خوست میں تربیت دلاتے رہے تھے، نواز شریف کو دسمبر 1998ء میں واشنگٹن کے دورے میں مشکل میں ڈالنے کا موجب ہوئے۔ نواز شریف نے پہلو بدلنے اور بات کو ٹالنے کی بڑی کوشش کی، لیکن دوسرے پاکستانی افسروں نے اپنے امریکی ہمسروں کو یاد دلایا کہ خود انہوں نے ہی 1980ء میں کس طرح اسامہ بن لادن کو ابھارا اور 1990ء میں طالبان کو منظر پر لانے میں کردار ادا کیا۔

بن لادن نے خود ایک انٹرویو میں پاکستان انٹیلی جینس سروسز کے بعض عناصر کی مسلسل معاونت حاصل ہونے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اس کے بعض حکومتی محکمے اللہ کے کرم سے پاکستانی عوام کے اسلامی جذبات کی قدر کرتے ہیں، اس کا اظہار ان کی ہمدردی اور تعاون کی صورت میں ہوتا ہے۔ تاہم بعض دوسرے محکمے بھی ہیں جو ملحدوں کے اثر میں ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ انہیں سیدھے راستے پر لائے۔

پاکستانی انتظامیہ کے بعض عناصر کی طرف سے اسامہ بن لادن کی حمایت پاکستان کی افغان پالیسی کے ضمن میں ایک اور تضاد کا درجہ رکھتی ہے۔ امریکہ پاکستان کا بہت قریبی اتحادی تھا۔ اس کے پاکستان کی فوج اور آئی ایس آئی سے گہرے روابط تھے، لیکن طالبان اور بن لادن دونوں کشمیری انتہا پسندوں کو، پاکستان جن کا حامی تھا، پناہ بھی دیتے اور فوجی تربیت بھی۔ اسلام آباد کو اس حمایت سے دستکش ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ امریکی مسلسل کوشش کرتے رہے کہ آئی ایس آئی بن لادن کو گرفتار کرانے

میں مدد دے۔ آئی ایس آئی انکار کرتی آئی ہے۔ اگرچہ وہ بن لادن کے کئی قریبی ساتھیوں کو گرفتار کرانے میں امریکہ کی مدد کر چکی تھی۔ پاکستان کی حمایت کے بغیر امریکہ اپنے کمانڈوز کے ذریعے بن لادن کو پکڑ لے جانے کی امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس طرح اس کے لئے پاکستانی علاقہ استعمال کئے بغیر بن لادن کے ٹھکانے پر صحیح صحیح بمباری کرنا بھی ممکن نہیں تھا، امریکہ اس توقع پر کہ آئی ایس آئی شاید بن لادن کو گرفتار کرانے میں مدد دینے پر آمادہ ہو جائے، پاکستان اور طالبان کے تعلقات کو الم نشرح نہیں کرنا چاہتا تھا۔

سعودی عرب کی صورت حال اور بھی زیادہ پیچیدہ تھی، جولائی 1998ء میں شہزادہ ترکی قندھار گئے، چند ہفتوں بعد 400 نئے پک اپ ٹرک طالبان کے لئے قندھار پہنچ گئے۔ ان پر دوبئی کی لائسنس نمبر پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ سعودی عرب نے موسم خزاں میں شمال کی فتح کے لئے نقد مالی امداد بھی دی۔ افریقہ میں بم کے دھماکوں تک اور امریکہ کے دباؤ کے باوجود طالبان کی امداد ترک کر دی جائے۔ سعودی طالبان کی مالی مدد کرتے رہے اور بن لادن کو گرفتار کرانے پر خاموشی اختیار کئے رہے۔ سعودی خاموشی بغیر از حکمت نہیں تھی۔ سعودی اس امر کو ترجیح دیتے تھے کہ اسامہ بن لادن کو افغانستان میں اکیلا رہنے دیا جائے۔ کیونکہ اس کی گرفتاری اور اس پر امریکہ کی طرف سے مقدمہ سعودی عرب کے شاہی خاندان کے ہمدرد ارکان اور سعودی انٹیلی جینس کے بعض عناصر سے اسامہ بن لادن کے تعلقات پر سے افغان کا پردہ سرک سکتا تھا، جو حد درجہ خفت کا موجب ہوتا۔ سعودیوں کی خواہش تھی کہ بن لادن یا تو مارا جائے یا طالبان کے پاس گرفتار رہے، وہ امریکیوں کے ہاتھوں اس کی گرفتاری کے حق میں نہیں تھے۔

اگست 1998ء میں افریقہ میں امریکی سفارت خانوں پر بموں کے حملے کے بعد سعودیوں پر امریکہ کا دباؤ بڑھ گیا۔ شہزادہ ترکی نے قندھار کا دورہ کیا۔ اس دفعہ وہ طالبان کو اس بات پر آمادہ کرنے گئے تھے کہ وہ لادن کو ان کے حوالے کر دیں۔ ملا عمر

نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور سعودی عرب کے شاہی خاندان کو برا بھلا کہہ کر شہزادہ ترکی کی بے عزتی کی۔ بن لادن نے خود بتایا کہ شہزادہ ترکی کو قندھار میں کیا پیش آیا۔ شہزادے نے ملا عمر سے کہا کہ وہ ہمیں ان کے حوالے کر دیں یا افغانستان سے نکال دیں۔ سعودی حکومت بن لادن کو اس کے سپرد کرنے کے لئے کہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ شہزادہ ترکی امریکہ کے سفیر بن کر قندھار آئے تھے۔ طالبان کی طرف سے شہزادے کی بے عزتی پر سعودی عرب نے طالبان سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے اور ان کی ہر طرح کی امداد بند کر دی۔ تاہم طالبان حکومت کو بدستور تسلیم کئے رکھا۔

بن لادن نے اس وقت تک طالبان کے ساتھ خاصا اثر ورسوخ پیدا کر لیا تھا، لیکن اس میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا تھا۔ طالبان کا عرب افغان تنظیم اور ان کے پان اسلامی نظیرے سے اس وقت تک کوئی ربط تعلق نہیں تھا، جب تک طالبان نے 1996ء میں کابل فتح نہ کر لیا۔ پاکستان نے قندھار میں طالبان قیادت سے اسامہ بن لادن کا تعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ کیونکہ وہ خوست کے تربیتی کیمپ کو قائم رکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ خوست اب طالبان کے قبضے میں تھا، اس کے برقرار رہنے کا دارومدار طالبان کی مرضی پر تھا۔ پاکستان کے کہنے پر طالبان کے زیادہ پڑھے لکھے ارکان جو پان اسلامی نظریے کے حامی تھے اور بن لادن سے مالی فوائد حاصل کرنے کے حق میں تھے، طالبان کے لیڈروں کو بن لادن سے ملنے اور خوست کا تربیتی کیمپ اس کے حوالے کرنے پر آمادہ کر لیا۔ طالبان نے کچھ تو بن لادن کے تحفظ کے لئے اور کچھ اسے اپنے اثر میں رکھنے کی خاطر 1997ء میں انہیں قندھار منتقل کر دیا۔ پہلے وہ مہمان کی طرح رہے، انہوں نے عمر اور ان کے خاندان کے لئے مکان تعمیر کرایا اور طالبان کے دوسرے لیڈروں کو سرمایہ فراہم کیا۔ یہ اعلان بھی کیا کہ وہ قندھار ایئر پورٹ سے شہر تک سڑک بنوائیں گے۔ مساجد وغیرہ تعمیر کرائیں گے، لیکن وہ یہ وعدہ ایفا نہ کر سکے کیونکہ ان کا تمام سرمایہ منجمد کیا جا چکا تھا۔ اسامہ بن لادن اپنے خاندان، نوکروں

چا کروں، اپنے ساتھی انتہا پسندوں کے ساتھ ایک محل نما مکان میں بڑی شان سے رہتے تھے۔ چنانچہ عرب افغان تنظیم کے خودسر ارکان کی آمد اور شہری منصوبوں کی تکمیل میں ناکامی نے مقامی آبادی میں ناراضی کی لہر دوڑا دی۔ قندھاریوں نے طالبان کو عوام سے زیادہ عربوں کا طرفدار سمجھنا شروع کر دیا۔ بن لادن نے سینکڑوں عرب افغانوں کو 1997ء اور 1998ء کے شمال کی جانب طالبان کے حملوں میں شرکت کے لئے بھیج کر طالبان کے لیڈروں کے دلوں میں اپنے لئے مزید قدر و منزلت پیدا کر لی۔ کئی سو عرب افغان انتہا پسندوں نے جو کابل سے باہر رشکور آری گیرژن میں تھے، کابل کے محاذ پر احمد شاہ مسعود کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اسامہ بن لادن کی عالمی شہرت، سینئر طالبان لیڈروں کے فکر وخیال پر چھانے لگی۔ بن لادن اور طالبان لیڈروں کے درمیان رات بھر جاری رہنے والے مذاکرات اپنا اثر دکھانے لگے۔ بن لادن کی آمد سے پہلے طالبان امریکہ اور مغرب کے اتنے خلاف نہیں تھے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے۔ ادھر افریقہ میں بم پھینکے جانے کے بعد طالبان امریکیوں کے زیادہ مخالف ہو گئے۔ اقوام متحدہ، سعودیوں اور اسلامی حکومتوں کے خلاف بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ ان کے بیانات میں وہی زبان استعمال ہونے لگی جو بن لادن نے اختیار کر رکھی تھی۔ اس میں طالبان کا اپنا انداز بیان نہیں تھا۔

طالبان پر بن لادن کو نکال دینے کے لئے امریکہ کا دباؤ بڑھا تو طالبان نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ ہمارے مہمان ہیں اور مہمانوں کو نکالنا افغان روایت کے خلاف ہے۔ جب پتہ چلا کہ امریکہ بن لادن کے خلاف ایک اور حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصرف ہے تو طالبان نے واشنگٹن سے یہ سودا کرنے کی کوشش کی کہ امریکہ طالبان کی حکومت کو تسلیم کرے۔ اس کے بدلے وہ بن لادن کو ملک چھوڑ جانے کا کہیں گے۔ 1998ء کے موسم سرما تک طالبان بن لادن کو ایک سرمایہ سمجھتے رہے، جس کی بنا پر وہ امریکہ سے سودے بازی کے لئے مذاکرات کر سکتے ہیں۔ امریکی محکمہ خارجہ نے ملا عمر سے براہ

راست گفت وشنید کے لئے سیٹلائیٹ کے ذریعے ٹیلی فون رابطہ قائم کر لیا۔ جس کے ذریعے دونوں فریقوں نے مختلف امکانات کا جائزہ لیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ 1999ء کے اوائل تک طالبان پر یہ حقیقت کھلنے لگی کہ امریکہ کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن نہیں اور وہ اسامہ بن لادن کو ایک بوجھ تصور کرنے لگے۔ فروری 1999ء میں امریکہ نے طالبان سے کہا کہ وہ بن لادن اس کے حوالے کر دیں یا پھر نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس سے مجبور ہو کر طالبان نے بن لادن کو قندھار سے غائب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے طالبان کو کچھ وقت ضرور مل گیا لیکن مسئلہ جوں کا توں حل طلب رہا۔

عرب افغان، افغان جہاد اور 1988ء کے عشرے میں سرد جنگ کا مرکز بنے رہنے کے بعد افغان ہمسایہ ملکوں اور مغربی ملکوں کے لئے مرکزی کردار بن گئے۔ امریکہ نے 1992ء اور 1996ء کے درمیانی عرصے میں افغانستان کو جس طرح نظر انداز کئے رکھا، اب وہ اس کی قیمت چکا رہا تھا۔ جبکہ طالبان اپنی نہایت مخالف سرگرم اسلامی بنیاد پرست تحریک کو اپنے ہاں پھلنے پھولنے کی مہلت دے رہے تھے۔ یہ تحریک زمانہ بعد از جنگ میں ابھری اور دنیا پر مسلط ہو گئی۔ افغانستان اب اسلامی بین الاقوامیت اور دہشت گردی کے لئے جنت تھا۔ امریکہ اور مغرب کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوں۔

طالبان، وسطی ایشیا، روس، ترکی اور اسرائیل

ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد میں بہت بڑا بین الاقوامی ہوائی اڈہ 1996ء میں بن کر مکمل ہوا۔ اس کی شاندار عمارت، تیل اور گیس کے مالا مال اس صحرائی جمہوریت میں مغربی ایئر لائنز کی متوقع آمد کے پیش نظر تعمیر کی گئی تھی، لیکن یہاں خاموشی کا پہرہ رہا۔ چند مہینوں میں ہی اس کا نصف حصہ بند کرنا پڑ گیا کیونکہ اس کی دیکھ بھال کرنے پر ناقابل برداشت مصارف اٹھ رہے تھے، ٹرمینل کا باقی کا نصف حصہ بھی کچھ زیادہ منافع بخش نہیں۔ 1995ء میں ترکمانستان اور ایران کی سرحد پر سرخس ہی نیا ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا گیا۔ اس کی دیواریں اور ٹکٹ کاؤنٹر مرمرے بنائے گئے، قراقرم سے سرخ ریت کے جھکڑ اٹھتے اور سٹیشن کی عمارت سے آ ٹکراتے۔ یہ سٹیشن نئی ریلوے لائن کے آخری سرے پر تھا۔ یہ ریلوے لائن ایرانیوں نے بچھائی تھی۔ یہ مشرقی ایران کے شہر مشہد کو اشک آباد سے ملاتی ہے، جو ستر برس کے بعد پھر سے بحال ہوا تھا۔ ایران سے ہر ہفتے دو مال اور مسافر گاڑیاں آنے لگیں۔ باقی کے دنوں میں سٹیشن بند رہتا تھا۔ وسطی ایشیائی جمہوریتوں کے لئے 1991ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد بیرونی دنیا سے رسل و رسائل اور مواصلات کی زبردست اہمیت رکھتی تھی۔ لیکن دس برس گزرنے کے بعد بھی شاہراہ ریشم پر اونٹوں کے کارروان ہی چل رہے تھے۔ یہ کثیر سرمائے سے تعمیر ہونے والی عمارات اشک آباد کا ہوائی اڈہ اور ساراخس کا ریلوے سٹیشن ترکمانستان کے صدر مراد نیازدف کی خواہش اور خوابوں کی تعمیر تھے جو اپنے ملک کے محدود مالی

وسائل کو 2ء4 ملین آبادی کی فلاح و بہبود پر صرف کرنے کی بجائے اپنے شخصی وقار میں اضافے کے لئے پانی کی طرح سرمایہ بہاتے تھے۔ یہ صحرائی سراب ترکمانستان کی نا آسودہ امیدوں کے بھی آئینہ دار تھے۔ دسمبر 1991ء میں صدر نیازدف نے مجھے بتایا کہ وہ ترکمانستان کو نیا کویت بنانا چاہتے ہیں، آزادی کے بعد سے ترکمانستان تیل کی دولت سے مالا مال دوسری وسط ایشیا کی جمہوریتوں کی طرح منتظر بھی رہا لیکن اس کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ چاروں طرف سے خشکی اور حاسد اور بداندیش ملکوں روس، ایران، افغانستان اور ازبکستان سے گھری ہونے کے سبب سے وسط ایشیائی ریاستیں بڑی بے صبری سے پائپ لائنیں بچھانے کے لئے کوشش کرتی رہیں تاکہ ان کی تنہائی اور روس پر ان کا اقتصادی انحصار ختم اور سوویت یونین کے ٹوٹنے سے ان کو جس اقتصادی تباہی کا سامنا کرنا پڑا اس کا مداوا ہو سکے اور وہ اقتصادی اعتبار سے ترقی کر سکیں۔ 70 برس تک ان کے تمام مواصلاتی رابطے، سڑکیں، ریلوے، پائپ لائنیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ان کا رخ روس کی طرف رہا۔ اب وہ بحیرہ عرب، بحر ہند، بحیرہ روم اور چین تک رسائی حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ بحیرہ کیسپین اور وسطی ایشیا کے جسے کیسپین خطہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ (جس میں قازقستان، ترکمانستان، آذربائیجان اور ازبکستان شامل ہیں)۔ توانائی کے وسائل کا گزشتہ چند برسوں سے مبالغہ آمیز ذکر کیا جاتا رہا ہے۔ 1990ء کے اوائل میں امریکہ کا اندازہ تھا کہ کیسپین کے تیل کے ذخائر 100 سے 150 بلین بیرل کے لگ بھگ ہیں۔ یہ اندازہ مبالغہ آمیز تھا، ممکنہ ذخائر کا اندازہ 50 بلین بیرل ہے۔ کیسپین کے خطے کے تیل کے معلوم ذخائر 16 سے 32 بلین بیرل کے درمیان ہیں۔ امریکہ کے تیل کے ذخائر 22 بلین بیرل اور بحر شمالی کے 17 بلین بیرل ہیں۔ کیسپین خطے کے ذخائر مشرق وسطیٰ کے کل ذخائر سے 15۔10 گنا کم ہیں۔ تاہم کیسپین خطے کا شمار ان علاقوں میں ہوتا ہے جہاں کے تیل کے ذخائر کو نہ پوری طرح تلاش کیا جا سکا ہے اور نہ استعمال میں لانے کی تدبیر کی جا سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی

تیل کمپنیاں، اس خطے میں گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔

مغربی تیل کمپنیوں نے 1991-92ء میں پہلے مغربی سائبریا میں دلچسپی لینا شروع کی۔ 1993-94ء میں قازقستان ان کی دلچسپی کا مرکز بنا۔ 1995-97ء میں آذربائیجان نے ان کی توجہ حاصل کی اور 1997-99ء میں ترکمانستان ان کی دلچسپی کا مرکز بنا۔ 1994-98ء میں 13 ملکوں کی 24 کمپنیوں نے کیسپین کے خطے سے معاہدے کیئے۔ قازقستان میں علاقے کی دوسری جمہوریتوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تیل کے ذخائر ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں 85 بلین بیرل تیل موجود ہے۔ اس میں سے صرف 5-16ا بلین بیرل کے ذخائر کے تصدیق ہوسکی ہے۔ آذربائیجان میں تیل کے ذخائر 27 بلین بیرل کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں سے 11-4 بلین بیرل کی تصدیق ہوچکی ہے۔ ترکمانستان میں تیل کے ذخائر کا اندازہ 32 بلین بیرل ہے لیکن صرف 5ء1 بلین بیرل مصدقہ ہیں۔ ازبکستان کے تیل کے ذخائر ایک بلین بیرل کے قریب ہیں۔ کیسپین خطے میں گیس کے معلوم ذخائر کا اندازہ 236-337 ٹرلین کیوبک فیٹ ہے۔ امریکہ میں 330 ٹریلین کیوبک فیٹ گیس کے ذخائر ہیں۔ ترکمانستان گیس کے ذخائر کے اعتبار سے دنیا میں گیارہویں نمبر پر ہے۔ اس کے پاس 159 ٹریلین کیوبک فیٹ گیس ہے۔

ازبکستان میں 110 ٹریلین کیوبک فیٹ، قازقستان میں 88 ٹریلین کیوبک فیٹ، جبکہ آذر بائیجان اور تاجکستان میں سے ہر ایک کے پاس 35 ٹریلین کیوبک فٹ گیس ہے۔ وسطی ایشیا کے لیڈر مجوزہ پائپ لائنوں، راستوں اور ان کے آس پاس کے جغرافیائی اور سیاسی حالات کے بارے میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ 1996ء میں کیسپین کے خطے نے ایک ملین بیرل تیل یومیہ پیدا کیا، اس میں سے صرف 3 لاکھ بیرل تیل برآمد کیا گیا۔ وہ بھی زیادہ تر قازقستان سے، اس میں سے ایک لاکھ 40 ہزار بیرل سابق سوویت یونین کے باہر برآمد کیا گیا۔ کیسپین خطے کی تیل کی پیداوار، تیل کی عالمی

MashalBooks.org

پیداوار کے صرف 4 فیصد کے برابر ہے۔ 1996ء میں خطے کی قدرتی گیس کی پیداوار 3ء3 ٹریلین کیوبک فیٹ تھی۔ اس میں سے صرف 8ء0 ٹریلین کیوبک فیٹ سابق سوویت یونین سے باہر علاقوں کو برآمد کی گئی، وہ بھی زیادہ تر ترکمانستان سے۔ تیل اور گیس کی بیرونی دنیا کو ترسیل کے لئے پائپ لائنوں کی اشد ضرورت تھی۔ تیل کی تلاش اور اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے ضمن میں بڑی طاقتیں اس طرح دلچسپی لے رہی ہیں، جس طرح انہوں نے 1920ء میں مشرق وسطیٰ میں دلچسپی لی تھی، لیکن وسطی ایشیا میں دلچسپی کے اعتبار سے مقابلے کی ایک پیچیدہ صورت دکھائی دیتی ہے۔ بڑی طاقتیں جیسا کہ روس، چین، امریکہ اور ہمسایہ ممالک ایران، پاکستان، افغانستان، ترکی، خود وسط ایشیائی جمہوریتیں اور بڑی آئیل کمپنیاں ایک نئے عظیم سازشی کیس میں شریک ہیں۔

حکومتوں، تاجروں اور آئیل کمپنیوں نے نئے عظیم کیس کی اصطلاح کو اپنا لیا ہے۔ یہ اصطلاح میں نے 1997ء میں ایک مضمون میں تجویز کی تھی۔ میں 1989ء میں پہلی بار وسطی ایشیا اسی وقت گیا تھا، جب صدر میخائیل گورباچوف نے پرسٹرویکا ریفارم پروگرام پیش کیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ افغانستان سے سوویت فوج کے انخلاء کے بعد نسلی مسئلہ دھماکہ خیز ثابت ہوگا۔ میں افغان، ازبکستان، ترکمانستان اور تاجکوں کے نسلی ماخذ جاننے کے لئے ان علاقوں میں جانا چاہتا تھا، جہاں سے یہ لوگ آئے تھے۔ اس کے بعد میں کئی بار اس خطے میں گیا اور نسلی اور سیاسی رجحانات کے بارے میں بہت کچھ جان سکا۔ سوویت یونین کے بکھر جانے کے بعد ان رجحانات نے شدت اختیار کر لی۔ میں اتفاقاً 12 دسمبر 1991ء کو اشک آباد میں تھا، جہاں وسط ایشیا کے لیڈر سوویت یونین کے حصے کرتے ہوئے اور اپنی اپنی آزادی کے بارے میں غور و خوض کرنے کے لئے جمع تھے۔ وہ سب سوویت کے ریاستی نظام کی حمایت اور تحفظ سے محروم ہونے کے خیال سے ڈرے ہوئے تھے، وہ اپنے طور پر بیرونی دنیا کا کس طرح سامنا کر سکیں گے، یہ سوال ان کے لئے اضطراب کا موجب بنا ہوا تھا۔

چند ماہ کے اندر جب ان کی اقتصادی حالت ابتر ہوئی، انہیں اپنے تیل کے وسائل سے استفادے کے لئے پائپ لائنوں کے بچھانے کی ضرورت کا احساس ہوا تو انہوں نے مغربی تیل کمپنیوں سے گفت وشنید شروع کی۔ قازقستان امریکی کمپنی شورون سے پہلے ہی مذاکرات میں مصروف تھا۔ میرا علاقے میں آنا جانا، وسطی ایشیا پر ایک کتاب کی تصنیف پر منتج ہوا۔لیکن افغانستان میں خانہ جنگی پھیلنے کے پیش نظر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ اس کے اثرات سارے وسطی ایشیا پر مرتب ہوں گے۔ پائپ لائنوں کا مسئلہ اس خطے کے جغرافیائی اور سیاسی مستقبل کی بنیاد بنے گا۔ نیا عظیم کھیل (NewGreatGame) کا عنوان تاریخ سے تعلق ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں برطانیہ ہندوستان اور زار میں گئے۔ روس نے وسط ایشیا اور افغانستان میں ایک دوسرے کے اثر کو محدود رکھنے کے لئے غیر اعلانیہ جنگ لڑی۔ ترکستان، افغانستان اور پرشیا کے الفاظ کئی ایک کے لئے بیگانہ اور اجنبی یا عجیب تغیرات اور دم توڑتے ہوئے رومان کی یاد دلاتے ہیں۔ لارڈ کرزن 1898ء میں ہندوستان کا وائسرائے بننے سے پہلے شطرنج کی بساط کے وہ مہرے ہیں جو دنیا میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے چلائے جاتے رہے ہیں؟ برطانیہ ہندوستان سے افغانستان کی طرف بڑھ رہا تھا اور زار کی فوجیں وسطی ایشیا کو فتح کر رہی تھیں۔ دونوں طاقتوں کے لئے کشش کا مرکز افغانستان تھا۔ برطانیہ ڈرتا تھا کہ روس نے ترکمان علاقے سے ہرات پر چڑھائی کی تو برطانوی بلوچستان کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے گا اور روس کی رشوت سے کابل کے حکمران برطانیہ کے مخالف ہو جائیں گے۔ روسیوں کو خوف تھا کہ برطانیہ مسلم قبائل کی بغاوت کی حمایت کر کے بخارا اور قوقند کے حکمرانوں کو اکسا کر وسطی ایشیا میں ان کے مفادات کو خطرے میں ڈال دے گا۔ جیسا کہ آج بھی ہو رہا ہے۔ اصل جنگ دونوں بڑی سلطنتوں کی ریلوے لائنیں بچھانے پر تھی۔ روسیوں نے وسط ایشیا میں افغانستان، ایران اور چین تک پہنچنے والی ریلوے لائن بچھائی، برطانیہ نے ہندوستان میں افغانستان کے ساتھ لگنے

والی اپنی سرحد تک ریلوے لائنیں بچھا دی۔ آج کی عظیم گیم بھی وسعت پذیر سلطنتوں کے درمیان جاری ہے۔ روس جو کمزور پڑ چکا ہے اور دیوالیہ ہوگیا ہے۔ وسط ایشیا کو اپنی سرحد سمجھ کر روس پر اپنی گرفت مضبوط بنانے اور کیپسین تیل کے بہاؤ کو اپنے قابو میں رکھنے کی فکر میں ہے اور امریکہ تیل کی مجوزہ پائپ لائنوں کے حوالے سے علاقے میں اپنا اثر بڑھانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ایران، ترکی اور پاکستان، وسط ایشیا تک رسائی کے لئے اپنے طور پر مواصلات کا نظام قائم کرنے کے لئے جہد آزما ہیں اور چاہتے ہیں کہ مشرق، مغرب یا جنوب کی طرف جانے والی پائپ لائنیں ان میں سے ہو کر گزریں۔ چین سنکیانگ کے علاقے میں استحکام چاہتا ہے۔ یہاں اسی نسل کے مسلمان آباد ہیں جس نسل کے وسطی ایشیا میں ہیں۔ اس کے علاوہ چین اپنی تیز رفتار اقتصادی ترقی کے لئے تیل کے حصول کی خاطر اہم سرحدی علاقے میں اپنا سیاسی اثر بڑھانے کا خواہشمند ہے۔ وسطی ایشیا کی ریاستوں کے آپس کے اختلافات، ترجیحات اور فوجی تقاضے ہیں۔ اس پر امریکی، یورپی اور ایشیائی تیل کمپنیوں کے درمیان مقابلہ ہے۔

انیسویں صدی کی طرح افغانستان کا عدم استحکام اور پیش قدمی کرتے ہوئے طالبان نے عالمی رقابت اور مقابلے میں پھر ایک نئی جہت کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ نئے سازشی کھیل کا محور بن گئے۔ متعلقہ ملکوں اور کمپنیوں کو طے کرنا تھا کہ طالبان کے مقابلے میں اترا جائے یا ان کی پیٹھ تھپکی جائے اور کیا طالبان وسطی ایشیا سے جنوبی ایشیا تک پائپ لائنیں بچھانے میں معاونت کریں گے۔ کیا ان کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے؟ افغانستان نے وسطی ایشیا کو صدیوں سے چھاتی سے لگائے رکھا تھا۔ وہ علاقہ جو آج کے دور میں تاجکستان، جنوبی ازبکستان اور شمالی افغانستان پر مشتمل ہے، صدیوں سے ایک مربوط خطے کی صورت میں رہا۔ بخارہ اور کابل کے حکمران اس کے فرمانروا رہے۔ امیر بخارا اپنی فوج کے لئے افغان سپاہیوں پر انحصار کرتا آیا تھا۔ سزا یافتہ قبائیلی سردار ڈاکو اور ملا ایک دوسرے کے علاقے میں پناہ لیتے رہے۔ ان علاقوں کے درمیان کوئی سرحد

نہیں تھی۔ اس لئے آنے جانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ 1997ء میں تاجکستان نے جنوبی تاجکستان میں کلیاب کا فضائی اڈہ احمد شاہ مسعود کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ایران اور روس سے فوجی ساز و سامان وصول کر سکے۔ دراصل یہ قدیم رابطے ہی کا تسلسل تھا۔ افغانستان کا وسطی ایشیا سے ربط باہم 1917ء میں روسی انقلاب کے بعد اس وقت ختم ہوا جب سوویت یونین نے اپنی سرحدیں اپنے جنوبی مسلمان ہمسایوں کے ساتھ بند کر دیں۔ 1991ء میں ان سرحدوں کے پھر سے کھل جانے سے نیا سازشی کھیل شروع کرنے میں بڑی مدد ملی۔

آج افغانستان کی سرحد بھی ترکمانستان، تاجکستان اور ازبکستان سے ملحق ہیں۔ صرف ترکمانستان میں تیل اور گیس کے سب سے زیادہ ذخائر ہیں۔ پامیر کے سلسلہ کوہ کے ساتھ ساتھ تاجکستان کے پچاس لاکھ عوام افغانستان کے ساتھ 640 میل لمبی دشوار گزار سرحد کے حصہ دار ہیں۔ دریائے آمو اسے کاٹ کر گزرتا ہے۔ افغانستان کی ایک چوتھائی آبادی تاجک ہے، مزید تاجک وسط ایشیا کی جمہوریتوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دو لاکھ تاجک چین کے صوبے سنکیانگ میں رہتے ہیں، وسطی ایشیا کا واحد بڑا نسلی قبیلہ، جو ترکی النسل ہوئے تاجکوں کا ہے۔ یہ ان ایرانی قبائل کی اولاد ہیں جو 1500 سے 1000 سال قبل مسیح وسطی ایشیاء میں جا بسے تھے لیکن بعد میں منگولوں کے حملوں نے انہیں بکھیر دیا۔ قدیم زمانے میں تاجکستان خطے کا فوجی اور اقتصادی مرکز تھا۔ ترک حملہ آوروں کو شاہراہ ریشم تک پہنچنے کے لئے اس میں سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ ترک حملہ آور ایران، روس، یورپ، افغانستان، ہندوستان اور تاجکستان میں سے گزر کر جاتے تھے۔ روس نے موجودہ تاجکستان کا شمالی حصہ 1868ء میں اپنے اندر ضم کر لیا اور یہ روسی قبضے میں صوبہ ترکستان کا حصہ بنا دیا گیا۔ جیسے جیسے عظیم کھیل نے شدت پکڑنا شروع کی تو روس اور برطانیہ نے 1884ء میں افغانستان اور وسطی ایشیا کی سرحد کی باقاعدہ نشان بندی کی۔ روس نے جنوبی تاجکستان کو اپنے اندر شامل کر لیا۔

سٹالن نے 1924-25ء میں یک طرفہ طور پر محض لکیر کھینچ کر پانچ وسطی ایشیائی جمہوریتیں بنا دیں۔ اس نے تاجک ثقافت اور تاریخ کے دو اہم مراکز بخارا اور سمرقند، ازبکستان کے حوالے کر دیئے۔ اس طرح دو جمہوریتوں کے درمیان مخاصمت کی بنیاد رکھ دی جو آج تک جاری ہے۔ آج کا تاجکستان قدیم تاجکوں یا پرانے اقتصادی مراکز کی روایات اور عظمتوں کا نمائندہ نہیں۔ سٹالن نے پامیر کے پہاڑی سلسلے میں گورنو بدخشان کا ایک خودمختار علاقہ بھی قائم کیا، جو تاجکستان کے 44 فیصد رقبے پر محیط ہے اور اس میں تاجک آبادی صرف 3 فیصد ہے۔ تاجک سنی مسلمان ہیں، جبکہ گورنو بدخشان کے مختلف پامیری نسلوں کے لوگوں میں زیادہ تر شیعہ ہیں۔ ان میں اسماعیلی بھی ہیں، جو افغانستان کے علاقہ بدخشان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

1917ء کے انقلاب کے چند مہینے بعد، وسطی ایشیا میں مسلم گوریلا گروپوں نے بالشویکوں کی مزاحمت شروع کر دی۔ بالشویک انہیں باس ماچی یعنی ڈاکو کہہ کر پکارتے تھے۔ گوریلوں کی تحریک اسلام اور نیشنلزم کے نام پر کمیونزم کی مخالفت کر رہی تھی۔ ساٹھ برس بعد یہی جذبہ افغانستان میں مجاہدین کو نیا ولولہ دینے کا محرک ہوا۔ 1919ء میں برطانیہ نے سوویت طاقت کو زک پہنچانے کے لئے اس تحریک کی مدد کی۔ کابل کے حکمرانوں کو اونٹوں کے قافلوں کے ذریعے گولہ بارود اور اسلحہ بھجوایا گیا۔ ہزاروں تاجکوں نے شمالی افغانستان میں پناہ لی۔ ان کی تحریک کو بالشویکوں نے 1929ء میں کچل دیا۔ 1980ء میں اس ڈرامے کا نیا رخ سامنے آیا جب امریکہ نے افغان مجاہدین کو وسطی ایشیا میں داخل ہونے اور روسی فوجی چوکیوں پر حملہ کرنے کی شہ دی۔ تاجکستان، سوویت یونین کا حصہ رہتے ہوئے بھی پسماندہ اور افلاس زدہ رہا۔ اس کا بجٹ سوویت یونین کی مالی امداد سے بنتا تھا۔ 1991ء کے بعد ازبکوں اور تاجکوں کے درمیان اور تاجکوں کے اندر مختلف خاندانوں کے مابین کشیدگی پیدا ہونے لگی، جو 1992-97ء میں خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گئی۔ ایک طرف نئی کمیونسٹ حکومت تھی اور دوسری طرف اسلام پسند

تھے۔ ان کے باہمی تصادم سے ملک میں تباہی ہونے لگی۔ ایک بار پھر ہزاروں تاجک باغی اور مہاجر شمالی افغانستان میں پناہ گزین ہوئے۔ تاجک حکومت کو روسی فوجوں کی مدد حاصل تھی۔

1993ء میں صدر یورس یلتسن نے اعلان کیا کہ تاجک افغان سرحد درحقیقت روس کی سرحد ہے اور اس پر مامور 25 ہزار روسی سپاہی روس کا دفاع کریں گے۔ یہ وسطی ایشیا میں روس کے کردار کا اعادہ تھا۔ بالآخر تاجکستان میں نئی کمیونسٹ حکومت اور اسلامی حزب مخالف نے اقوام متحدہ کے ایما پر امن کا معاہدہ کر لیا لیکن فریقین تاجک قبائیل کو جو بری طرح بٹ چکے تھے، ایک قوم کا تشخص دلانے میں کامیاب نہ ہو سکے، ان اندرونی گروہ بندیوں نے اور مقامی اہل دانش کی عدم موجودگی کے باعث تاجکوں کو اپنی زمین سے رشتہ استوار کرنے اور باہمی اختلافات ختم کر کے ایک مربوط قوم بننے کی کوئی کارگر اور موثر صورت پیدا نہ ہونے دی۔ ایسے میں تاجکستان کے احوال پر افغانستان کے اثرات مرتب ہونا فطری تھا۔ دونوں فریق جو خانہ جنگی سے الجھے ہوئے تھے، بالآخر احمد شاہ مسعود سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

طالبان کے خلاف جنگ میں مسعود تاجک قوم پرستی کی علامت بن گیا۔ طالبان کے اس الزام نے کہ مسعود بدخشان کے صوبے کو ملا کر عظیم تر تاجکستان بنا رہا ہے اور یوں افغانستان کو منقسم کر رہا ہے، تاجکوں کی نگاہ میں مسعود کی قدر و منزلت بڑھا دی مگر مسعود نے کہا وہ اس طرح کے عزائم نہیں رکھتے۔ تاجکستان کے نزدیک طالبان اسلامی بنیاد پرستی کے نمائندہ جدید اور وسطی ایشیا کے صوفیانہ روحانی رویوں کے لگاؤ کے خلاف ہیں۔ پشتون توسیع پسندی تاجکوں کی خواہشوں سے براہ راست متصادم ہے۔ ازبکستان میں اسلامی انتہا پسندی، جسے کسی حد تک افغانستان نے ابھارا، صدر اسلام کریموف کے لئے شدید چیلنج ہے۔

ازبک اس علاقے کی عددی اعتبار سے بڑی، جارح اور با اثر نسل ہے۔ اسے وسطی

ایشیا کا سیاسی اعصابی مرکز کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سرحدیں، وسطی ایشیا کی تمام جمہوریتوں اور افغانستان سے ملحق ہیں۔ اس کے دو شہروں سمرقند اور بخارا نے گزشتہ ڈھائی ہزار سال کے دوران بے شمار تہذیبوں کا عروج و زوال دیکھا ہے۔عرب کے بعد انہیں اسلامی تعلیمات کا دوسرا بڑا مرکز سمجھا جاتا رہا ہے۔ازمنہ وسطیٰ میں بخارا میں 350 مساجد اور 113 مدرسے تھے۔ 1900ء میں یہاں 100 مدرسوں میں دس ہزار طلبا زیر تعلیم تھے۔ 250 میل طویل وادی فرغانہ اسلامی تعلیمات سے اپنے تعلق اور باس ماچی تحریک سے وابستگی کی شہرت رکھنے کے علاوہ وسط ایشیا کا زرعی لحاظ سے سب سے زیادہ زرخیز علاقہ ہے۔صدر کریموف کی مخالفت کرنے والے اسلام پسندوں کا مرکز بھی ہے۔ ازبک اپنا رشتہ چنگیز خان کے منگولوں سے ملاتے ہیں۔جن کی ایک شاخ شائے بانی قبیلہ نے 1500ء میں جدید ازبکستان اور شمالی افغانستان فتح کیا تھا۔سولھویں صدی کے مورخ محمود بن ولی نے ازبکوں کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے زمانے کے ازبک بڑے غصیلے، تیز طراز، جرئات مند اور باغی نوعیت کے تھے۔ازبکوں کی طاقت حاصل کرنے کی خواہش آج بھی پہلے ہی کی طرح ہے۔ازبکستان، وسطی ایشیائی جمہورتوں میں سے سب سے بڑی قوم ہے۔ اس کی آبادی دو کروڑ بائیس لاکھ ہے۔ ساٹھ لاکھ ازبک، دوسری جمہوریتوں میں رہتے ہیں۔ تاجکستان، ترکمانستان اور قازقستان ہیں، ان کی حیثیت ایک بڑی اقلیت کی ہے۔ اسلام کریموف علاقے میں غالب حیثیت حاصل کرنے کی جو خواہش رکھتے ہیں، یہ اقلیتی ازبک اسے پورا کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

20 لاکھ ازبک شمالی افغانستان میں رہتے ہیں۔ یہ باس ماچی بغاوت کے دوران نقل مکانی کر کے یہاں آ گئے تھے۔ 2500 ازبک چین کے صوبہ سنکیانگ میں رہتے ہیں۔

سوویت فوج کے افغانستان سے نکل جانے سے بہت پہلے ماسکو اور تاشقند میں افغان ازبکوں کو شمالی افغانستان میں ازبکوں کے زیر اثر ایک ایسا حفاظتی حصار قائم کرنے کی

ترغیب دلا رہے تھے، جو مجاہدین کو قبضہ کرنے سے روک سکے۔ دس برس تک یہ پالیسی موثر اور کامیاب رہی۔ جنرل رشید دوستم کا چھ صوبوں پر کنٹرول رہا، انہیں ماسکو اور تاشقند کی فوجی امداد حاصل تھی۔ اس نے مجاہدین کو اور بعد میں طالبان کو روکے رکھا۔ 1994ء کے بعد کریموف نے وسطی ایشیائی جمہوریتوں اور روسیوں کا طالبان مخالف محاذ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن 1998ء میں مزار شریف کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد کریموف کی پالیسی ناکام ہوگئی۔ اب طالبان ازبکستان کے قریبی ہمسائے ہیں۔ تب سے افغانستان میں ازبکستان کا اثر بڑی حد تک ختم ہوگیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کریموف، مسعود کا جو ایک تاجک ہے، ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ کریموف نے اپنا وزن تاجکستان پر، جہاں کی 24 فیصد آبادی ازبکوں کی ہے، ڈالنے کی بھی کوشش کی، لیکن اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔

1992ء میں کریموف نے اسلامی باغیوں کو کچلنے کے لئے تاجک حکومت کی فوجی حمایت کی۔ 1996ء تک جب متحارب فریقوں کے درمیان امن کے لئے مذاکرات جاری تھے۔ کریموف نے دونوں فریقوں پر زور دیا کہ وہ شمالی تاجکستان میں مقامی ازبک بغاوت کی حمایت کر کے ازبک اقلیت کو زیادہ اہم کردار ادا کرنے دیں۔ کریموف حکومت اور باغیوں پر مشتمل مخلوط حکومت کے قیام کے خلاف تھے کیونکہ اس طرح اسلام پسندوں کو اچھا بنا کر پیش کیا جاتا، جو ازبکستان کی پہلے سے مایوس آبادی کی حوصلہ شکنی کا موجب ہوتا۔

کریموف نے اپنے ہاں ایک بڑی منظّم، موثر اور آمرانہ مزاج کی پولیس کے ذریعے سخت آمرانہ کنٹرول کیا ہوا ہے اور لوگوں کو دبانے کے جواز میں افغانستان اور تاجکستان کی مثال پیش کرتے ہیں۔ کریموف کے سب سے اہم مخالف زیرزمین انتہا پسند اسلامی گروپ تھے۔ ان میں سے بعض وہابی تھے، جو وادی فرغانہ میں مرتکز تھے۔ ان میں سے کئی ازبک انتہا پسندوں نے خفیہ طور پر سعودی عرب اور پاکستان میں تعلیم حاصل کی تھی یا

1980ء کے عشرے میں افغان مجاہدین کے کیمپوں میں تربیت پائی تھی۔ انہوں نے طالبان سے ربط وضبط قائم کرلیا تھا۔ کریموف نے تمام وسط ایشیائی جمہوریتوں کے لئے اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف نہایت سخت قوانین منظور کرائے تھے، جن کی رو سے مدرسوں کی تعلیم، داڑھی بڑھانا ممنوع قرار پایا۔ تمام بے چینی اور اضطراب وہابیوں کا کیا دھرا کہا جانے لگا۔ ازبک حکام ہرنوع کی اسلامی سرگرمیوں کے لئے وہابیت کا اصطلاح استعمال کرنے لگے۔ لیکن ازبکستان کی آدھی آبادی 18 برس سے کم عمر کی ہے۔ بے روزگاری اور مہنگائی عام ہے، جس کے سبب ازبکستان نوجوانوں میں بے چینی بڑھتی جارہی ہے۔ حکومت نوجوانوں میں سماجی، اقتصادی اضطراب کو چنداں اہمیت نہیں دیتی۔ ازبکستان کو وسطی ایشیا کی سب سے بڑی طاقتور ریاست ہونا چاہیے لیکن اسے نہایت سنگین سیاسی اور مذہبی جتھے بندی اور مسائل کا سامنا ہے۔ کریموف کے افغانستان اور تاجکستان میں ناکام اقدامات سے اسلامی انتہا پسندی کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

بہرحال اس سب کچھ کے باوجود ازبکستان نئے عظیم کھیل کا ایک بڑا کھلاڑی ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے لئے کافی تیل اور گیس پیدا کر رہا ہے۔ جلد ہی وہ تیل اور گیس برآمد بھی کرنے لگے گا۔ تیل کمپنیوں نے جو تاشقند کے ہمسایوں کے ساتھ معاہدے کرنے کا جتن کرتی رہی ہیں۔ ازبکستان کو نظر انداز کئے رکھا ہے۔ ہمسایہ ریاستوں کے بیرونی سرمایے کے حصول میں کامیابی پر کریموف کو ان سے حسد اور رقابت ہونے لگی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے مغربی سرمایہ کاروں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے معیشت پر سرکاری کنٹرول نرم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر تاشقند، تیل اور گیس برآمد کرنے لگا تو وہ چاہے گا کہ پائپ لائنیں اس کی مرضی کے راستوں سے گزریں تاکہ ازبکستان کو فائدہ پہنچ سکے۔ اس کے ہمسائے ترقی نہ کرسکیں اور خطے میں اسے اور زیادہ اثر اور رسوخ حاصل ہو جائے۔

افغانستان کی 5 لاکھ ترکمان آبادی، سوویت یونین کی 1920ء کی خانہ جنگی کے نتیجے

میں یہاں منتقل ہوئی تھی۔ افغانستان میں سب سے پہلے انیسویں صدی کے اوائل میں اساری قبیلے کے لوگ آ کر آباد ہوئے، ان کے بعد ترکی قبیلہ آیا، اس کی بالشویکوں کے خلاف بغاوت ناکام ہوگئی تھی۔ جس پر انہیں نقل مکانی کرنا پڑی۔ ترکمانستان زیادہ تر صحرائی اور پہاڑی علاقہ ہے، جہاں ترکمان خانہ بدوش قبیلے آباد ہیں، انہوں نے ایران کا سخت مقابلہ کیا لیکن ہار گئے۔ ترکی اور روس فاتحین کے سامنے بھی قدم نہ جما سکے۔ انیسویں صدی سے پہلے ترکمانوں کے لئے سرحدوں کی کوئی اہمیت نہ تھی، وہ علاقے میں آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔ 3 لاکھ ترکمان اب بھی ایران میں رہتے ہیں۔ ایک لاکھ 70 ہزار عراق میں، 80 ہزار شام میں اور کئی ہزار ترکی میں بس گئے ہیں۔ ترکئی سب سے بڑا ترکمان قبیلہ ہے، اس نے 1870ء میں اپنے علاقے میں روس کی پیش قدمی کی مزاحمت کی۔ 1881ء میں اس نے گوئیک ٹپتی کے نخلستان میں روسی فوج کا صفایا کر دیا، ایک سال بعد روس کی جوابی کارروائی میں چھ ہزار ترکمان گھڑسوار ہلاک ہوئے۔ 1916ء میں ترکمانوں نے محمد قربان جنید خان کی کرشماتی قیادت میں پہلے زار شاہی روس کے خلاف خون ریز مزاحمت شروع کی اور بعد میں بالشویکوں کے خلاف۔ ان کی یہ مزاحمت 1927ء میں شکست کھانے تک جاری رہی۔ بعد میں محمد قربان جنید خان نے افغانستان میں پناہ لے لی۔ سوویت یونین کے پورے زمانے میں ماسکو نے ترکمانستان کو نظر انداز کئے رکھا۔ اس جمہوریہ میں بے روزگاری کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ نوزائیدہ بچوں کی اموات کی شرح کا بھی یہی عالم تھا اور تاجکستان کی طرح یہاں بھی سب سے کم صنعتیں لگائی گئیں۔ ماسکو نے سائبریا سے تیل اور گیس کی صنعت میں سرمایہ کاری کی لیکن ترکمانستان کے تیل کے وسیع ذخائر کو نظر انداز کئے رکھا۔

1989ء میں ترکمانستان نے اپنی آمدنی کا 47 فیصد حصہ 2ء3 بلین کیوبک فیٹ قدرتی گیس دوسری سوویت جمہوریتوں کے ہاتھ فروخت کر کے حاصل کیا۔

سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد ترکمان کے گاہک غریب ہو گئے۔ آزاد

ریاستیں اپنے بل ادا کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ ترکمانستان کے وزیر خارجہ، ایروی قلی بیف نے 1991ء میں مجھے بتایا کہ ہمیں کوئی اندازہ نہیں کہ ہماری گیس کون خریدے گا اور اس کی قیمت کیسے ادا کرے گا۔ ترکمانستان کی مصیبت یہ ہے کہ اس کی ایک سرحد ایران سے ملتی ہے۔ جس کے راستے پائپ لائن گزارنا امریکہ کو منظور نہیں۔ دوسری طرف افغانستان خانہ جنگی کی گرفت میں ہے اس لئے اس میں بھی پائپ لائنیں نہیں بچھائی جاسکتیں۔ رہا روس تو اسے سائبیریا کے تیل اور گیس کی نکاسی کی فکر ہے۔ وہ نہیں چاہے گا کہ ترکمانستان اس کا مقابلہ کرے۔ 1992ء تک یوکرین، آرمینیا اور حتیٰ کہ روس نے بھی ترکمانستان کی درآمدی گیس کے بل ادا کرنے سے انکار کئے رکھا۔ ترکمانستان کی گیس، سوویت پائپ لائنوں کے جال میں سے گزرتی تھی۔ اب یہ پائپ لائنیں روس کے پاس ہیں۔ ترکمانستان کے ایک ارب ڈالر واجب الاداء ہو گئے تو ازبکستان نے ہمسایوں کو گیس فراہم کرنا بند کر دی، تو اس کے بعد اس کی گیس کی پیداوار کم ہو کر 0ء73 بلین کیوبک فیٹ ہو گئی۔ یہ پانچ سال پہلے کی پیداوار کا چوتھائی حصہ تھی۔ امریکہ، ایران کو الگ تھلگ کرنا چاہتا تھا لیکن اس ضمن میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ ایران اسے جنوب اور سندر تک گیس کی ترسیل کا آسان راستہ دے سکتا تھا۔ صدر نیازوف نے ایک طرف امریکہ سے صاحب سلامت کی اور دوسری جانب سڑک اور ریلوے کے رابطے قائم کرنے کے لئے ایران کی مدد چاہی۔

دسمبر 1997ء میں ایرانیوں نے مغربی ترکمانستان میں کورپڈزے گیس فیلڈ سے شمال مشرقی ایران میں کورڈ کیوے تک 119 میل لمبی پائپ لائن مکمل کر لی، اس پائپ لائن کے ذریعے آنے والی گیس، شمالی ایران میں استعمال ہوتی ہے۔ دس سال کی کوششوں کے نتیجے میں وسط ایشیا سے باہر کی دنیا تک یہ پہلی پائپ لائن بچھائی گئی ہے۔ صدر نیازوف نے مغربی تیل کمپنیوں سے بھی پائپ لائن بچھانے کے لئے بات چیت شروع کر رکھی ہے، تاکہ ترکمانستان کو روسی پائپ لائنوں کے ذریعے گیس باہر بھجوانے کی

احتیاج نہ رہے، اپریل 1992ء ترکمانستان، ترکی اور ایران نے ترکی تک پائپ لائن تعمیر کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا اور طے کیا کہ یہ پائپ لائن یورپ تک جائے گی۔ اس پر خرچ کا اندازہ 255 بلین ڈالر ہے، لیکن اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا، کیونکہ امریکہ نہیں چاہتا کہ مجوزہ پائپ لائن ایران میں ہو کر گزرے۔ اس کے بعد ترکمانستان کی گیس کی برآمد کے لئے مختلف دیگر تجاویز پر غور کیا جانے لگا۔ آخر فروری 1999ء میں ترکمانستان نے ترکی تک پائپ لائن بچھانے کے لئے ایک امریکی کمپنی سے معاہدہ کیا۔ یہ پائپ لائن بحیرہ کیسپین کے نیچے سے گزرتی آذربائیجان پہنچے گی، یوں ایران سے بچ کر نکل سکے گی۔

صدر نیازدف نے اپنے ملک کی معیشت کو تباہ ہوتے دیکھ کر متبادل برآمدی راستے تلاش کرنے شروع کئے۔ 1994ء میں چین کی طرف پائپ لائن بچھانے کا خاکہ تیار ہوا، اس پر خرچ کا تخمینہ 20 بلین ڈالر ہے۔ لیکن یہ منصوبہ ابھی تک غور وخوض ہی کے مرحلے میں ہے۔ 1994ء میں ارجن ٹائن کی تیل کمپنی بریداس نے جسے ترکمانستان میں گیس اور تیل کی تلاش کی سہولت حاصل ہے، تجویز کیا کہ ایک پائپ لائن افغانستان کے راستے پاکستان اور ہندوستان تک بچھائی جائے، جس سے ان ملکوں کو گیس فراہم کی جائے۔ امریکی کمپنی یونوکول جسے واشنگٹن کی حمایت حاصل ہے۔ 1995ء میں اس طرح کی پائپ لائن تجویز کی۔ پائپ لائن بچھانے کے مسئلے پر دونوں کمپنیوں کے جھگڑے میں طالبان اور دوسرے افغان جنگی سردار بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس طرح افغانستان نئے عظیم سازشی کھیل کے لئے لڑی جانے والی پہلی جنگ کا محور بن گیا ہے۔

کمزور، افلاس زدہ اور ایران کے ساتھ اپنی طویل سرحد کا دفاع کرنے کے لئے فوجی طاقت نہ رکھنے والا افغانستان اور اس کے مخالف ازبکستان، ترکمانستان نے غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اپنانے پر صاد کیا۔ اس طرح ترکمانستان کو روس سے فاصلہ برقرار رکھنے اور سوویت یونین کے ٹوٹنے سے جو اقتصادی اور فوجی معاہدے کرنے کی

ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ اس سے دامن کش رہنے کا جواز مل گیا ہے۔ غیر جانبداری کے سبب اشک آباد کو افغانستان کی داخلی کشمکش سے بچنا بھی آسان ہو گیا ہے۔ ترکمانستان کے طالبان مخالف اتحاد میں شامل ہونے سے انکار پر روس اور ازبکستان سے ناراض ہیں۔

1992ء تک جب افغانستان میں کمیونسٹ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اشک آباد اسے ڈیزل فراہم کرتا رہا۔ کمیونسٹ حکومت کے بعد اسماعیل خان کو جس کا ہرات پر کنٹرول تھا، یہی صورت مہیا کی جاتی رہی۔ 1995ء میں طالبان کا قبضہ ہو گیا تو انہیں بھی ڈیزل دیا جاتا رہا۔ ہرات میں ترکمانی قونصلیٹ نے طالبان سے اچھے تعلقات رکھے۔ مزار شریف میں طالبان مخالف اتحاد مقدر تھا، اس سے بھی ترکمانستان کے تعلقات برقرار رہے۔ وسط ایشیا کی جمہوریتوں میں سے واحد ترکمانستان ہے، جس نے طالبان کی مخالفت کرنے کی بجائے ان سے اچھے روابط رکھے ہیں۔

وسطی ایشیا کے دوسرے حکمرانوں کی طرح نیاز دف شدید آمرانہ مزاج کے حامل ہیں۔ انہوں نے کسی سیاسی اپوزیشن کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ذرائع ابلاغ پر سنسر اور معیشت پر سرکاری کنٹرول رکھا ہے۔ انہوں نے سٹالن کی طرز پر شخصیت پرستی کو ہوا دی ہے۔ ہر جگہ اپنی تصویریں اور مجسمے رکھوائے ہیں۔ حکومت کا ایک محکمہ قائم ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ صدر کی تصویریں چھاپتا اور آویزاں کرتا رہے، وہ اور ان کے حریف کریموف دونوں یتیم تھے، دونوں کی پرورش کمیونسٹ یتیم خانوں میں ہوئی ہے۔ کم عمری میں ہی وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے اور آزادی سے پہلے تک وہ اپنے اپنے علاقے کی کمیونسٹ پارٹیوں کے جنرل سیکرٹری کے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی تعلیم، پرورش اور وفاداری اب بھی معدوم کمیونسٹ نظام کے ساتھ رہی، لیکن دونوں نئی عظیم گیم کھیلنے کی صلاحیت اور مہارت رکھتے ہیں۔

پورے خطے میں سوویت یونین کے ٹوٹنے سے ترکی سے بڑھ کر کسی دوسرے ملک کو

فائدہ نہیں پہنچا۔ روس صدیوں تک ترکی کا سخت دشمن چلا آ رہا تھا۔ سترہویں صدی سے پہلے جنگِ عظیم تک روس اور ترکی میں کوئی ایک درجن جنگیں ہوئیں۔ اس دشمنی نے ترکی کو نیٹو کا ممبر بننے پر اکسایا اور یورپی یونین کی رکنیت کے حصول پر آمادہ کیا۔ وسط ایشیاء کی جمہوریتوں کی آزادی نے ترکی کو اس کے تاریخی رشتوں کا احساس دلایا۔ 1991ء تک عظیم ترکی کی سلطنت یعنی ترکوں کا وطن بحیرہ روم سے چین تک پھیلا ہوا تھا، ایک رومانوی خواب تھا جو چند ترک دانشور دیکھتے اور دکھاتے تھے۔ ترکی کی خارجہ پالیسی میں اس کی دور دور تک کوئی جھلک تک بھی نہیں تھی۔ 1991ء کے بعد اچانک عظیم ترکی ایک قابل حصول حقیقت دکھائی دینے لگا ہے جو ترکی کی خارجہ پالیسی کا جزولاینفک بن سکتا ہے۔ ترکی کے نزدیک ہی استنبر ی سے وسطی ایشیا اور چین میں سنکیانگ تک کا علاقہ ترک ہے۔ وسط ایشیا کی جمہوریتوں کے لئے ترکی اقتصادی ترقی کا ایک لائق تقلید نمونہ ہے۔ وہ مسلمان بھی ہے اور سیکولر بھی۔ ترکی اس خطے میں اپنا اثر ونفوذ بڑھانا اور عالمی سٹیج پر بڑا کردار ادا کرنے کا خواہش مند ہے۔

ترکی نے وسط ایشیائی جمہوریتوں کو بھاری امداد فراہم کرنا شروع کی، ان کے دارالحکومتوں تک براہ راست فضائی پروازوں کا آغاز کیا۔ سیٹلائٹ کے ذریعے ٹی وی نشریات کا انتظام کیا، ان کے طلباء کو وظائف کی پیش کش کی، ان کے سفارتی نمائندوں، سپاہیوں اور بینک کاروں کی تربیت کا اہتمام کیا اور سالانہ ترک سربراہ کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ 1992ء سے 1998ء کے درمیان ترک کمپنیوں نے اس علاقے میں 5ء1 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور یوں اس باب میں منفرد حیثیت حاصل کر لی۔ ترکی نے محسوس کیا کہ وسطی ایشیا میں موثر ہونے کے لئے اسے روس کو خوش رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے اس نے روس سے گیس خریدی۔ اس سے تجارت بڑھائی، 1990ء میں ترکی اور روس کی تجارت کی مالیت 9ء1 بلین ڈالر تھی جو 1997ء میں بڑھ کر 1ء4 بلین ڈالر ہوگئی۔ 1997ء میں یورپی یونین نے ترکی کی رکنیت مسترد کی تو ترک ناراض

ہوئے لیکن ترکی نے روس، اسرائیل اور وسطی ایشیا سے اپنے تعلقات کو مزید مضبوط اور موثر بنالیا۔

ترکی اس نئے سازشی کھیل کا ایک بڑا کھلاڑی بن گیا ہے۔ اس کی تیل کی ضرورت اور اس کے فروغ کے لئے حکومت کی کوشش رہی ہے کہ وسط ایشیاء کی تیل اور گیس کی برآمدات ترکی کے راستے ہوں۔ 1997ء کے موسم گرما میں امریکہ اور ترکی نے فیصلہ کیا کہ آذربائیجان میں باکو سے بڑی پائپ لائن جارجیا سے گزارتے ہوئے بحیرہ روم پر ترکی کی بندرگاہ سائی پان تک پہنچائی جائے۔ قازقستان اور ترکمانستان کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنا تیل اس پائپ لائن کے ذریعے باہر بھجوائیں۔ امریکہ کی رائے میں اس طرح خطیر سرمائے سے بننے والی باکو سائی ہان پائپ لائن مالی اعتبار سے منافع بخش ثابت ہوسکتی ہے۔ امریکہ کی خواہش تھی کہ ترکمانستان، بحیرہ کیپسین کے نیچے سے پائپ لائن بچھائے جو باکو سائی ہان پائپ لائن کے متوازی چلتی یورپ تک تیل اور گیس پہنچانے کا وسیلہ بنے۔

امریکہ نے قازقستان پر زور دیا کہ وہ بھی بحیرہ کیپسین کے نیچے سے تیل کی پائپ لائن بچھائے تاکہ باکو سائی ہان لائن کی طرح قازق تیل کی ترسیل ہو سکے۔ دو بڑے مغربی آئیل کنسوریشم قازقستان کے تیل کے وسیع ذخائر کو ترقی دینے کے لئے تنگیز اور کراچنگنک میں کام کر رہی تھیں۔ ادھر چین یوزن کے گرد کے علاقے میں تیل کے ذخائر کو مصرف میں لانے کے لئے ایک تیسرے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ قازقستان تنگیز سے بحیرہ اسود پر روسی بندرگاہ نوروسیکسک تک پائپ لائن تعمیر کرنے کا منصوبہ رکھتا تھا۔ اس کی تکمیل امریکی کمپنی شعورون کے ذمے تھی۔ باکو سائی ہان پائپ لائن کے متبادل تھی لیکن اسے روس سے بچ کر نکلنا تھا۔

آذربائیجان انٹرنیشنل آپریٹنگ کمپنی جو قریباً ایک درجن عالمی آئیل کمپنیوں نے مل کر بنائی تھی اور جسے آذربائیجان میں تیل کی ترقی کے ضمن میں اجارہ داری حاصل تھی۔ باکو

سائی ہان کے راستے پائپ لائن بچھانے کے خلاف تھی کیونکہ اس پر زیادہ خرچ پڑتا۔ یہ بہت لمبی تھی اور اسے ترکی کے پرخطر کرد علاقے میں سے ہو کر گزرنا تھا۔

1998ء تک یہ واضح ہو گیا کہ امریکہ کے افغانستان کے راستے پائپ لائن گزارنے کے منصوبوں پر عمل درآمد میں تاخیر ہو گئی ہے۔ اس لئے باکو سائی ہان کے راستے پائپ لائن بچھانے کو اہمیت دی جانی چاہیے۔ باکو سائی ہان پر بحث و تمحیص دو برس تک جاری رہی۔ 1998ء میں ایشیائی اقتصادی بحران کے باعث تیل کی عالمی قیمتیں گر گئیں۔ 1997ء تیل کی قیمت 25 ڈالر فی بیرل تھی جو کم ہو کر 13 ڈالر فی بیرل رہ گئی۔ جس کے پیش نظر وسط ایشیائی تیل سے فوری استفادہ غیر منافع بخش ہو گیا۔ اسے نکالنا اور اسے منڈی میں پہنچانا بہت مہنگا تھا۔ وسط ایشیائی تیل کی اوسط قیمت 18 ڈالر فی بیرل تھی۔ باکو سائی ہان راستہ تجارتی لحاظ سے قابل عمل نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود واشنگٹن اس کی تعمیر پر مصر رہا۔ کیونکہ یہ وسط ایشیا سے متعلق امریکہ کی پالیسی کی اساس تھا۔

ترکی نے 1980ء کی دہائی میں افغان مجاہدین کی حمایت کی لیکن اس کا کردار محدود رہا لیکن جب اس نے ترک خارجہ پالیسی کے لئے کام شروع کیا تو انقرہ افغانستان میں ترک اقلیتوں جیسا کہ ازبک کی سرگرمی سے حمایت کرنے لگا۔ ترکی نے جنرل رشید دوستم کو مالی امداد دی، دو مرتبہ انہیں جلاوطنی کی صورت میں اپنے ہاں پناہ دی۔ ترکی طالبان کا سخت مخالف ہو گیا۔ جس نے اس کے قریبی اتحادی پاکستان کے ساتھ نئی کشیدگی پیدا کی تھی۔ علاوہ بریں طالبان کے خطرے نے ترکی کو اپنے علاقائی حریف ایران کے بارے میں مفاہمت کا رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔

ترک نے افغانستان کے بارے میں اسرائیل کی پالیسی میں تبدیلی لانے کے سلسلے میں بھی کردار ادا کیا۔ ترکی اور اسرائیل نے 1993ء کے روسلو معاہدوں کے بعد باہم قریبی فوجی اور دفاعی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ اسرائیلی اور خاص طور پر امریکہ کی یہودی لابی طالبان کے کچھ ایسے خلاف اور ناقد نہیں تھے۔ امریکی دفتر خارجہ کی پیروی

میں اسرائیل، طالبان کو ایران مخالف سمجھتے تھے۔ انہیں افغانستان اور وسطی ایشیاء میں ایرانی اثر کو روکنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال تھا کہ یوتو کال کی پائپ لائن کے افغانستان سے گزرنے سے ایران کے وسط ایشیا سے اپنی پائپ لائن بچھانے میں تاخیر ہو جائے گی۔

اسرائیل کی انٹیلی جینس ایجنسی موساد نے امریکہ میں طالبان کے ربط دفاتر اور تیل کمپنیوں کے ذریعے طالبان سے مذاکرات شروع کئے۔ پاکستان کی آئی ایس آئی نے ان مذاکرات کی حمایت کی۔ اگرچہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتا۔ آئی ایس آئی نے افغانستان جہاد کے دوران سی آئی اے کے ذریعے موساد سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ترکی کی ابتدائی حمایت سے اسرائیل نے ترکمانستان، ازبکستان اور قازقستان سے قریبی سفارتی اور اقتصادی تعلقات استوار کر لئے۔ اسرائیلی کمپنیوں نے زراعت، تیل کی صنعت اور مواصلات کے شعبوں میں سرمایہ کاری کی، لیکن جیسے ہی امریکہ نے طالبان کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کی، اسرائیل نے بھی کر لی۔ اس کا محرک یہ تھا کہ افغانستان نے اسامہ بن لادن کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی، دوسرے وہ منشیات کی کاروبار میں بھی شریک تھا۔ ترکی نے اسرائیل کو یقین دلایا کہ طالبان علاقے کی سلامتی کے لئے خطرہ ہیں اور وہ وسط ایشیاء میں اسلامی بنیاد پرستی پھیلا سکتے ہیں، چنانچہ یوتو کال کا منصوبہ ہوا میں تحلیل ہوا۔ اسرائیل نے اپنے وسط ایشیائی اتحادیوں ترک کی طالبان سے مخالفت کا سبب جان لیا تو موساد نے طالبان مخالف اتحاد سے رابطے قائم کرنے شروع کئے۔ اسرائیل نے اب یہ کوشش شروع کی کہ طالبان پورے افغانستان پر قابض ہونے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ ایران کی طرف سے احمد شاہ مسعود کی حمایت کو مشکوک ضرور جانا گیا لیکن کچھ زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ طالبان اور شمالی اتحاد دونوں ایک دوسرے پر اسرائیل سے امداد لینے کا الزام لگاتے رہے۔

ایران کے پاس دنیا میں گیس کے دوسرے بڑے ذخائر ہیں۔ 93 بلین بیرل تیل

کے معلومہ ذخائر ہیں۔ 3ء6 ملین بیرل تیل سالانہ نکال رہا ہے۔ تیل کی قیمتیں گرنے سے پائپ لائنوں کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا تو ایران نے وسط ایشیائی جمہوریتوں پر زور دینا شروع کیا کہ وہ ایران کے راستے شمال مشرقی پائپ لائن کے ذریعے تیل خلیج تک پہنچائیں۔ ایران کے ڈپٹی وزیر تیل علی ماجد نے تہران میں کہا کہ یہ پائپ لائن ترکی کے راستے بچھائی جانے والی مجوزہ پائپ لائن پر اٹھنے والے خرچ کے عشر عشیر سے تعمیر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایران میں پہلے سے پائپ لائنوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے، بس ایران کو آذربائیجان سے ملانے کے لئے پائپ لائن چاہیے۔ وسط ایشیائی تیل کے لئے ایرانی راستہ محفوظ ترین، نہایت سستا اور آسان ہے۔ ایران کو صرف 3 لاکھ ڈالر خرچ کرنا پڑیں گے۔ جب کہ ترکی کے راستے پائپ لائن بچھانے پر خرچ کا تخمینہ 3 ارب ڈالر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کو گیس برآمد کرنے کے لئے افغانستان کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے ایران میں پائپ لائن تعمیر کرنا یہ زیادہ پسندیدہ راستہ ہے۔ اس ضمن میں اس کا ترکمانستان سے مقابلہ ہے۔

اپنے پروگرام کے پہلے مرحلے میں ایران نے اپنے کروڈ آئیل کو وسط ایشیاء کے کروڈ آئیل سے بدلنے کی تجویز پیش کی۔ 1998ء سے ترکمانستان اور قازقستان کا کروڈ آئیل بحیرہ کیسپین کے راستے کیسپین ہی کے ایرانی بندرگاہ، نیکا میں پہنچایا جاتا، جہاں اسے صاف کر کے ایران میں ہی استعمال کیا جاتا۔ اس کے بدلے میں ایران نے آئیل کمپنیوں کو خلیج میں ایرانی بندرگاہوں سے تیل اٹھانے کی سہولت دیئے رکھی۔ پائپ لائن کے منصوبے کے غیر معینہ التواء کے پیش نظر ایران کی اپیل نے اثر دکھایا اور اس کے باوجود کہ امریکہ اس کے خلاف تھا۔ انہوں نے ایران سے تیل کے ادلے بدلے کے لئے بات چیت شروع کر دی۔ دو امریکی کمپنیوں شعوردن اور مویل نے جنہیں قازقستان اور ترکمانستان میں تیل اور گیس سے متعلق رعایتیں حاصل تھیں، مئی 1998ء میں کلنٹن انتظامیہ سے درخواست کی کہ انہیں ایران سے تیل کے بدلے کی اجازت دی جائے۔ یہ

واشنگٹن کے لئے بڑی دردسری کا موجب ہوا کیونکہ ایران پر آئندہ کی امریکی پابندیوں کے لئے ایک معیار بن جاتا۔

بالآخر سیکیورٹی کا تقاضا تھا، وسط ایشیاء سے جنوبی ایشیاء تک پائپ لائنیں بچھائی جائیں۔ افغان میں خانہ جنگی کے ختم ہونے کا انتظار نہ کیا جائے۔ وسط ایشیائی جمہوریتوں کے لئے افغانستان کے سلسلے میں دو مسائل تھے۔ ایک خوف دوسرا موقعہ۔ افغانستان کے لئے اقوام متحدہ کے نمائندے لخدار براہیمی نے مجھے بتایا کہ ڈر یہ ہے کہ وسط ایشیاء کے نئے اور کمزور ملکوں نے محسوس کر لیا ہے کہ افغان کی خانہ جنگی ہمیشہ کے لئے اس کی سرحدوں کے اندر محدود نہیں رہ سکتی، یا تو ختم ہو جائے گی یا سرحدوں کے باہر وسط ایشیاء میں پھیلنے لگے گی۔ وہ کابل کی جانب سے کسی بھی مہم جوئی سے بچنا چاہتے تھے۔ یہ مہم جوئی چاہے اسلامی بنیاد پرستی کی شکل میں ہو، دہشت گردی یا منشیات کی صورت میں ہو، موقع یہ ہے کہ چاروں طرف سے خشکی میں گھرے ہونے کی وجہ سے ان کا روس پر جو انحصار ہے اسے ختم ہونا چاہیے۔ وہ گیس اور تیل کی پائپ لائنوں اور سڑکوں کے لئے جنوب کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ کابل میں ایک ایسی حکومت کے قیام کے حق میں ہیں جو ذمہ دار اور اچھی ہمسایہ ثابت ہو۔ وہ اپنی سرحدیں کھولنا چاہتے ہیں۔ انہیں بند نہیں رکھنا چاہتے۔

تیل کی قیمتوں میں کمی اور روس کی اقتصادی بربادی کے باوجود امریکہ اور روس کی باہمی چپقلش آئندہ کی پائپ لائنوں کے مقابلے پر ضرور اثر انداز ہوگی۔ روس، امریکہ کو وسطی اشیاء میں اپنے عقبی آنگن میں نہیں آنے دینا چاہتا۔ صدر بورس یلسٹن نے 1998ء میں کہا تھا کہ کیسپین کے تیل کے ذخائر کے بارے میں بعض مغربی ملکوں کے شور وشغب کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بعض روس کو کھیل سے باہر رکھنا اور اس کے مفادات کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ علاقے میں پائپ لائن پر نام نہاد جنگ اس کھیل کا حصہ ہے۔ روس افغانستان میں تصادام کو برقرار رکھ کر پورے علاقے کو غیر مستحکم رکھنا چاہتا

ہے۔ یوں اسے وسط ایشیائی جمہوریتوں میں فوج رکھنے کا جواز مل جاتا ہے۔

امریکہ اب امن و استحکام کے حق میں ہے۔ افغان جنگ کے جاری رہنے کے نتائج وسط ایشیاء سے متعلق خود اس کی اپنی پالیسیوں پر منفی اثرات مرتب کریں گے۔ وسط ایشیاء کے لیڈروں کو افغانستان اور تاجکستان کے عدم استحکام کا سامنا ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ ان کے اپنے ملکوں پر ایرانی اثرات ہوں گے یا پھر متشدد انتہا پسندی درپیش آئے گی۔ اس رائے کا اظہار امریکی محکمہ خارجہ کے خصوص مشیر سٹیفن سٹینووچ نے مارچ 1999ء میں کیا تھا۔ افغان خانہ جنگی کے خاتمے سے ہی وسط ایشیائی جمہوریتوں اور تیل کمپنیوں کو اعتماد حاصل ہو سکے گا اور وہ جنوبی ایشیاء تک پائپ لائنیں بچھانے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت کر سکیں گی۔ لیکن ایسا جلد ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

MashalBooks.org

<u>طالبان کا رومانی پیکر</u>

پائپ لائنوں کے لئے جنگ 1994-96ء

کارلوس بلگرونی کے توسط سے طالبان کا بیرونی دنیا کے اعلیٰ فنانس، تیل کی سیاست اور نئے سازشی کھیل سے رابطہ ہوا۔ کارلوس ارجن ٹائن کے رہنے والے ہیں۔ بریداس تیل کمپنی کے صدر ہیں، انہوں نے ترکمانستان کے تیل کے کنوؤں کا پاکستان اور ہندوستان سے رابطہ قائم کرنے کا سوچا اور کہا کہ اس طرح افغانستان میں امن کے قیام اور ہندوستان اور پاکستان میں صلح کے امکانات پیدا ہوں گے۔ امریکن اور برطانوی تیل کے بڑے صنعت کاروں کی طرح جنہوں نے صدی کے اوائل میں باور کرایا تھا کہ تیل کا کاروبار عالمی سیاسیات کی توسیع کا موجب ہوگا۔ بلگرونی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تیل کے کاروبار کو حکومتوں کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے کا حق ہونا چاہیے۔ 1995ء اور 1996ء کے درمیان اس نے جنوبی امریکہ میں اپنا کاروبار بند کیا اور افغانستان میں ایک جنگی سردار سے دوسرے جنگی سردار کے پاس اور پھر اسلام آباد، اشک آباد، ماسکو اور واشنگٹن کے چکر لگانے شروع کئے۔ وہ ان ملکوں کے لیڈروں کو باور کرانا چاہتے تھے کہ انہوں نے پائپ لائن کا جو منصوبہ تجویز کیا ہے۔ حقیقت پسندانہ اور قابل عمل ہے۔ ان کے آس پاس کے لوگ بھی ان کے ہم خیال تھے۔ وہ اس کی طرح خواب نہ بھی دیکھتے ہوں تو ان کی صلاحیت عمل کے ضرور قائل تھے۔

ان کا تعلق اطالوی خاندان سے ہے، جو ارجن ٹائن جا بسا تھا، وہ پرکشش، عالم، فلسفی اور صنعت پر حاوی شخص ہیں، وہ روس کے زوال، تیل کی صنعت اور اسلامی بنیاد پرستی پر

گھنٹوں گفتگو کر سکتے ہیں۔ ان کے باپ ایلیاندرو اینجل نے 1948ء میں ارجن ٹائن کی نئی آئیل انڈسٹری کے لئے سروس کے طور پر بریداس کے نام سے ایک چھوٹی سی کمپنی قائم کی۔ کارلوس اور ان کے بھائی باندرو بلگرونی نے جو بریداس کا وائس چیئر مین تھا، 1978ء میں اس کمپنی کو بین الاقوامی حیثیت دلائی۔ بریداس لاطینی امریکہ میں تیسری سب سے بڑی آزاد تیل اور گیس کمپنی بن گئی۔ لیکن ترکمانستان تک بریداس کا ایشیا میں کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ارجن ٹائین کے تیل کے صنعت کاروں کو کون سی شے نصف دنیا عبور کر کے افغانستان میں لے آئی تھی؟ سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد بریداس نے سب سے پہلے مغربی سائبیریا میں تیل کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنے کا حوصلہ کیا۔ لیکن وہاں پائپ لائنوں اور ٹیکسوں سے متعلق بڑے مسائل تھے، تاہم جب ترکمانستان بیرونی سرمایہ کاروں کے لئے کھلا تو ارجن ٹائین کے سرمایہ کار وہاں پہنچے۔ 1991ء میں بریداس نے ترکمانستان میں پٹے کے حصول کے لئے بولی دی، مغربی تیل کمپنیوں نے اسے ایک احمقانہ فیصلہ قرار دیا۔ ترکمانستان بہت دور تھا، چاروں طرف خشکی سے گھرا ہوا تھا اور اس نے بیرونی سرمایہ کاروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے کوئی قانون منظور یا نافذ نہیں کیا تھا، دوسری آئیل کمپنیاں ترکمانستان سے گریزاں رہیں، کیونکہ ان کے خیال میں یہاں صرف گیس ہے، جس کی کھپت کہاں ہو سکتی ہے؟ بلگرونی نے بتایا کہ گیس تلاش کرنا اور اسے سرحد پار پائپ لائنوں کے ذریعے لاطینی امریکہ کی مارکیٹوں میں پہنچانے کے سلسلے میں ہمیں جو تجربہ ہوا تھا، اس کی بنا پر ہم سمجھتے تھے کہ ترکمانستان کے سلسلے میں بھی اس تجربے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

صدر نیازدف بلگرونی کی توجہ اور دلچسپی سے بہت متاثر اور خوش ہوئے، کیونکہ کسی مغربی تیل کے صنعت کار نے ان کے دروازے پر دستک تک نہیں دی تھی۔ صدر نیازدف اور بلگرونی میں گہری دوستی ہو گئی، جنوری 1992ء میں بریداس کو مشرقی ترکمانستان میں افغانستان کی سرحد کے قریب اور روس کی دولت آباد گیس فیلڈ کے شمال

مشرق میں ہاشلر کے علاقے میں گیس اور تیل کی تلاش کا حق دے دیا گیا۔ ایک سال بعد فروری 1993ء میں بریداس کو ملک کے مغرب میں کیسپین کے قریب کیمپر بلاک پھر مل گیا۔ ترکمانستان میں سب سے پہلے اور واحد آنے والی کمپنی کی حیثیت سے بریداس کو یاشد میں 05۔50 کی شرح منافع کی بنیاد پر اور کیمپر میں 75 اور 25 کی شرح منافع پر گیس اور تیل کی تلاش کا حق دیا گیا۔ بلگرونی نے بتایا کہ ہم تیل اور گیس کے نئے ذخائر تلاش کرنا اور انہیں ترقی دینا چاہتے تھے تا کہ روس یہ اعتراض نہ کر سکے کہ اس نے جو ذخائر دریافت کئے تھے، ہم اسے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

بریداس نے تیل کی تلاش کے لئے 400 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی، ایک چھوٹی کمپنی کے لئے اس دور میں اتنی بھاری رقم صنعت میں لگانا بہت بڑی بات تھی۔ خاص طور پر جب بڑی آئیل کمپنیاں وسطی ایشیاء میں نہیں آئی تھیں۔ بریداس نے 1994ء میں اپنے کیمپر فیلڈ سے تیل برآمد کرنا شروع کیا، یہاں سے 16,800 بیرل تیل یومیہ نکل رہا تھا۔ جولائی 1995ء میں بریداس نے قراقرم کے صحرا میں یاشد کے مقام پر ایک بہت بڑی گیس فیلڈ دریافت کی، یہاں گیس کا معلومہ ذخیرہ 27 ٹریلین کیوبک فٹ کے قریب تھا۔ پاکستان کے گیس کے ذخیرے سے دوگنا بڑا، تیل کے برعکس گیس کی فوری فروخت کے لئے فوری منڈی درکار ہوتی ہے۔ بریداس کے گیس ٹرانسپورٹ مینجر ہوزے لوئیس سوریدا نے صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ سوریدا ایک بڑے قد کاٹھ کا مضبوط شخص ہے۔ آنے والے دنوں میں اسے ممکنہ راستوں کا سروے کرنا تھا۔ بلگرونی نے بتایا کہ یاشد کی دریافت کے بعد ہم گیس کا کچھ حصہ پرانی روسی پائپ لائنوں کے ذریعہ شمال کی طرف بھیجنا چاہتے تھے۔ دو ہی منزلیں تھیں، چین اور جنوبی ایشیاء۔ افغانستان کے راستے پائپ لائن بچھانے سے قیام امن کی صورت نکل سکتی تھی۔ یہ اگرچہ مشکل کام تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ نومبر 1994ء میں طالبان نے قندھار پر قبضہ کیا ہی تھا کہ بلگرونی نے نیازوف سے کہا کہ وہ افغانستان کے راستے پاکستان تک

MashalBooks.org

پائپ لائن بچھانے کے قابل عمل ہونے کا جائزہ لینے کے لئے ایک ورکنگ گروپ قائم کریں۔ چارہ ماہ بعد بلگرونی نے پاکستان کی وزیراعظم بےنظیر بھٹو کو صدر نیازدف سے تعاون کرنے کے لئے کہا۔ 16 مارچ 1995ء کو پاکستان اور ترکمانستان نے ایک معاہدے پر دستخط کئے، جس کی رو سے بریداس کو مجوزہ پائپ لائن کے قابل عمل ہونے کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے کی اجازت دی گئی۔ بےنظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری نے مجھے بتایا کہ اس پائپ لائن سے پاکستان کے کے لئے وسط ایشیا کا دروازہ کھل جائے گا اور بڑے روشن امکانات پیدا ہوں گے۔ زرداری کا کہنا تھا کہ پائپ لائن کے راستے پر طالبان کے کنٹرول کے سبب اس پائپ لائن کا بچھانا قابل عمل ہے۔ زرداری کی میز کے پیچھے مجوزہ پائپ لائن کے راستے کا ایک بڑا نقشہ لٹک رہا تھا۔

پاکستان کی فوج اور آئی ایس آئی طالبان کو قندھار اور ہرات کے راستے ترکمانستان تک ٹرانسپورٹ کے لئے راستہ کھولنے پر آمادہ کرنے لگے۔ پاکستان ساتھ ہی قطر اور ایران سے دو مختلف پائپ لائنوں کے ذریعے گیس کے حصول کے لئے گفت وشنید کر رہا تھا۔ لیکن جغرافیائی اور فوجی نقطہ نظر سے پاکستان کا افغانستان اور وسط ایشیاء سے جو مفاد وابستہ تھا۔ بریداس کی تجویز کے مطابق وہ زیادہ بہتر طور پر پورا ہوتا تھا۔

بریداس نے یاشلر فیلڈ سے جنوبی افغانستان کے راستے سوئی، بلوچستان تک 875 میل لمبی پائپ لائن بچھانے کی تجویز پیش کی۔ اس پائپ لائن کو ملتان کے راستے ہندوستان کی بڑی منڈی تک وسعت دی جاسکتی تھی۔ بریداس نے تجویز کیا کہ اس پائپ لائن میں دوسری کمپنیوں اور ملکوں کی گیس کی ترسیل کی بھی گنجائش رکھی جانی چاہیے۔ اس تجویز میں افغان جنگی سرداروں کے لئے خصوصی کشش تھی، کیونکہ افغانستان کے شمال میں گیس فیلڈ تھی، جہاں سے کبھی ازبکستان کو گیس فراہم کی جاتی رہی تھی، لیکن بعد میں اسے بند کر دیا گیا تھا۔ بلگرونی نے افغانستان جا کر جنگی سرداروں سے راہ و رسم پیدا کی، اس نے بتایا کہ وہ تمام افغان لیڈروں سے ملا۔ ہرات میں اسماعیل خان،

برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود کابل میں، دوستم مزار شریف میں اور طالبان قندھار میں بڑی اچھی طرح ملے۔ افغان جانتے تھے کہ ملک کی تعمیر کے لئے انہیں غیر ملکی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔

فروری 1996ء میں بلگرونی نے بے نظیر بھٹو اور نیازدف کو بتایا کہ افغان لیڈروں سے اس کے معاہدے ہو گئے ہیں اور انہوں نے پائپ لائن کے لئے راستے دینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ اسی مہینے بلگرونی نے صدر برہان الدین ربانی کی سربراہی میں افغان حکومت سے پائپ لائن کی تعمیر کا تیس سالہ معاہدہ کیا۔ یہ پائپ لائن بریداس اور ایک بین الاقوامی کنسورشیم نے مل کر تعمیر کرنا تھی۔ بریداس نے یونوکال سمیت دوسری تیل کمپنیوں سے بات چیت شروع کی۔ یونوکال امریکہ کی بارہویں سب سے بڑی تیل کمپنی ہے۔ اسے ایشیاء میں کام کا خاصا تجربہ ہے۔ 1976ء سے وہ پاکستان میں بھی کام کرتی آئی ہے۔ ترکمان افسروں نے 1995ء میں بریداس کی دعوت پر پہلی بار ہیوسٹن میں یونوکال سے مذاکرات کئے۔ یونوکال کے ایک وفد نے اشک آباد اور اسلام آباد کا دورہ کیا۔ مقصد پائپ لائن کی تعمیر کے لئے بریداس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے بارے میں گفت وشنید کرنا تھا۔

لیکن بریداس کو ترکمانستان میں کئی بڑے مسائل پیش آنے لگے۔ صدر نیازدف کو ان کے مشیروں نے قائل کر لیا کہ بریداس، ترکمانستان سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے، جس کے بعد ترکمانستان کی حکومت نے کیمیر آئیل فیلڈ سے تیل کی برآمد بند کر دی اور بریداس سے اپنے معاہدے پر پھر سے بات چیت کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ جنوری 1995ء میں بریداس نے اپنے منافع میں 10 فیصد کمی کرنے اور اسے 65 فیصد تک لے آنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ جب بریداس نے یاشلر میں گیس کے ذخائر دریافت کئے تو نیازدف کے مشیروں نے بریداس کی خوشیوں میں شرکت سے انکار کر دیا اور یاشد اور کیمیر کے معاہدوں پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا۔ نیازدف نے بریداس کو یاشد

آئیل فیلڈ کوترقی دینے سے روک دیا اورکیمیر سے اس کی برآمدات کی ممانعت کردی۔ اس دفعہ بریداس نے کہا کہ اس نے جو معاہدے کئے ہیں، وہ ان سے سرمو انحراف نہیں کرے گا۔ ترکمانستان کو بالآخر اس کی بات ماننا پڑی۔

نیازدف کمیونسٹ طرز کے آمر ہیں۔ انہیں بین الاقوامی قانون اور معاہدوں سے وابستہ مفاد کا کچھ خیال نہیں تھا۔ لیکن نیازدف کے لئے بریداس پرسختی کرنے کی کچھ اور وجوہ تھیں۔ یونوکال نے دولت آباد کی موجودہ گیس فیلڈ کی اساس پر اپنی پائپ لائن بچھانے اور اس کا تمام منافع ترکمانستان کے لئے مخصوص رکھنے کا اظہار کیا تھا۔ صدر نیازدف نے سوچا کہ یونوکال ایک بڑی امریکی کمپنی ہے اور کلنٹن انتظامیہ کو ترکمانستان کی ترقی میں دلچسپی لینے پرآمادہ کرسکتی ہے۔ نیازدف کو امریکہ کی امداد کی بڑی ضرورت تھی، اس کے لئے انہوں نے امریکی سفارتکاروں سے گفت وشنید شروع کی۔ امریکہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ترکمانستان کا تمام تر دارومدار ایران پر ہو جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ امریکہ نیازدف کی حمایت کرتا۔ صدر نیازدف اقوام متحدہ میں گئے تو انہوں نے بریداس اور یونوکال دونوں کو نیویارک بلایا۔ 21 اکتوبر 1995ء کو نیازدف نے بریداس کے منتظمین کے سامنے یونوکال اور اس کے حصہ دار سعودی عرب کی ملکیتی ڈیلٹا آئیل کمپنی کے ساتھ معاہدہ کیا، جس کے تحت یونوکال نے افغانستان کے راستے گیس کی پائپ لائن بچھانے کی ذمہ داری قبول کی۔ ''ہمیں اس پر بہت صدمہ ہوا اور جب صدر نیازدف سے شکایت کی تو انہوں نے منہ پھیر لیا اور بریداس سے کہا کہ تم متبادل پائپ لائن کیوں نہیں تعمیر کر لیتے؟'' جب معاہدہ طے پا رہا تھا تو امریکہ کے سابق وزیرخارجہ ہنری کیسنجر بھی موجود تھے، وہ اقوام متحدہ کے مشیر کے طور پر کام کررہے تھے، کیسنجر نے افغانستان میں سے دوسرا راستہ نکالنے کے بارے میں غور کرتے ہوئے کہا کہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ امید نے تجربے پرفتح پالی ہے۔ لیکن بریداس ہار ماننے والی نہیں تھی۔ نیا سازشی کھیل شروع ہو چکا تھا۔ بریداس کے مینجنگ ڈائریکٹر ماریولوپیز

اویسکی ریگل نے کہا کہ ہماری آئیل کمپنی ملک کے وسائل کو ترقی دینا چاہتی ہے لیکن ہم کسی اور کھیل میں الجھ گئے۔ جس میں بڑی طاقتیں ایک دوسرے کو گرانے میں لگی ہوئی ہیں۔

یونوکال دولت آباد سے جہاں 25 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کا ذخیرہ ہے۔ ملتان (پاکستان) تک پائپ لائن بچھانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یونوکال نے سینٹ گیس کنسوریشم تشکیل دیا، جس کے پاس 70 فیصد حصے تھے۔ ڈیلٹا کو 15 فیصد حصے دیئے گئے۔ روس کی ملکیتی کمپنی گازپروم کے 10 فیصد، ترکی کی اپنی کمپنی ترکی نوگیس کے پانچ فیصد حصے تھے۔ یونوکال نے ایک اور پرکشش معاہدے پر دستخط کئے۔ یونوکال کے وسط ایشیائی آئیل پائپ لائن پراجیکٹ کے تحت ترکمانستان میں چاردزمو سے پاکستان تک 1050 میل لمبی آئیل پائپ لائن بچھائی جانی تھی، اس کے ذریعے دس لاکھ بیرل تیل روزانہ صاف کیا جا سکتا تھا۔ سوویت دور کی موجودہ پائپ لائنیں روسی سائبیریا میں سوگٹ اور امسک سے قازقستان میں چمکنٹ اور ازبکستان میں بخارا تک، پھر وسطی ایشیاء سے کراچی کے ساحل تک تیل پہنچا سکتی ہیں۔ منصوبہ یہ ہے کہ موجودہ پائپ لائنوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور پورے علاقے کے تیل کو ساحل سمندر تک پہنچا دیا جائے۔ اس سے روس، قازقستان، ازبکستان اور ترکمانستان کو ایشیائی منڈیوں تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

شیورون کے روس اور قازقستان سے معاملات کے اعادے سے بچنے کے لئے یونوکال نے شروع سے ہی روس سے تعلق قائم کر رکھا تھا۔ اس سے روس کو تیل جنوب کی جانب سمندر تک پہنچانے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ ترکمانستان میں یونوکال کے مینجر ہنری ڈی لاروسا نے بتایا کہ روس سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں، اصل مشکل افغانستان سے ہے۔ ہر کوئی اپنے فائدے کی سوچتا ہے۔

کلنٹن انتظامیہ اور یونوکال کی ترکمانستان اور افغانستان میں اچانک دلچسپی لینا حادثاتی

نہیں تھا۔ 1991ء سے 1995ء کے درمیان واشنگٹن نے سوچ سمجھ کر قازقستان اور کرغیزستان کی حمایت شروع کی۔ اسے امید تھی کہ بیرونی جمہوریتیں بڑی تیزی سے نرم اقتصادی اور سیاسی پالیسی اپنائیں گی اور اس طرح امریکی کمپنیوں کے لئے یہاں سرمایہ کاری کرنا آسان ہو جائے گا۔ قازقستان کے پاس ابھی تک سوویت یونین کے چھوڑے ہوئے ایٹمی ہتھیار موجود ہیں، اس کے علاوہ اس کے پاس تیل اور گیس اور معدنیات کے وسیع ذخائر ہیں۔ صدر نور سلطان نذر بکے امریکہ کے صدر بش اور صدر کلنٹن سے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن 1995ء تک برزنیف کے متعلق یہ تاثر قائم ہو گیا تھا کہ وہ امور مملکت چلانے میں ناکام ہیں۔ ان کی انتظامیہ میں رشوت اور بدعنوانی عام ہے اور وہ خود روز بروز آمرانہ ہوتے جا رہے ہیں۔

قازقستان نے 1993ء تک اپنے ایٹمی ہتھیار روس کے سپرد کر دیئے تھے۔ اس کی آبادی کا چالیس فیصد نسلی اعتبار سے روسی تھا، جو کھلے عام حکومت کی مخالفت کرتا تھا۔ نذر کو روس کے اقتصادی مطالبات اور حفاظتی انتظام تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چار برس تک قازقستان روس کو یہ منوانے کی کوشش کرتا رہا کہ شیورون کو تنگیز کا تیل روسی پائپ لائنوں کے ذریعے یورپ تک پہنچانے کی اجازت دے دے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ شیورون نے 1991ء میں جو 5 بلین ڈالر کا سرمایہ لگانے کا وعدہ کیا تھا وہ ترک کر دیا۔ لیکن 1995ء میں وہ صرف 700 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کر سکا، وجہ اس سے روا کی جانے والی بدسلوکی تھی، جس سے بددل ہو کر اس نے اپنے موقف میں تبدیلی کر لی۔

امریکہ نے 1991ء-95ء کے عرصے میں تاجکستان کو نظر انداز کئے رکھا۔ اس جمہوریہ میں خانہ جنگی تھی۔ ازبکستان اور ترکمانستان پر آمروں کی حکومت تھی۔ امریکی محکمہ خارجہ کے نزدیک ان سے معاملہ فہمی ممکن نہ تھی۔ ماسکو کو ناراض کرنے اور وسطی ایشیاء میں اس کے مفادات کو چیلنج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ امریکہ کے ڈپٹی سیکرٹری خارجہ سٹروب ٹالبوٹ روس کو نیٹو میں شامل کرنے کے حق میں تھے، وہ روس کو

MashalBooks.org

پچھواڑے (وسطی ایشیائی جمہوریتوں) میں دخل اندازی کرنے اور یوں امریکہ اور روس کے تعلقات میں مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم جیسے جیسے روس افراتفری کا شکار ہوا، ٹالبوٹ کی روس نواز پالیسی پر امریکی محکمہ خارجہ کے اندر سے ہی سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔][واشنگٹن میں یہودی اور اسرائیلی لابی اور امریکی تیل کمپنیاں چاہتی تھیں کہ امریکہ روس کے بارے میں مختلف الجہتی خارجہ پالیسی اپنائے۔ ایسی پالیسی جو انہیں کیسپین کے وسائل سے استفادہ کرنے میں بھی مدد دے اور کیسپین کے علاقے کی ریاستوں کو روسی اثر سے آزادی حاصل کرنے میں معاون ہو۔ امریکی تیل کمپنیاں جنہوں نے اس علاقے میں امریکی اثر ونفوذ کا آغاز کیا تھا اب امریکہ کی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں زیادہ عمل دخل کی خواہشمند تھیں۔ 1995ء کے اوائل میں امریکی تیل کمپنیوں نے کیسپین کے علاقے میں اپنے مفادات کو بڑھاوا دینے کی خاطر ایک پرائیویٹ آئیل کمپنیوں کا گروپ بنایا، اس میں یونوکال شامل تھی۔ انہوں نے صدر بش اور صدر کارٹر کے دور کے سابق سیاستدانوں کی خدمات حاصل کرنے کا بھی عزم کیا تاکہ وہ امریکی انتظامیہ کے سامنے ان کا موقف موثر طور پر پیش کرسکیں۔ گروپ نے نیشنل سیکیورٹی کونسل میں انرجی ایکسپرٹ شیلا ہیسلین سے اور بعد ازاں 1995ء کے موسم گرما میں اس کے پاس اور نیشنل سیکیورٹی کونسل کے مشیر سیمول برجر سے ملاقات کی۔ برجر نے کیسپین کے بارے میں پالیسی بنانے کے لئے مختلف محکموں کے نمائندوں اور سی آئی اے پر مشتمل ایک کمپنی قائم کی، امریکہ اور امریکی تیل کمپنیوں کی کیسپین کے علاقے میں دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ اس کا اثر تھا کہ امریکہ نے روس کی حوصلہ شکنی کرنا شروع کر دی۔ اس کا فوری فائدہ ازبکستان اور ترکمانستان کو پہنچا۔ امریکہ نے صدر نیازدف کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کی کوشش ناکام بنادی۔

مارچ 1993ء میں صدر نیازدف نے امریکہ کی قومی سلامتی کی کونسل کے سابق مشیر الگزینڈر ہیگ کی خدمات حاصل کیں، اسے واشنگٹن میں امریکہ کو ترکمانستان میں سرمایہ

کاری اور ایران کے راستے پائپ لائن بچھانے کے حق میں قائل کرنے کی ذمہ داری سونپی، لیکن الگزینڈر بیگ کو ناکامی ہوئی اور نیازدف کی امریکی لیڈروں سے ملاقات کرنے کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ 1995ء تک امریکہ نے باور کرلیا کہ نیازدف سے فاصلہ برقرار رکھنے کی صورت میں اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کارنہیں ہوگا کہ وہ ایران پر بھروسہ کرنے لگے۔ ترکمانستان کی اقتصادی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی گیس فروخت کرنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔ امریکہ کے لئے افغانستان کے راستے گیس کی پائپ لائن بچھانے کے امکانات اس اعتبار سے بھی پسندیدہ تھے کہ ایک تو ایران سے بچ کر نکلا جا سکتا تھا، دوسرے ترکمانستان پاکستان اور طالبان کی حمایت کا اظہار کیا جا سکتا تھا اور روس اور ایران کو نیچا دکھایا جا سکتا تھا۔

امریکہ وسطی ایشیاء میں ازبکستان کے بغیر اپنے قدم نہیں جما سکتا۔ ازبکستان علاقے کی سب سے بڑی اور مضبوط ریاست ہے اور روس کے مدمقابل کھڑے ہونے کی اہلیت رکھتی ہے۔ امریکہ اور ازبکستان نے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک دوسرے سے ربط تعلق بڑھایا۔ صدر کریموف وسط ایشیاء کی نیٹو بٹالین بنانے سے متعلق ہنڈ کی تجویز کی حمایت کرنے لگے، جبکہ روس اس کا سخت مخالف تھا۔ ایک روسی سفارت کار نے 1997ء میں اشک آباد میں مجھ سے کہا کہ ہمیں نیٹو کا اپنے پچھواڑے آنا پسند نہیں۔ امریکہ کو جان لینا چاہیے کہ وسط ایشیاء روس کے دائرہ اثر میں رہے گا۔ امریکی کمپنیوں نے ازبکستان کے معدنی وسائل میں دلچسپی لینا شروع کر دی، ازبکستان اور امریکہ کے درمیان دوستی بڑھنے لگی۔ 1997ء 1995ء میں دونوں ملکوں کی تجارت میں آٹھ گنا اضافہ ہوگیا۔ صدر کریموف نے جون 1996ء میں واشنگٹن کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر شرین ہنٹر نے 1995ء کے اواخر میں لکھا تھا کہ مغرب اور خاص طور پر امریکہ نے ازبکستان کو روس کی اجارہ داری اور ایرانی اثر کے مدمقابل کے طور پر چن لیا ہے۔ علاقے میں دو متبادل طاقتیں بن رہی ہیں۔ امریکہ ازبکستان، ترکمانستان اور آذربائیجان کا ساتھ دے رہا تھا اور اپنے

اتحادیوں، اسرائیل، ترکی اور پاکستان کو ان کے ہاں سرمایہ کاری کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ روس، قازقستان، کرغیزستان اور تاجکستان پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ جیسے جیسے کیسپین کے علاقے کے وسائل کے حصول کی جنگ تیز ہو رہی تھی، امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ وسطی ایشیاء کے معاملات کی امریکی ماہر ڈاکٹر مارتھا برل آلکاٹ کا کہنا تھا کہ امریکہ کی پالیسی ساز روس کو اجارہ دار کے طور پر ابھرنا نہیں دیکھنا چاہتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ اجارہ داری اس صورت میں زیادہ مہنگی پڑ سکتی ہے کہ روس اپنی شرائط منوانا شروع کر دے اور دنیا کے تیل اور گیس کے آخری ذخائر تک مغرب کی رسائی روک دے۔ امریکہ کا برائے نام دخل بھی روس کے شبہات میں اضافے کا موجب ہوسکتا ہے۔

1996ء کے موسم گرما تک میں نے اس افشا ہوتی ہوئی حقیقت کے بارے میں تحقیق کرنے کا آغاز نہیں کیا تھا۔ ستمبر 1996ء میں کابل پر طالبان کے فوری قبضے نے دو سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی تحریک کی، کئی مغربی صحافی ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے سرکھپا رہے تھے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ کیا امریکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ یونوکال یا اپنے اتحادیوں پاکستان اور سعودی عرب کے ذریعے طالبان کی مدد کر رہا ہے؟ اور وہ کیا عوامل ہیں جو ایک طرف امریکہ، سعودی عرب، پاکستان اور طالبان کے درمیان اتنے وسیع پیمانے پر علاقائی گٹھ جوڑ کے فروغ کے محرک ہیں اور دوسری طرف ایران، روس، وسط ایشیائی ریاستوں اور طالبان مخالف اتحاد کو ایک صف میں کھڑا کرنے کا موجب ہیں؟ دوسری جانب بعض کے نزدیک افغان جہاد کے زمانے کے سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے تعلق کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے۔ اس سے مجھ پر عیاں ہوا کہ پائپ لائنوں کے بارے میں حکمت عملی امریکہ کی طالبان میں دلچسپی کی محرک ہے۔ اسی سے روس اور ایران کا جوابی ردعمل پیدا ہو رہا ہے۔ حقائق کا کھوج لگانے، ایسی بھول بھلیوں میں داخل ہونے کے مترادف ہے۔ جہاں کوئی بھی سچ نہیں کہتا

اور اپنے اصل مقاصد یا مفادات کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاتا۔ یہ کام صحافی کا نہیں جاسوس کے کرنے کا تھا، کیونکہ چند ہی اشارے تھے جن کے سہارے سچ کی تلاش کرنی تھی۔ کھیل کے حقیقی کھلاڑیوں تک رسائی حاصل کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ پالیسی پر عمل پیرا ہونے والے سیاست دان اور سفارت کار نہیں، بلکہ رازداری برتنے والی تیل کمپنیاں اور علاقے کی ریاستوں کی انٹیلی جینس سروسز تھیں۔ تیل کمپنیاں سب سے زیادہ اخفا برتتی تھیں، عالمی سطح پر انہیں جس شدید نوعیت کے مقابلہ میں اترنا پڑتا ہے۔ رازداری کا تقاضا ہے۔ وہ آئندہ کہاں تیل اور گیس کی تلاش کے لئے کنواں کھودیں گی۔ پائپ لائنوں کو کس راستے گزارنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے ایک گھنٹے پہلے کس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا تھا؟ وہ یہ سب کچھ صیغہ راز میں رکھیں گی کیونکہ وہ نہیں چاہیں گی کہ ان کے دشمن یعنی مخالف کمپنیاں ان کے ارادوں اور مقاصد کے بارے میں کچھ بھی جان سکیں۔

بریداس کے منتظمین نے کبھی اخبارات سے بات نہیں کی۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ بیان جاری کرنے ہی کو کافی سمجھا۔ وہ بھی لندن کی ایک لائق اعتماد تعلقات عامہ کی کمپنی کے ذریعے یونوکال سے با آسانی رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے بڑے افسر اس طرح کے جواب دیتے جس سے کچھ بھی پلے نہ پڑتا۔ البتہ دونوں کمپنیوں (یونوکال اور بریداس) میں واضح فرق تھا کہ طالبان سے ان کے آئندہ کے تعلقات پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ بریداس ایک چھوٹے سے خاندان کی کمپنی ہے، جس کے منتظمین کی یورپی روایت کے مطابق پرورش ہوئی ہے۔ انہیں سیاست، ثقافت، تاریخ اور جن افراد سے ان کا معاملہ ہو، ان سے ذاتی تعلقات قائم کرنے میں دلچسپی ہے۔ اس کے منتظمین کھیل کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے، وہ جن لیڈروں سے ملتے، ان کی نسلی قبائلی اور خاندانی تعلقات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ضرور تکلف کرتے۔

یونوکال ایک بہت بڑی کارپوریشن ہے جو دنیا میں تیل کا کاروبار چلانے کے لئے اعلیٰ

MashalBooks.org

عہدیدار تنخواہ پر رکھتی ہے۔ جن افسروں کو علاقے میں بھیجا گیا دو چار کو چھوڑ کر ان کی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز رہتی، وہ علاقے اور اردگرد کی سیاست میں کوئی دلچسپی نہ لیتے، جبکہ بریداس کے انجینئر صحرا میں افغان قبائلیوں کے ساتھ چائے پیتے اور گھنٹوں گفتگو کرتے اور ساتھ کے ساتھ ان راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے، جہاں سے پائپ لائنیں گزارنا مقصود ہوتا۔ یونوکال کے افسر طیاروں پر آتے اور چلے جاتے، جنگی سردار انہیں جو جھوٹ سچ بتاتے وہ اس پر اکتفا کر لیتے۔ افغانوں نے لوگوں سے گفتگو کے فن میں عبارت حاصل کر رکھی ہے، جس کے مطابق وہ وہی کچھ کہیں گے، جو سامع سننا پسند کرے گا، دوسرے مہمان سے وہ اس کے بالکل الٹ باتیں کریں گے۔ یونوکال کا ایک نقصان یہ تھا کہ وہ طالبان کے بارے میں جو پالیسی بھی بناتے، امریکہ کی پالیسی سے ہم آہنگ ہوتی۔ اسی بنا پر وہ طالبان کو لیکچر دیتے رہتے کہ انہیں کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ بریداس کو اس طرح کی کوئی عادت نہیں تھی، وہ اس سے قطع نظر کہ طالبان کی حکومت جائز ہے یا نہیں، ان سے معاہدہ کر لیتے۔

یونوکال معلومات حاصل کرنے کے لئے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے اور پاکستانی اور ترکمانستان کی انٹیلی جینس پر انحصار کرتی، اپنے طور پر معلومات کی فراہمی کا تکلف نہ کرتی۔ جب بریداس اور یونوکال کے باہمی اختلاف اور نئے عظیم کھیل کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں میری خبریں اور تبصرے شائع ہوئے تو دونوں کمپنیوں نے پہلے یہ سوچا کہ میں شاید جاسوس ہوں، جو خفیہ طور پر دوسری کمپنی کے لئے کام کر رہا ہوں۔ یونوکال اسی خیال میں رہی، البتہ بریداس نے باور کر لیا کہ میں حقائق کا متلاشی صحافی ہوں، جو طویل عرصے سے افغانستان کے احوال کے بارے میں لکھتا آ رہا ہے اور جو اوپری نوعیت کے بیانوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں رکھتا۔ میں نے سات ماہ تک سفر کرنے، ایک سو سے زیادہ انٹرویو لینے، تیل کے کاروبار کے بارے میں لٹریچر پڑھنے (کہ اس سے پہلے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا) کے بعد بالآخر فار ایسٹرن اکنامک ریویو

کے لئے کور سٹوری لکھی، جو اپریل 1997ء میں شائع ہوئی۔

جولائی 1997ء میں سٹروب ٹالبوٹ نے ایک تقریر کی جو علاقے کے سلسلے میں امریکہ کی پالیسی کی بنیاد بنی، انہوں نے کہا کہ وسطی ایشیاء اور کاکس میں عظیم کھیل کے دوبارہ کھیلے جانے کے بارے میں دعوے اور پیشین گوئیاں کرنا فیشن سا بن گیا ہے۔ علاقے کی سیاسی صورت حال کا محرک تیل تھا، بڑی طاقتوں کے درمیان مقابلے اور مسابقے کا سبب بنتا تھا۔ ہمارا مقصد اس کے مضمرات سے بچنا، اس کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔ رڈیارڈ کپلنگ اور جارج میکڈانلڈ کی کتابوں کو بک شیلف کی زینت بنے رہنا دینا چاہیے۔ عظیم گیم جو کپلنگ کے کم اور فریزر کے فلیش مین نے دیکھی، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن ٹالبوٹ جانتے تھے کہ گیم شروع ہو چکی ہے۔ انہوں نے اس میں حصہ لینے والوں کو بڑی سنجیدگی سے انتباہ کیا اور اعلان کیا کہ امریکہ کی اولین ترجیح اختلاف اور تصادم کو ختم کرانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اندرونی اور سرحدوں کے آر پار تصادم جاری رہا اور بڑھتا رہا تو یہ علاقہ دہشت گردی، مذہبی اور سیاسی انتہا پسندی کی کھیتی بن جائے گا، جو آخر کار میدان جنگ میں بدل جائے گا۔

جہاں تک زمینی حقائق کا تعلق ہے، صدر نیازدف کے یونوکال سے معاہدے پر بلگرانی سخت چیں بجبیں ہوئے۔ فروری 1996ء میں انہوں نے عدالتوں کا رخ کیا، یونوکال اور ڈیلٹا کے خلاف ہوسٹن کے قریب فورٹ بینڈ کاؤنٹی میں دعویٰ دائر کر دیا۔ بریداس نے اپنے کاروباری تعلقات میں مداخلت کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کو بنیاد بناتے ہوئے 15 بلین ڈالر جانے کا مطالبہ کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ یونوکال کے وائس پریزیڈنٹ مارٹل اور دوسرے بریداس کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ بریداس نے اپنے مقدمے میں بتایا کہ اس نے ملر کو پائپ لائن کی تعمیر اور اسے استعمال میں لانے سے متعلق تفصیل سے بتایا تھا۔ بریداس نے یونوکال کو مجوزہ پائپ لائن کے بارے میں مشترکہ مساعی شرکت کی بھی دعوت دی، قصہ مختصر یہ کہ بریداس نے یونوکال پر

اس کا منصوبہ چرانے کا الزام لگایا۔ بعد میں بریداس نے بتایا کہ اس نے کیا محسوس کیا تھا۔ یونوکال اس علاقے میں تب آئی، جب ہم نے آنے کی دعوت دی تھی۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ یونوکال اور ہمارے درمیان مفاہمت نہ ہوتی اور ہم اکٹھا نہ ہو سکتے، اس نے مجھے بتایا کہ ہم نے یونوکال کو بلایا اور ساتھ لے کر ترکمانستان گئے، شروع میں امریکہ نے اس پائپ لائن سے متعلق تجویز کو مضحکہ خیز کہا اور اس سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا، وہ افغانستان یا ترکمانستان دونوں سے لاتعلق رہنا چاہتے تھے۔ بریداس نے بھی ترکمانستان پر یا شائد کیمیر آئیل فیلڈز کی نا کہ بندی اور تین معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگایا اور بین الاقوامی ایوان تجارت میں یہ معاملہ اٹھایا۔

یونوکال کا موقف تھا کہ اس کی تجویز مختلف تھی، وہ دولت آباد کے تیل کے ذخائر سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں یونوکال کے صدر جان ایملے نے عدالت میں ایک خط پیش کیا جو انہوں نے بلگرونی کو لکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ترکمانستان نے انہیں بتایا تھا کہ حکومت نے بریداس سے کوئی معاہدہ نہیں کیا، اس لئے یونوکال جو کچھ کرنا چاہے کر سکتا ہے، اسے آزادی ہے۔ ہم نے کہا کہ سینٹ گیس منصوبہ علیحدہ اور بریداس کے منصوبے سے یکسر جداگانہ ہے۔ ہم قدرتی گیس کے موجودہ ذخائر سے گیس خرید کر پائپ لائن کے ذریعے برآمد کرنا چاہتے ہیں۔ بریداس، اپنی گیس یاشر فیلڈ سے لے کر بھجوانا چاہتے تھے۔ سینٹ گیس منصوبہ بریداس کو پائپ لائن بچھانے، گیس برآمد کرنے اور فروخت کرنے سے نہیں روکتا۔

کلنٹن انتظامیہ نے یونوکال کے حق میں وزن ڈالنا شروع کر دیا۔ مارچ 1996ء میں پاکستان میں امریکہ کے سفیر ٹام سمنز نے وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے اس بات پر بڑی لے دے کی کہ پاکستان کو بریداس کی بجائے یونوکال کی حمایت کرنی چاہیے، بے نظیر بھٹو نے بریداس کی حمایت کی اور سمنز نے ان پر بریداس سے فوائد حاصل کرنے کا الزام لگایا، اس پر بے نظیر بھٹو نے سمنز سے خاصی تلخ کلامی کی۔ اس موقعہ پر موجود ایک افسر

نے بتایا کہ بھٹو نے سمنز سے تحریری معافی نامے کا مطالبہ کیا، جو انہوں نے حاصل کر لیا۔ اپریل اور اگست 1996ء میں سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنوبی ایشیاء رابن رافیل نے یکے بعد دیگرے پاکستان اور افغانستان کے دو دورے کئے اور یونوکال کے حق میں بات کی۔ 21 اپریل 1996ء کو رافیل نے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ امریکی کمپنی ترکمانستان سے پاکستان تک پائپ لائن تعمیر کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ پائپ لائن کا یہ پراجیکٹ ترکمانستان، پاکستان اور افغانستان کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اس سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے اور افغانستان کو ایندھن حاصل ہوگا۔ اگست میں رافیل نے وسطی ایشیاء کی جمہوریتوں کے دارالحکومتوں اور ماسکو کا دورہ کیا۔ جہاں انہوں نے اپنا پیغام پہنچایا۔ امریکہ کی یونوکال کی کھلم کھلا حمایت نے روس اور ایران کے شکوک میں اضافہ کر دیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ سی آئی اے طالبان کی حمایت کر رہی ہے۔ دسمبر 1996ء میں ایک سینئر ایرانی سفارت کار نے مجھے بتایا کہ سعودی اور سی آئی اے نے طالبان کو دو ملین ڈالر پہنچائے ہیں۔ اگرچہ اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ امریکہ اور یونوکال نے کئی گھپلے کئے، جن کی بنا پر الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ چل نکلا۔

جب طالبان نے ستمبر 1996ء میں کابل پر قبضہ کیا تو یونوکال کے ایک افسر کرس ٹیگرٹ نے خبر رساں ایجنسیوں کو بتایا کہ ان کا پائپ لائن پراجیکٹ اب آسانی سے زیر عمل آ سکتا ہے، لیکن انہوں نے بڑی تیزی سے یہ بیان واپس لے لیا، کیونکہ اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ یونوکال، طالبان کی فتح کے حق میں ہے، چند ہفتے پہلے یونوکال نے اعلان کیا تھا کہ اگر جنگی سرداروں نے ایک مشترکہ کونسل قائم کر کے پائپ لائن پراجیکٹ کی نگرانی کرنا تسلیم کر لیا تو انہیں ان کی بنیاد پر مالی امداد میں بونس دیا جائے گا۔ اس کا بھی یہی مطلب لیا گیا کہ یونوکال جنگی سرداروں کو سرمایہ فراہم کرنا چاہتی ہے۔
کابل پر طالبان کا قبضہ ہونے کے بعد چند گھنٹے کے اندر امریکی محکمہ خارجہ نے اعلان

MashalBooks.org

کیا کہ وہ ایک افسر کابل بھیجے گا اور طالبان سے سفارتی تعلقات قائم کرلے گا۔ یہ بیان بھی جلد ہی واپس لے لیا گیا۔ محکمہ خارجہ کے ترجمان گلین ڈیوس نے کہا کہ طالبان اسلامی قوانین نافذ کرتے ہیں تو امریکہ کو اس میں کوئی قابل اعتراض بات دکھائی نہیں دیتی۔ اس نے طالبان کو مغرب دشمن نہیں بلکہ جدیدت کے خلاف قرار دیا۔ سینٹر ہینک براؤن نے کہا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا اچھا پہلو یہ ہے کہ ایک گروہ بالآخر افغانستان میں ایک حکومت قائم کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔ ہینک براؤن یونوکال کے پائپ لائن بچھانے کے منصوبے کے پرجوش حامی ہیں۔ امریکی سفارت کاروں نے خفیف ہوتے ہوئے مجھے بتایا کہ امریکہ کی طرف سے جلد بازی سے جاری ہونے والے بیان پر اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ لیکن جو نقصان ہونا تھا ہوگیا۔ یونوکال کی آئیں بائیں شائیں اور امریکی دفتر خارجہ کے کنفیوژن نے ایران، روس، وسط ایشیائی جمہوریتوں، طالبان مخالف اتحاد اور اکثر پاکستانیوں اور افغانوں کو مزید یقین دلا دیا کہ امریکہ اور یونوکال ایک دوسرے کے حصے دار ہیں۔ طالبان کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور طالبان کی مکمل اور ہمہ جہت فتح کے حامی اور طالب ہیں اور یہ سب کچھ ایسے میں ہو رہا ہے کہ امریکہ اور یونوکال کا دعویٰ ہے کہ افغانستان میں ان کا کوئی پسندیدہ عنصر نہیں۔ بعض پاکستانی وزراء نے بے تابی سے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ امریکہ طالبان کی حمایت اور پاکستان کے موقف کی تائید کرتا ہے۔ پاکستانی صحافیوں کو بتایا کہ واشنگٹن طالبان کا حامی ہے۔ (پورا علاقہ افواہوں اور قیاس آرائیوں کی گرفت میں تھا۔ غیر جانبدار خبر رساں ایجنسیاں بھی شکوک وشبہات کا اظہار کرنے لگیں۔ رائٹر نے لکھا ہے کہ یقیناً طالبان امریکہ کی پالیسی کے عین مطابق کام کر رہے ہیں، یہ کہ ایران کی سرحد پر ایک سنی علاقہ قائم کر کے ایران کو الگ تھلگ کر دیا جائے۔ دوسرے تجارتی راستوں اور پائپ لائنوں کے لئے لائق اعتماد تحفظ حاصل کر لیا جائے اور یوں وسطی ایشیاء کے جنوبی تجارتی راستوں پر ایران کی اجارہ داری ختم کر دی جائے۔

بریداس کو اپنے لئے اس یقین کا حصول بے حد دشوار تھا کہ وہ ابھی تک مقابلے میں شریک ہے۔ ترکمانستان میں اس کی آئیل فیلڈز اور گیس محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کا ترکمانستان سے ایسا کوئی معاہدہ نہیں تھا کہ وہ پائپ لائن کے لئے گیس خرید لے گا، نہ ہی پاکستان کے ساتھ یہ طے تھا کہ وہ اس کی گیس خرید لے گا۔ امریکہ اور پاکستان کی حمایت حاصل ہونے کے بعد یونوکال طالبان سے محبت کی پینگیں بڑھانے لگی۔ بریداس کے اشک آباد اور کابل میں دفاتر موجود تھے، اس کے باوجود کہ صدر نیازدف انہیں نکال باہر کرنے کی کوشش میں تھے، وہ جمے رہے۔ ترکمانستان کے تیل، گیس کے وزیر نے کہا تھا کہ بریداس کا اب ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے افغان پائپ لائن بچھانے کا کام یونوکال کو سونپ دیا ہے۔ ہماری حکومت کا بریداس کے ساتھ کوئی کام نہیں۔

بریداس کو طالبان سے ایک فائدہ تھا۔ اس نے انہیں بتایا تھا کہ وہ قرضہ دینے والے بین الاقوامی اداروں کے ذریعے پائپ لائن بچھانے کے منصوبے کے لئے سرمایہ حاصل نہیں کریں گے، کیونکہ اس صورت میں یہ ادارے مطالبہ کرتے کہ افغانستان میں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حکومت کے قیام کے بعد بھی اس کو قرضے دیئے جا سکتے ہیں۔ اس کی بجائے بریداس نے سعودی کمپنی نِنگار سے نصف نصف منافع کی بنیاد پر قرضے کی فراہمی اور پائپ لائن کے منصوبے کی تکمیل کا معاہدہ کر لیا ہے۔ سعودی کمپنی کے سعودی شہزادے گرکی سے، جو سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ ہیں، بڑے گہرے روابط ہیں۔ بریداس کو یقین ہے کہ افغانستان کے حصے کی پائپ لائن بچھانے کے لئے وہ سعودی سرمائے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ باقی کا سرمایہ ایک بین الاقوامی کنسورشیم سے حاصل ہوگا، جو پاکستان، ترکمانستان کے حصے کی پائپ لائنیں تعمیر کرے گا، یہ لائنیں محفوظ ہوں گی۔ بریداس کے ایک افسر نے کہا کہ ہم ترکمانستان کی حکومت سے معاملات کو الگ اور پائپ لائن بچھانے سے متعلق افغان معاہدے کو الگ رکھیں گے۔ ہم دو کنسورشیم بنائیں گے۔ ایک افغان لائن بنائے گا، دوسرا پاکستان اور

ترکمانستان کی طرف کی لائن بچھائے گا۔ اس طرح بریداس نے پیشگی شرائط کے بغیر پائپ لائن بچھانے کا کام فوری طور پر شروع کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ افغان گروہوں میں باہم معاہدہ ہو جائے لیکن اگر یہ نہ بھی ہو تو بھی کام شروع کیا جا سکتا ہے۔

دوسری جانب یونوکال کا افغانستان سے متعلق امریکہ کی پالیسی سے گہرا ربط تھا، وہ یہ کہ جب تک کابل میں تسلیم شدہ حکومت نہیں بن جاتی، تا کہ عالمی بینک اور دوسرے اداروں سے منصوبے کے لئے سرمایہ حاصل کرنا آسان ہو جائے اس وقت تک یونوکال نہ تو پائپ لائن تعمیر کرے گی اور نہ ہی طالبان سے کاروباری شرائط پر بات چیت کرے گی۔ جان ایملی نے بتایا کہ ہم نے شروع میں بھی واضح کر دیا تھا کہ منصوبے کے لئے سرمایہ حاصل کرنا خاصا مشکل ہے۔ اس لئے افغان دھڑوں کو اکٹھا ہو کر ایک ایسی حکومت قائم کرنا ہوگی، جسے قرضہ دینے والے ادارے تسلیم کرتے ہوں۔ اسی صورت میں منصوبے کی بنا پر امریکہ کے طالبان کو تسلیم کرنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ طالبان شدت سے اپنے آپ کو تسلیم کرائے جانے کے طلبگار ہیں۔

دونوں بریداس اور یونوکال طالبان پر اثر رکھنے والی علاقائی طاقتوں خاص طور پر سعودیوں سے تعلق قائم کرنے کی کوشش میں تھے۔ بریداس نے طالبان سے گفت وشنید کے لئے شہزادہ ترکی سے گہرے تعلقات قائم کئے۔ بلگرانی کا کہنا تھا کہ سعودی عرب افغان جہاد میں کئی برسوں سے حصہ لیتا رہا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ پائپ لائن تعمیر ہونے سے قیام امن میں مدد مل سکتی ہے۔ یونوکال نے بھی پیچھے رہ جانے سے بچنے کے لئے سعودی عرب سے تعلقات قائم کر لئے۔ ڈیلٹا آئیل کے صدر بدرالبیان، سعودی شاہی خاندان، خاص طور پر ولی عہد شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز کے بہت قریب ہیں۔ بدر کے بھائی ساعدالبیان، شاہ فہد کے درباری ہیں۔ یونوکال اور بریداس کے درمیان مقابلہ سعودی شاہی خاندان کے اندر مقابلے کا غماز تھا۔

امریکہ اور یونوکال نے پاکستان کو ساتھ ملا لیا۔ 1996ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے بعد نئے منتخب وزیراعظم نواز شریف اور ان کے تیل کے وزیر چوہدری نثار علی خان اور فوج اور آئی ایس آئی یونوکال کے پرزور حامی تھے۔ پاکستان طالبان کے لئے امریکہ کی براہ راست مدد چاہتا تھا۔ اس نے یونوکال سے پائپ لائن کی فوری تعمیر شروع کرنے کے لئے کہا تھا کہ طالبان کو قانونی حیثیت حاصل ہو سکے اور امریکہ کے لئے انہیں تسلیم کرنے میں آسانی ہو جائے۔ بنیادی طور پر امریکہ اور یونوکال، آئی ایس آئی کے تجزیے اور مقصد سے متفق تھے کہ افغانستان میں طالبان کی فتح سے یونوکال کا کام اور امریکہ کی جانب سے طالبان کو تسلیم کرنا آسان ہو جائے گا۔

پاکستان جہاں امریکہ کے طالبان کو تسلیم کئے جانے کا خواہشمند تھا، وہاں سے گیس کی فراہمی کے لئے وسائل کی بڑی ضرورت تھی۔ پاکستان اپنی ایندھن کی 31 فیصد ضرورت گیس سے پوری کر رہا ہے۔ گیس کا سب سے بڑا ذخیرہ بلوچستان میں سوئی کے مقام پر ہے۔ یہاں گیس بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان میں گیس کے معلوم ذخائر 22 ٹریلین کیوبک فیٹ ہیں۔ ہر سال 0ء7 ٹریلین کیوبک فیٹ گیس خرچ ہو رہی ہے۔ اسی طرح 0ء7 ٹریلین کیوبک فیٹ کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ 2010 تک پاکستان کو سالانہ 0ء8 ٹریلین کیوبک فیٹ گیس کی کمی کا سامنا ہوگا۔ پاکستان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایران سے ایک، اور قطر سے دوسری پائپ لائن بچھائے جانے کی ضرورت ہے، لیکن سرمائے کی کمی حائل ہے۔ پاکستان کو سستے تیل کے حصول کی بھی ضرورت ہے۔ 1966ء میں اس نے تیل درآمد کرنے پر 2 بلین ڈالر خرچ کئے، جو اس کی درآمدات کے 20 فیصد کے لگ بھگ تھے۔ پاکستان میں تیل کی اپنی پیداوار 1990ء کے عشرے کے اوائل میں 70 ہزار بیرل یومیہ تھی۔ 1997ء میں جو کم ہو کر 58 ہزار بیرل رہ گئی۔ یونوکال کی مجوزہ پائپ لائن سے نہ صرف پاکستان کو گیس اور تیل ملے گا بلکہ وہ وسطی ایشیاء کے تیل کی ایشیائی منڈیوں میں برآمد کا ایک بہت بڑا مرکز بھی

بن سکے گا۔

صدر نیازدف بھی چاہتے تھے کہ یونوکال پائپ لائن تعمیر کرنے کا کام فوری طور پر شروع کر دے، انہوں نے پاکستان سے کہا کہ وہ طالبان پر زور دے کہ وہ یونوکال کی تجویز مان لیں۔ نیازدف کو امریکہ کے صاحب سلامت سے فوائد حاصل ہونے شروع ہو گئے۔ جنوری 1997ء میں ترکمانستان نے امریکہ کی ایک بڑی تیل کمپنی موبل اور برطانیہ کی کمپنی مانومینٹ آئیل سے معاہدے کر لئے اور اس طرح انہیں ترکمانستان کے مغرب میں وسیع علاقے میں تیل اور گیس کے لئے ذخائر تلاش اور دریافت کرنے کا حق دے دیا۔ نومبر 1996ء میں بریداس نے بتایا کہ اس نے پائپ لائنیں تعمیر کرنے کے لئے طالبان اور جنرل دوستم سے معاہدہ کر لیا ہے، جہاں تک برہان الدین ربانی کا تعلق ہے وہ پہلے ہی رضامند ہو چکے تھے۔ اس سے یونوکال اور پاکستان دونوں کو تشویش ہوئی۔ 9 دسمبر 1996ء کو پاکستان کے سیکرٹری خارجہ نجم الدین شیخ قندھار میں ملا عمر سے ملے اور انہیں یونوکال کی تجویز مان لینے پر راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن ملا عمر نے کوئی پکا وعدہ نہ کیا۔ روایتی افغان طریقے سے طالبان نے اپنے پتے شاطرانہ انداز میں چلے، انہوں نے کوئی وعدہ نہیں کیا اور دامن بچائے رکھا۔ اس طرح یونوکال اور بریداس کو اپنی اپنی بولی بڑھانے پر مجبور کر دیا۔ طالبان کو صرف پائپ لائن کا کرایہ وصول کرنے سے دلچسپی نہیں تھی جو 100 ملین ڈالر سالانہ ہو سکتا تھا بلکہ وہ آئیل کمپنیوں سے افغانستان میں سڑکیں، واٹر سپلائی، ٹیلی فون لائنیں اور بجلی کی تار بچھانے میں مدد لینا چاہتے تھے۔

طالبان کے کئی لیڈروں نے نجی طور پر کہا کہ وہ بریداس کو ترجیح دیتے ہیں، اس لئے کہ بریداس نے ان سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جبکہ یونوکال زور دے رہی ہے کہ طالبان انسانی حقوق سے متعلق اپنا رویہ بہتر بنائیں اور طالبان مخالف اتحاد سے گفت وشنید شروع کر دیں۔ دونوں باتیں امریکی پالیسی کا حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ یونوکال کو امریکہ میں خواتین کی تحریک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جس کا مطالبہ ہے کہ امریکہ اور یونوکال

طالبان سے مذاکرات کرنا چھوڑ دیں۔ اقوام متحدہ کا بھی رویہ سخت تھا۔ انسانی امور و معاملات کے لئے اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری جنرل یاسوش اکاشی نے مجھے بتایا کہ افغانستان سے تمام بیرونی دخل اندازی کسی نہ کسی طرح تیل اور گیس کی پائپ لائنوں سے متعلق کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ڈر یہ ہے کہ یہ کمپنیاں اور علاقائی طاقتیں طالبان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہیں۔

دونوں تیل کمپنیوں کا اصرار ہے کہ ان کی پائپ لائن امن لانے کا وسیلہ ہوگی، لیکن کوئی مغربی بینک ایک ایسے ملک میں پائپ لائن بچھانے کے لئے سرمایہ فراہم نہیں کرے گا، جہاں خانہ جنگی ہو رہی ہو۔ رابرٹ ایبل نے کہا کہ پائپ لائنوں کی سیاست میں حصہ لینے والوں کو باور کرنا چاہیے کہ امن کی صورت میں ہی پائپ لائن بچھائی جا سکتی ہے۔ پائپ لائن کے ذریعہ امن نہیں بنایا جا سکتا۔ عظیم کھیل نے ایک نئی جہت اختیار کر لی ہے۔

MashalBooks.org

طالبان کا رومانی تصور

پائپ لائنوں کے لئے جنگ اور امریکہ اور طالبان 1997ـ99ء

ارجن ٹائن کے دارالحکومت بیونس آئیرس میں بریداس کے صدر دفتر میں طالبان کے ایک وفد کی آمد متوقع تھی۔ اس کے احترام میں دفتر کی خاتون سیکرٹریوں سے کہا گیا ہے کہ وہ منی سکرٹوں کی جگہ لمبے پاجامے اور لمبے بازوؤں والے بلاؤز پہنیں۔ اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھیں۔ وفد کے ارکان فروری 1997ء کو جب صدر دفتر پہنچے تو بریداس نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ انہیں سیر کرائی گئی اور پھر انہیں بریداس کے تیل کے کنوؤں کی کھدائی اور گیس کی پائپ لائنیں دکھانے لے جایا گیا۔ انہیں براعظم کا جنوبی برف پوش علاقہ بھی دکھایا گیا۔ عین اسی وقت طالبان کا ایک دوسرا وفد ایک مختلف قسم کے ثقافتی صدمے سے دوچار تھا۔ یہ وفد واشنگٹن میں تھا، جہاں اس نے محکمہ خارجہ کے افسروں سے ملاقات کی۔ یونوکال کے منتظمین سے تبادلہ خیال کیا اور طالبان کے تسلیم کئے جانے کے لئے زور دیا۔ واپسی پر دونوں وفود، سعودی عرب میں ٹھہرے۔ مکہ معظّمہ گئے اور سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ شہزادہ سے ملاقات کی۔ طالبان نے بتایا کہ انہوں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ وہ کس کمپنی کی پیش کش قبول کریں گے۔ وہ بہت جلد سیکھ گئے تھے کہ انہیں یہ عظیم کھیل کس زاویے سے کھیلنا ہے۔

دونوں کمپنیوں نے طالبان کے دل جیتنے کے لئے اپنی کوشش تیز تر کر دیں۔ 1997ء میں بریداس کی اس وقت بڑی حوصلہ افزائی ہوئی جب بین الاقوامی ایوان تجارت نے

MashalBooks.org

ایک عبوری عدالتی حکم جاری کیا، جس میں ترکمانستان سے کہا گیا تھا کہ وہ بریداس کو کیمیر آئیل فیلڈ سے تیل برآمد کرنے کی اجازت دے دے۔ لیکن صدر نیازدف نے اس فیصلے کو نظرانداز کر دیا اور بریداس سے مصالحت کرنے سے انکار کر دیا۔ مارچ 1997ء میں بریداس نے کابل میں دفتر کھول لیا اور بلگرونی طالبان کے لیڈروں سے ملنے پہنچے۔ بریداس نے طالبان سے معاہدہ کرنے کے لئے بات چیت شروع کر دی۔ بریداس کے تین افسروں کو بارہ طالبان ملاؤں سے ہفتوں گفت وشنید کرنا پڑی، تب کہیں جا کر 150 صفحات پر مشتمل معاہدہ طے پایا۔ طالبان کے وفد میں صرف ایک انجینئرنگ گریجویٹ تھا، جسے انجینئرنگ کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ طالبان کے پاس تیل اور گیس کا کوئی ماہر نہیں تھا۔ انگریزی بولنے والے بھی چند ایک ہی تھے۔ معاہدے کو دری زبان میں ترجمہ کرانا پڑا۔ بریداس کے ایک سینئر افسر نے مجھے بتایا کہ ہم معاہدے کی ایک ایک سطر کا جائزہ لے رہے ہیں، تاکہ کوئی ہم پر یہ الزام نہ دھر سکے کہ ہم نے طالبان کو حقائق سے باخبر نہیں رکھا۔ ہم اس معاہدے پر حزب مخالف کی بھی تائید حاصل کریں گے تاکہ یہ صحیح معنوں میں افغان معاہدہ قرار دیا جا سکے۔

ادھر یونوکال نے اس وقت تک طالبان سے گفت وشنید کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک کہ کابل میں ایک ایسی حکومت نہیں بن جاتی، جسے تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔ دریں اثناء یونوکال نے یونیورسٹی آف اوماہا، نبراسکا کو 9 لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا، اس شعبے کے سربراہ افغان معاملات کے ماہر عالم تھا، مس گوئیرے تھے۔ شعبے نے افغانوں کے لئے انسانی امداد کے پروگرام کا اجراء کیا اور قندھار میں جیرالڈ براڈمین کی سربراہی میں ایک سکول قائم کیا۔ جیرالڈ براڈمین 1980ء کے عشرے کے دوران پشاور میں امریکہ کی ایجنسی برائے انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے تھے۔ یہ ایجنسی سرحد پار مجاہدین کو امداد فراہم کرتی رہی تھی، سکول میں 400 افغان استادوں، الیکٹریشنوں، کارپینٹروں اور پائپ فٹروں کی تربیت شروع کی۔ جنہیں یونوکال کی پائپ

لائن بچھانے میں مدد دینا تھی۔ یونوکال نے طالبان کو فیکس اور جنریٹر کی صورت میں کئی اور تحائف بھی دیئے۔ سال کے آخر میں جب اس کا انکشاف ہوا تو اچھا بھلا سکینڈل بن گیا۔ یونوکال نے جو کچھ بھی طالبان کو دیا اس سے طالبان مخالف اتحاد، ایران اور روس کو یقین ہوگیا کہ کمپنی طالبان کی مالی امداد کر رہی ہے۔ یونوکال نے ان الزامات کی رازدار طریقے سے تردید کی۔ اس کے صدر جان ایملی نے مجھے بتایا کہ ہم نے 15 سے 20 ملین ڈالر سینٹ گیس پراجیکٹ پر خرچ کئے۔ اس میں زلزلے سے متاثرین کی امداد، پیشہ وارانہ تربیت اور فیکس مشینوں اور ایک جنریٹر کی فراہمی شامل تھی۔

ڈیلٹا کے کردار سے بھی شبہات کو تقویت ملی، یونوکال نے ڈیلٹا آئیل کو اس کے سعودی عرب سے تعلق اور طالبان سے اس کے روابط کے پیش نظر کہا تھا کہ وہ افغان دھڑوں کو باہمی صلح صفائی پر رضامند کرے۔ ڈیلٹا نے اس مقصد کے لئے اہم سعودیوں کی خدمات حاصل کرنے کی بجائے ایک امریکن چارلس سنتوس کو افغانوں سے رابطہ کرنے پر لگایا۔ سنتوس 1988ء سے افغانستان کے تعلق میں اقوام متحدہ کی مصالحتی کوششوں میں شریک رہا تھا۔ بعد میں وہ مصالحت کنندوں کی تنقید کے باوجود کہ وہ امریکی حکومت کے بہت قریب اور ذاتی مقاصد کے لئے کام کرتا رہا تھا۔ سنتوس اقوام متحدہ کے ثالث محمود مسطری کا سیاسی مشیر بن گیا۔ مسطری نے 1995ء میں جب طالبان کابل کے بالکل قریب پہنچے تھے، اقوام متحدہ کی طرف سے مصالحت کی ناکام کوشش کی تھی۔ تمام افغان لیڈر سنتوس سے بے پناہ نفرت کرتے تھے۔ خاص طور پر طالبان کے نزدیک وہ انتہائی ناپسندیدہ شخص تھا۔ جب ڈیلٹا نے اس کی خدمات حاصل کیں تو کسی نے بھی اس پر اعتماد نہیں کیا۔ یہ ایک غلطی تھی اور یونوکال نے بعد میں اس کا اظہار کیا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ سنتوس نے کئی مرتبہ افغانستان کا دورہ کیا لیکن وہ افغان لیڈروں کو قائل کرنے میں ناکام رہا۔

افغانوں کو رام کرنے میں ڈیلٹا کی ناکامی پر یونوکال اور ڈیلٹا کے درمیان کشیدگی بڑھی

تو یونو کال نے افغانستان سے مشورے کے لئے ماہروں کی ایک ٹیم مقرر کی، جس نے پاکستان میں سابق امریکی سفیر اور صومالیہ کے لئے امریکہ کے خصوصی سفیر رابرٹ اوکلے کی خدمات حاصل کیں، اوکلے نے 1980ء کی دہائی میں مجاہدین کے لئے امریکی امدا کی فراہمی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ لیکن وہ افغان لیڈروں کا دل جیتنے میں ناکام رہا تھا اور امریکہ کو افغانستان سے لاتعلقی اختیار کرنا پڑی اکثر افغان اور پاکستانی اسے بہت مغرور اور نک چڑھا سمجھتے تھے۔ اسلام آباد میں جب وہ سفیر تھا تو اس کا نام ''وائسرائے'' پڑ گیا تھا۔ اوکلے نے یونو کال کے پراجیکٹ کے لئے مدد حاصل کرنے کی خاطر ماسکو اور اسلام آباد کے کئی دورے کیے، اس نے یونو کال کے لئے کئی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کیں۔ ان میں گوئیری، براڈسین، رانڈ کارپوریشن کے لئے کام کرنے والے افغان امریکی خلیل زاد اور وسطی ایشیاء کے معاملات کی ماہر مارتھا بل اوکاٹ شامل تھی۔

کسی امریکی کارپوریشن کے لئے سابق امریکی افسروں یا ماہروں کی خدمات حاصل کرنا خلاف معمول بات نہیں۔ تمام امریکی آئل کمپنیاں عظیم کھیل میں شرکت کے لئے واشنگٹن کو ہم نوا بنانے کے مقصد سے سابق صدر ریگن اور سابق صدر بش کے دور کے نام ور شخصیتوں کی معاونت حاصل کرتی رہی ہیں۔ لیکن یہ بات اس علاقے میں نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس سے شکوک وشبہات پیدا ہوتے اور یہ خیال کیا جانے لگتا کہ یونو کال امریکی حکومت کی پالیسی پر عمل درآمد کا وسیلہ ہے اور 1980ء کی دہائی کی طرح امریکی سی آئی اے اور افغان ماہرین پر مشتمل جال پھر سے بچھایا جا رہا ہے۔

یونو کال کو صدر نیازدف کی طرف سے بھی شدید مشکلات پیش آنے لگیں، وہ حقائق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ انہوں نے افغانستان میں خانہ جنگی سے پیدا ہونے والے مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے یونو کال سے کہا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ کام شروع کر دے، ان کی وزارت خارجہ کے خوفزدہ افسر انہیں بتاتے کہ خانہ جنگی کے دوران تعمیر کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا تو وہ ان پر چیختے اور انہیں چپ کرا دیتے۔ صدر نیازدف نے

مجھے بتایا کہ ہمیں پائپ لائن چاہیے۔ ہمارے تمام بڑے منصوبے افغانستان میں امن اور استحکام سے وابستہ ہیں۔ ترکمان افسر اس درجہ ڈر گئے تھے کہ وہ صدر کو افغانستان کے محاذ کی کوئی بری خبر سناتے ہی نہیں تھے۔ اس طرح صدر نیازدف کی حقائق سے لاعلمی بڑھتی گئی۔

ان مسائل کے باوجود یونوکال آگے بڑھتی رہی۔ مئی 1997ء میں اشک آباد میں علاقائی سربراہ کانفرس کے دوران پاکستان، ترکمانستان اور یونوکال نے ایک معاہدے پر دستخط کئے، جس کے تحت یونوکال کو مالی وسائل کی فراہمی دسمبر 1997ء تک مطلوب سرمایہ اکٹھا کرنے اور 1998ء کے اوائل تک تعمیر شروع کر دینے کا پابند کیا گیا۔ آئی ایس آئی نے امریکہ اور ترکمانستان کو مطلع کیا کہ طالبان شمالی اپوزیشن کے مرکز مزار شریف پر قبضہ کرنے کے قریب ہیں۔ تاہم دو ہفتے بعد طالبان مزار شریف سے پیچھے دھکیل دیئے گئے۔ اس معرکے میں ان کے سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد پورے افغانستان میں جنگ تیز ہوگئی۔ ایک بار پھر آئی ایس آئی پر حد سے بڑھا ہوا بھروسہ امریکہ کے لئے خفت کا سبب بنا۔

مزار شریف میں ناکامی کے بعد سینٹ گیس کے ورکنگ گروپ کے پہلے اجلاس میں، جو اسلام آباد میں ہوا یونوکال کی وائس پریزیڈنٹ ملر نے شدید شبہات کا اظہار کیا کہ یونوکال دسمبر 1997ء میں مقررہ مدت میں اپنا کام مکمل کر سکے گی۔ ملر نے 5 جون 1997ء کو ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ منصوبہ کب شروع کیا جا سکے گا۔ اس کا انحصار افغانستان میں امن کے قیام اور ایک ایسی حکومت پر ہے جس کے ساتھ ہم کام کر سکتے ہوں۔ یہ اس سال یا اگلے سال یا تین سال بعد جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہوگا۔ اگر جنگ جاری رہی تو پھر پتہ نہیں کیا ہوگا۔ پاکستان اور ترکمانستان کو یونوکال کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جس کے تحت کمپنی کے کام شروع کرنے کی مدت ایک یا دو سال آگے بڑھا کر دسمبر 1988ء

کر دی گئی۔ اکثر مبصروں کے نزدیک یہ بھی محض خوش فہمی تھی۔

اس وقت تک واشنگٹن میں یہ شک کیا جانے لگا تھا کہ آیا پاکستان اور طالبان افغانستان کو متحد کر سکنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ نتیجتاً امریکہ نے ترکمانستان کو گیس برآمد کرنے کے قابل بنانے کے لئے دوسرے ذرائع کی تلاش شروع کر دی۔ جولائی 1997ء میں امریکہ نے اپنی پالیسی کو بدلتے ہوئے ڈرامائی اعلان کیا کہ اگر ترکمانستان اور ترکی کے درمیان ایران کے راستے پائپ لائن بچھائی جا سکتی ہو تو امریکہ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ امریکہ نے کہا کہ اس نے ایران پر جو پابندیاں لگا رکھی ہیں، وہ بدستور رہیں گی۔ اس لئے پائپ لائن کو اس کے راستے گزارنے کو اس کی پالیسی میں مکمل تبدیلی سمجھنا صحیح نہیں۔ تاہم جس طرح یورپی اور ایشیائی تیل کمپنیاں ایرانی مارکیٹ میں داخل ہونے کے لئے کوشاں تھیں، امریکی کمپنیوں نے ایک موقعہ پیدا ہوتے دیکھا اور کلنٹن انتظامیہ پر دباؤ بڑھا دیا کہ وہ ایران پر پابندیاں نرم کر دے۔

کیسپین تیل اور گیس کی ایران کے راستے ترسیل کے امکان نے افغان پائپ لائن کی تعمیر کے امکان کو مزید کم کر دیا۔ واشنگٹن کا فیصلہ یونوکال کے لئے کاری ضرب اور پاکستان کے لئے یہ یاد دہانی تھی کہ امریکہ کی حمایت وقت کی مناسبت سے بدل جاتی ہے اور طالبان کے لئے افغانستان کو فتوحات کے ذریعے متحد کرنے کا وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ مزید برآں ایران اور آسٹریلیا کی بی ایچ پی پٹرولیم نے اعلان کیا کہ وہ ایران پاکستان کے درمیان 1600 میل لمبی پائپ لائن بچھانے میں باہم تعاون کریں گے۔ یہ پائپ لائن جس پر 2ء7 بلین ڈالر خرچ ہونے کا اندازہ ہے۔ روزانہ 2 بلین کیوبک فیٹ گیس جنوبی ایران سے کراچی پہنچائے گی اور بعد ازاں ہندوستان کو سپلائی کی جایا کرے گی۔ اس پائپ لائن کا جو یونوکال سے براہ راست مقابلے میں بنے گی، ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ کسی ایسے علاقے سے نہیں گزرے گی، جہاں خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ 16 اکتوبر 1997ء وزیر اعظم نواز شریف ایک روزہ دورے پر اشک آباد پہنچے اور

MashalBooks.org

امریکی منصوبے کے بارے میں صدر نیازدف سے تبادلہ خیال کیا۔ اس کے نتیجے میں یونوکال پاکستان اور ترکمانستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت ترکمانستان سے گیس درآمد کی جائے گی۔ ان کے علاقے سے گزرنے والی ایک ہزار کیوبک فیٹ گیس پر 15 سینٹ دیئے جائیں گے۔ نواز شریف اور نیازدف کے مذاکرات میں ہونے والے فیصلوں پر غیر حقیقت پسندی کی چھاپ تھی۔ کیونکہ انہوں نے افغانستان میں ہونے والی خانہ جنگی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ طالبان بھی ناراض تھے کیونکہ ان سے گیس کی قیمت کے بارے میں مشورہ نہیں کیا گیا تھا، وہ زیادہ معاوضے کے طلب گار تھے۔

یونوکال نے 25 اکتوبر 1997ء کو سینٹ گیس کنسوریشم میں توسیع کرنے اور اس میں جاپان، جنوبی کوریا اور پاکستان کی تیل کمپنیوں کو شامل کرنے کا اعلان کیا۔ یونوکال نے اس کی حمایت حاصل کرنے کی جو کوششیں کیں، ناکام رہیں۔ اگرچہ سینٹ گیس کے 10 فیصد حصے اس کمپنی گیز پروم کے لئے رکھے گئے تھے۔ تاہم اس نے معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ روس نے امریکہ کی جانب سے طالبان کی حمایت کرنے اور وسطی ایشیاء میں روس کا اثر کم کرنے پر تنقید کی تھی۔ گیز پروم کے سربراہ نے اعلان کیا کہ روس ترکمانستان یا قازقستان کو غیر روسی پائپ لائنوں کے ذریعے تیل یا گیس برآمد کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اپنی مارکیٹ کھو دینا، روس کے خلاف جرم ہوگا۔

امریکی افسروں نے اپنی روس مخالف پالیسی پہلے ہی واضح کر دی تھی۔ امریکہ کی پالیسی کیسپیئن تیل اور گیس کو تیزی سے ترقی دینا ہے۔ انرجی ایکسپرٹ شیلا ہسلین نے کہا کہ اس سے ہمارا مقصد تیل اور گیس کے ذخائر والے ملکوں کی آزادی کو تقویت پہنچانا اور اس کے فروغ میں مدد دینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس علاقے سے تیل کی ترسیل پر روسی اجارہ داری ختم کرنا اور توانائی کی سپلائی کے متبادل انتظامات کے ذریعے مغربی مفادات کا تحفظ کرنا ہے۔

بریداس دوڑ میں شامل رہی، اس بار اس کا ایک طاقتور حصہ دار تھا، جس پر امریکہ بھی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ ستمبر 1997ء میں بریداس نے لاطینی امریکہ میں اپنے 60 فیصد حصے امریکہ کی ایک بڑی تیل کمپنی ایمو کے ہاتھ فروخت کر دیئے، اس سودے کا مقصد یہ تھا کہ ایمو کو صدر نیازدف پر اپنے اثر کی بنا پر بریداس کے ترکمانستان سے اثاثے واگزار کرا سکے گی۔ بریداس نے ستمبر میں طالبان کے وزیر صنعت ملا احمد جان کو دوسری بار بیونس آئیرس کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ پاکستانی حکام نے طالبان کو اس وقت تک پشاور کے ہوائی راستے سے باہر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا، جب تک کہ وہ یونوکال کے ہاں جانے پر رضامندی کا اظہار نہیں کرتے۔ طالبان کا ایک اور وفد نومبر 1997ء میں یک چشم ملا محمد غوث کی سربراہی میں ہیوسٹن پہنچا۔ اسے یونوکال سے مذاکرات کرنے تھے۔ وفد کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ اسے فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ چڑیا گھر لے جایا گیا۔ سپر مارکیٹ دکھائی گئیں، وہاں کے سپیس سنٹر میں خلائی تحقیقات کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔ وفد کے ارکان نے مارٹی ملر کے ہاں رات کا کھانا کھایا۔ جہاں انہوں نے مارٹی ملر کے سوئمنگ پول اور خوبصورت اور آرام دہ مکان کی تعریف کی۔ وفد نے محکمہ خارجہ کے افسروں سے ملاقات کی اور ایک بار پھر کہا کہ امریکہ طالبان کی حکومت کو تسلیم کر لے۔

سرما میں تعطیل کے بعد 1998ء کے موسم بہار میں پھر سے جنگ چھڑ گئی۔ دونوں کمپنیوں کے منصوبے پہلے ہی کی طرح اب بھی دور کی کوڑی تھے۔ مارچ میں مارٹی ملر نے اشک آباد میں کہا کہ پراجیکٹ غیر معین عرصے کے لئے رک گیا ہے۔ جب تک جنگ جاری ہے، سرمایہ فراہم کرنا ممکن نہیں۔ یونوکال نے دسمبر 1998ء کے بعد معیاد میں مزید توسیع کے لئے کہا۔ کمپنی کے حصہ داروں کے سالانہ اجلاس میں بعض حصہ داروں نے عورتوں کے ساتھ طالبان کی بدسلوکی پر اعتراض کیا۔ امریکہ میں خواتین کے حامی گروپوں نے طالبان اور یونوکال کے خلاف رائے عامہ منظم کرنا شروع کر دی۔

1998ء کے دوران یونوکال پر خواتین کا دباؤ بڑھتا رہا۔ ستمبر 1998ء میں گرین پیس تحریک کے سرگرم ارکان نے کلنٹن کے اٹارنی جنرل سے مطالبہ کیا کہ انسانیت کے خلاف جرائم کے ارتکاب اور طالبان سے تعلقات کی بنا پر یونوکال کو توڑ دیا جائے، طالبان نے ان الزامات کو مضحکہ خیز قرار دیا۔ یونوکال نے پہلے خواتین کے حامیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور پھر ان کے الزامات پر چپ سادھ لی۔ اس لئے کہ اس جنگ میں کامیابی ممکن نہ تھی، یہ امریکی خواتین تھیں، غیر ملکی نہیں تھے۔ خواتین ایسے مسئلے کے بارے میں جواب طلب کر رہی تھیں، جسے کلنٹن انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی۔ جان ایملی نے کہا کہ ہمیں امریکی خواتین کے بعض گروپوں سے اس بات پر اختلاف ہے کہ یونوکال کو اس مسئلے پر کیا رویہ اپنانا چاہیے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غیر ممالک میں ہماری حیثیت مہمانوں کی ہوتی ہے، ان ممالک کی آزادانہ حیثیت ہے، ان کے اپنے لباس، سماجی اور مذہبی عقائد ہیں۔ ہمارے سمیت کوئی کمپنی ان مسائل کو اکیلے حل نہیں کر سکتی۔ افغانستان سے دور ہٹ جانے، پائپ لائن کا پراجیکٹ اور انسانی امداد کے منصوبوں کو ترک کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

امریکہ کی جانب سے اگست 1998ء میں اسامہ بن لادن کے کیمپوں پر امریکی بمباری نے یونوکال کو اپنا عملہ پاکستان اور قندھار سے نکال لینے اور آخر میں سینٹ گیس کنسورشیم سے، جسے بنانے میں اس نے بڑی محنت کی تھی، نکل آنے پر مجبور ہونا پڑا۔ تیل کی عالمی قیمتوں میں کمی سے بھی، جس سے تیل کی عالمی صنعت بری طرح متاثر ہوئی۔ یونوکال کو سخت نقصان پہنچا۔ یونوکال کو ترکی میں تیل کی پائپ لائن کے ایک منصوبے کو ترک کرنا پڑا۔ پاکستان، ترکمانستان، ازبکستان، قازقستان میں اپنے دفاتر بند کرنے پڑے اور قیمتوں میں کمی کے سبب اسے 1999ء میں اپنے مصارف میں 40 فیصد کمی کرنا پڑی۔ یونوکال کو ان صبر آزما ایام میں صرف ایک کامیابی ہوئی، وہ بریداس کے خلاف تھی۔ 5 اکتوبر 1998ء کو ٹیکساس ڈسٹرکٹ کورٹ نے بریداس کا یونوکال کے

MashalBooks.org

خلاف 15 بلین ڈالر کے ہرجانے کا مقدمہ اس بنا پر خارج کر دیا کہ یہ تنازعہ ترکمانستان اور افغانستان کے قوانین کی حدود میں آتا ہے۔ ٹیکساس کے قانون کی حدود میں نہیں۔

امریکہ کی توجہ اب اسامہ بن لادن کو پکڑنے پر مرکوز تھی، جس سے لگتا تھا کہ عظیم کھیل کا ایک مرحلہ گزر گیا ہے۔ یہ واضح تھا کہ عورتوں سے متعلق افغان پالیسی، بن لادن اور مسلسل خانہ جنگی کے ہوتے، کوئی امریکی کمپنی افغان پائپ لائن تعمیر نہیں کر سکتی۔ یہ بات یونوکال پر بھی بالکل عیاں تھی۔ لیکن طالبان اور پاکستان اسے جلد فتح کے بارے میں یقین دلاتے رہتے۔ بریداس مقابلے میں شریک تھی لیکن ذرا دھیمے انداز میں، اگرچہ منصوبہ ختم ہو چکا تھا لیکن پاکستان اسے زندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اپریل 1999ء میں اسلام آباد میں ایک اجلاس میں پاکستان، ترکمانستان اور طالبان نے منصوبے کے احیاء کی کوشش کی اور کہا کہ وہ سینٹ گیس کے لئے نئے سرپرست مددگار تلاش کریں گے، لیکن اب کوئی بھی افغانستان کے معاملے میں دخل دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ طالبان اور غیر ملکی سرمایہ کار پاکستان سے دامن کش تھے۔ پال سٹاروبن کے مطابق وسطی ایشیاء کے بارے میں امریکہ کی حکمت عملی پیچیدگیوں کا مجموعہ تھی اور مارتھا بل اولکاٹ کے نزدیک لاتعلقی پرخطر تھی۔ آرتھر رابرٹ کیپلان نے علاقے کو افراتفری کی سرحد قرار دیا۔ تیل کی قیمتوں میں کمی بے انتہا کمی اور آئیل کمپنیوں سے سرمایہ کاری سے انکار کے باوجود امریکہ باکو، سائی ہان، پائپ لائن بچھانے میں گہری دلچسپی لیتا رہا، اس کا خیال تھا کہ کسی جنگی حکمت عملی یا علاقے میں آویزش کے خاتمے کے بغیر ہی پائپ لائنیں تعمیر کی جا سکتی ہیں۔ مجاہدین کو اربوں ڈالر کا اسلحہ اور گولہ بارود دینے کے بعد، جب 1989ء میں افغانستان سے سوویت فوج کا انخلا مکمل ہوا تو امریکہ نے افغان کے مسئلے سے لاتعلقی اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ 1992ء میں کابل کے فتح ہونے کے بعد، امریکہ نے لاتعلقی کی رفتار تیز تر کر دی۔ واشنگٹن نے علاقے میں اپنے اتحادیوں، پاکستان اور سعودی عرب پر چھوڑ دیا کہ وہ افغان خانہ جنگی سے اپنے طور پر

MashalBooks.org

جس طرح چاہیں عہدہ برآ ء ہوں۔ عام افغانوں نے منظر سے امریکہ کے ہٹ جانے کو غداری قرار دیا۔ واشنگٹن کے بین الاقوامی دباؤ کے تحت افغان جنگی سرداروں کے درمیان صلح کرانے سے گریز کو اس سے بھی بڑی غداری سمجھا گیا۔ امریکہ کی سوچی سمجھی لاتعلقی نے تمام علاقائی طاقتوں کو، جن میں نو آزاد وسط ایشیائی ریاستیں بھی شامل تھیں، جنگی سرداروں کو شہ دینا شروع کر دی، جس کے باعث خانہ جنگی نے شدت اختیار کر لی اور اس کے طول پکڑنے کی صورت پیدا ہوگئی۔

مجاہدین کے لئے امریکہ کی اسلحے اور گولے بارود کی پائپ لائن کی جگہ بین الاقوامی انسانی امداد کی پائپ لائن نہیں بنائی گئی، جس سے جنگ سرداروں کو امن قائم کرنے اور ملک کی تعمیر نو کرنے کی ترغیب ملتی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد واشنگٹن نے افغانستان، پاکستان، ایران اور وسطی ایشیاء کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی، وہ کسی سوچے سمجھے ڈھانچے اور حکمت عملی سے محروم تھی۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو اسے جوں توں کر کے انفرادی سطح پر حل کر لیا گیا۔ اس کے بارے میں نہ کوئی نقطہ نظر اختیار کیا گیا اور نہ ہی کوئی مربوط حکمت عملی اپنائی گئی۔ طالبان سے متعلق امریکی پالیسی کے کئی مراحل ہیں جو امریکہ کی داخلی سیاست کے باعث پیش آتے رہے یا سوچے سمجھے طریقے اختیار کرنے کی بجائے فوری حل کے طور پر اپنائے جاتے رہے۔ 1994ء اور 1996ء کے درمیان امریکہ نے اپنے حلیفوں پاکستان اور سعودی عرب کے توسط سے طالبان کی سیاسی حمایت کی۔ اس لئے امریکہ طالبان کو ایران اور شیعوں کا مخالف اور مغرب کا حامی سمجھتا تھا۔ امریکہ نے طالبان کی اسلامی بنیاد پرستی، عورتوں کے استحصال اور وسطی ایشیاء میں پھیلائی جانے والی سراسیمگی کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ اس وقت اس کے مضمرات کو سمجھنے اور ملحوظ رکھنے کو چنداں ضروری خیال نہیں کرتا تھا۔ 1995ء اور 1997ء کے درمیان امریکہ یونوکال کے منصوبے کی حمایت کے حوالے سے بھی طالبان کی حمایت کر رہا تھا۔ امریکہ نے اس وقت تک وسط ایشیاء کے تیل اور

گیس کے ذخائر تک رسائی کے لئے پائپ لائن بچھانے کا سوچا تھا اور نہ ہی اس طرف دھیان دیا تھا کہ علاقے میں خانہ جنگی جاری رہی تو پائپ لائن تعمیر کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ امریکہ کی پالیسی 1997ء سے بدلی، یہ طالبان کے خلاف امریکی خواتین کی موثر مخالفت کا اثر تھا۔ کلنٹن انتظامیہ نے ملک کے اندرونی سیاسی مطالبات کو ہمیشہ خارجہ پالیسی کے تقاضوں پر مقدم سمجھا، حلیفوں کی خواہشات کے تعلق میں بھی اس کا یہی طرزعمل رہا۔ صدر کلنٹن افغانستان کے مسئلے پر اس وقت جاگے جب امریکی خواتین نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ صدر کلنٹن اور مسز ہلری کلنٹن نے 1996ء کے انتخابات میں زیادہ تر عورتوں اور ووٹوں پر انحصار کیا تھا۔ مونیکا لیونسکی کے سکینڈل کے دوران بھی انہیں امریکی عورتوں کی حمایت حاصل رہی۔ وہ آزاد خیال امریکی خواتین کو ناراض کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہالی وڈ کے بڑے اداکار اور اداکارائیں صدر کلنٹن اور نائب صدر البرٹ گور کی مہم میں زور شور سے شریک رہے اور مالی معاونت کرتے رہے۔ نائب صدر البرٹ گور اپنے صدارتی انتخابات میں ان کی حمایت کو اہم سمجھتے تھے۔ غرض امریکہ کے لئے طالبان کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

1998ء اور 1999ء میں طالبان کی طرف سے بن لادن کی حمایت، یونوکال کے منصوبے کی تائید کرنے سے انکار، اپنے مخالفوں سے مصالحت سے گریز اور ایران میں نئی اعتدال پسند حکومت سے مخاصمت نے امریکہ کو طالبان کے بارے میں سخت رویہ اپنانے کی مزید وجوہ مہیا کر دیں۔ 1999ء میں بن لادن کو پکڑنا امریکہ کی پالیسی کا بنیادی مقصد رہا۔ اس نے اس بات کو بھی نظر انداز کئے رکھا کہ افغانستان میں جو نئی اسلامی بنیاد پرستی جڑ پکڑ رہی ہے، وہ درجنوں بن لادن پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ تاہم تاخیر سے ہی سہی امریکہ پہلی بار حقیقی معنوں میں امن کا جویا ہوا اور اس نے جنگ بند کرانے کے لئے اقوام متحدہ کی مصالحانہ کوششوں کی مکمل حمایت کی۔

امریکہ کی پالیسی بیشتر غلط مفروضوں پر منحصر اور مبنی رہی ہے۔ 1994ء میں جب طالبان منظر پر نمایاں ہوئے تو میں اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے لوگوں سے ملا اور انہیں نہایت پرجوش پایا۔ قندھار جانے والے امریکی سفارت کاروں سے ملاقات میں طالبان نے انہیں بتایا کہ وہ ایران کو پسند نہیں کرتے۔ وہ پوست کی کاشت اور ہیروئن بنانے پر پابندی لگا دیں گے۔ وہ عرب افغانوں سمیت تمام باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے خلاف ہیں، وہ اقتدار میں آنے اور ملک پر حکمرانی کرنیکی خواہش نہیں رکھتے، بعض امریکی سفارتی نمائندوں نے انہیں امریکن کرسچن علاقے میں پیدا ہونے والے عیسائیوں کی طرح مسیحا نفس اور نیکوکار سمجھا۔ امریکی سفارت کاروں کو یقین تھا کہ طالبان افغانستان میں امریکہ کے بنیادی مقاصد پورا کرنے کا وسیلہ ثابت ہوں گے، وہ منشیات اور غلط کاروں کو ختم کر دیں گے۔ یہ ایک مسلمہ بھول پن تھا، جس نے طالبان کے گرد ایک معاشرتی ہیولا سا بنا دیا تھا۔ وہ خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کس کی نمائندگی کرتے ہیں، نہ یہ کہ انہیں ریاستی اقتدار چاہیے یا نہیں۔

1995ء میں جب طالبان نے ہرات پر قبضہ کیا اور ہزاروں لڑکیوں کو سکولوں سے نکال باہر کیا تو امریکہ مہر بلب رہا، اس کی طرف سے طالبان پر تنقید کا ایک لفظ بھی سننے میں نہیں آیا۔ درحقیقت امریکہ نے پاکستان کی آئی ایس آئی کی طرح ہرات پر طالبان کے قبضے کو یونوکال کے لئے نعمت اور ایران کے گلے میں پھندے کو سخت ہوتا جانا۔ امریکہ کا طالبان کو ان کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لئے استعمال کرنے کا مقصد اس کی کم نگاہی اور کم نظری کا غماز تھا کیونکہ اس کا مطالب ایران کو پاکستان کے خلاف اور شیعوں کو سنیوں کے خلاف اور پشتونوں کو غیر پشتونوں کے خلاف صف آراء کرنا تھا۔ برنٹ روبن نے لکھا کہ ایران کو الگ تھلگ اور دہشت گردی کے خلاف حصار باندھنے کے جو بھی محرکات تھے، ان کے باعث امریکہ، افغانستان میں بے اثر ہو کر رہ گیا۔ ایران پہلے ہی سی آئی اے کی سازشوں کے سبب سے جو ایران کو نقصان پہنچانے کے لئے کی جاتی

ہیں، امریکہ کے سخت خلاف تھا۔ سی آئی اے طالبان کی مدد کر رہی تھی اور ساتھ ہی طالبان کے مخالف اتحاد کو فوجی امداد فراہم کرنے کا وسیلہ تھی۔ ایک ایرانی سفارت کار نے کہا کہ امریکہ کی پالیسی ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم روس سے مل جائیں اور پاکستان سعودی عرب اور طالبان کے خلاف اتحاد کا ساتھ دیں۔ بعض امریکی سفارت کاروں نے جنہیں افغانستان کے ضمن میں اپنی حکومت کی بے جہت پالیسی پر تشویش تھی، تسلیم کیا کہ امریکہ کی کوئی صحیح اور مبسوط پالیسی نہیں، سوائے اس کے کہ جو پاکستان اور سعودی عرب چاہیں، آنکھیں بند کر کے ویسا ہی کرتے جاؤ۔

1996ء میں کابل پر طالبان کا قبضہ ہونے کے کچھ ہی دیر پہلے ایک خفیہ رپورٹ میں جس کے کچھ حصے پڑھنے کا مجھے موقع ملا، تجزیہ نگاروں نے لکھا کہ اگر طالبان کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوا تو روس، ہندوستان اور ایران طالبان کے مخالفوں کی حمایت کریں گے اور خانہ جنگی جاری رہے گی۔ امریکہ کو یہ مشکل پیش آئے گی کہ وہ اپنے پرانے حلیف پاکستان کی حمایت جاری رکھے یا ہندوستان اور روس کو ناراض نہ ہونے دے، جس سے وہ تعلقات بہتر بنانے کی کوشش میں ہے۔ اس صورت حال میں محکمہ خارجہ کے نزدیک امریکہ کے لئے افغانستان سے متعلق کوئی مربوط پالیسی اختیار کرنا مشکل رہے گا۔ امریکہ میں صدارتی انتخاب کے سال میں افغانستان کے بارے میں مربوط پالیسی اپنانے کی اتنی ضرورت بھی نہیں۔

ایک اور مسئلہ بھی تھا۔ واشنگٹن میں چند ہی افراد افغانستان میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جنوبی ایشیا کے لئے امریکہ کی نائب سیکرٹری خارجہ اور افغان پالیسی بنانے میں بنیادی کردار ادا کرنے والی رابن رافیل نے نجی طور پر تسلیم کیا کہ انہوں نے افغانستان سے متعلق جو بھی تجاویز پیش کیں، امریکہ کے حکمرانوں نے ان میں بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا، سیکرٹری خارجہ وارن کرسٹوفر نے اپنے عہدے کی پوری معیاد کے دوران ایک بار بھی افغانستان کا ذکر نہیں کیا۔ رافیل نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ذریعے

افغانستان کو اسلحے کی فراہمی پر بین الاقوامی پابندی لگانے کی تجویز منظور کرانے کی جتنی بھی کوششیں کیں، وائٹ ہاؤس کی طرف سے ان کی کوئی حمایت نہیں ہوئی۔ مئی 1996ء میں رافیل نے سلامتی کونسل سے افغانستان پر بحث کرانے کی کوشش کی۔ چھ برس میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس کی نوبت آئی تھی۔ جون میں سینٹر ہنک براؤن نے رافیل کی حمایت سے افغانستان پر سینٹ میں بحث کا اور واشنگٹن میں افغان دھڑوں اور امریکی سینٹروں کے درمیان تین روزہ کانفرنس کرانے کا اہتمام کیا۔ کانفرنس پر اٹھنے والے مصارف یونوکال کی مدد سے پورے کئے گئے۔

رافیل کو افغانستان میں رونما ہونے والے خطروں کا پورا احساس تھا۔ مئی 1996ء میں انہوں نے امریکی سینٹ کو بتایا کہ افغانستان منشیات، جرائم اور دہشت گردی کا منبع بن گیا ہے۔ جو پاکستان، وسط ایشیائی ریاستوں اور ان سے ماورا یورپ اور روس کے لئے خطرے کا موجب ثابت ہوسکتا ہے، اس نے کہا کہ افغانستان میں انتہا پسندوں کی تربیت کے لئے جو کیمپ قائم ہیں، وہ دہشت گردی برآمد کر رہے ہیں، لیکن رافیل کی مسلسل کوششیں اب جستہ جستہ سفارت کاری کی فائلوں میں ڈھل گئیں کیونکہ امریکہ نے علاقے کے بارے میں کوئی سنجیدہ رویہ نہیں اپنایا تھا۔

ستمبر 1996ء میں جب طالبان نے کابل پر قبضہ کیا تو سی آئی اے نے دوبارہ آئی ایس آئی کے تجزیے پر ہی انحصار کرتے ہوئے سوچا کہ افغانستان پر طالبان کا قبضہ ہونا ممکن ہوگیا ہے اور یونوکال کا منصوبہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ امریکہ کابل کی خواتین پر طالبان کے جور و جبر اور جنگ میں ڈرامائی تیزی پر خاموش رہا۔ نومبر میں رافیل نے تمام ریاستوں پر زور دیا کہ وہ طالبان سے تعلق پیدا کریں۔ انہیں تنہا نہ ہونے دیں۔ رافیل کا کہنا تھا کہ طالبان کا دو تہائی ملک پر قبضہ ہوگیا ہے، وہ افغان ہیں، ملک کے باشندے ہیں، انہوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ اقتدار میں رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا اصل ذریعہ اکثر افغانوں، خاص طور پر پشتونوں کی تائید و حمایت ہے، جو

MashalBooks.org

جنگ اور انتشار کی کیفیت کو امن وسلامتی کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی چنداں فکر نہیں کہ شدید نوعیت کی معاشرتی پابندیاں جاری رہتی ہیں۔ رافیل کا موقف تھا کہ طالبان کا الگ تھلگ ہونا نہ افغانستان کے مفاد میں ہے اور نہ ہمارے مفاد میں۔ کئی امریکی مبصروں نے امریکی پالیسی میں اتار چڑھاؤ کو بری طرح محسوس کیا۔ امریکہ اگرچہ انسانی قانونی کی خلاف ورزیوں کا کڑا ناقد تھا لیکن اس نے افغانستان کے تعلق میں کوئی واضح اور دوٹوک پالیسی نہیں اپنائی تھی اور نہ افغانستان میں اپنے دوستوں اور اتحادیوں، پاکستان اور سعودی عرب کی مداخلت کے خلاف کوئی برسر عام موقف اختیار کیا تھا۔ جن کی مالی اور دوسری نوعیت کی امداد طالبان کے کابل پر قبضہ کی سبب بنی۔

امریکہ اور یونوکال چاہتے تھے کہ طالبان فتح یاب ہوں، وہ پاکستان کے اس تجزیے سے کہ طالبان ضرور کامیاب ہوں گے، اتفاق کرنے لگے تھے۔ امریکہ کے محتاط پالیسی سازوں کو امید تھی کہ 1920ء کے عشرے میں امریکہ اور سعودی عرب کے جس نوع کے تعلقات تھے، طالبان اسی طرح ترقی کریں گے، جس طرح سعودی عرب نے کی تھی، وہاں بھی آرمکو کی طرز کی امریکی تیل کمپنی ہوگی۔ پائپ لائنیں ہوں گی، ملک کا سربراہ ایک امیر ہوگا، کوئی پارلیمنٹ نہیں ہوگی اور ملک میں شریعت نافذ ہوگی۔ ایک امریکی سفارت کار نے کہا کہ ہمیں یہ سب کچھ قبول ہے، یہ غیر متوقع نہیں کہ طالبان مخالف اتحاد، ایران اور روس یونوکال کے منصوبے کو امریکہ اور سی آئی اے کی خارجہ پالیسی کا ایک حصہ اور طالبان کے لئے امریکی حمایت کا وسیلہ سمجھنے لگیں۔ یونوکال کے امریکہ سے تعلقات کے بارے میں بڑی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ امریکی مبصر رچرڈ میکنزی نے لکھا کہ سی آئی اے اور آئی ایس آئی امریکہ کو باقاعدگی سے بریف کرتی رہی ہیں۔

یونوکال نے نہ تسلیم کیا اور نہ ہی انکار کیا کہ اسے امریکہ کے محکمہ خارجہ کی حمایت حاصل ہے۔ کوئی بھی امریکی کمپنی کسی بھی مل میں یہی کرتی۔ یونوکال نے سی آئی اے سے کسی

قسم کا تعلق رکھنے کی تردید کی۔ یونو کال واحد امریکی کمپنی تھی جو سینٹ گیس کنسورشیم میں شامل تھی۔ امریکی محکمہ خارجہ کی طرف سے مجوزہ پائپ لائن کے راستے کی تائید اور حمایت عملاً سینٹ گیس اور یونو کال کی حمایت تھی۔ امریکی حکومت یونو کال کی سیاسی غیر جانبداری کی پالیسی سے واقف تھی۔ یونو کال کی ناکامی اور کمزوری یہ تھی کہ اس نے افغان دھڑوں سے کوئی تعلق قائم نہیں کیا تھا۔ خاص طور پر ان دھڑوں سے جو امریکہ اور پاکستان کی حکومتوں کے اثر سے آزاد تھے۔

ایک اور بڑا مسئلہ بھی تھا۔ جولائی 1997ء تک جب سٹورب ٹالبوٹ نے واشنگٹن میں تقریر کی تھی، امریکہ نے وسط ایشیاء کے تیل اور گیس سے استفادے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، نہ ہی کوئی لائحہ عمل تجویز کیا تھا۔ امریکہ کی آئیل کمپنیوں کو ایک مسئلہ درپیش تھا، جسے وہ حل نہیں کر سکتی تھی، انہیں ایران اور روس کے راستے پائپ لائنیں بچھانے کی ممانعت تھی۔ امریکہ نے جب کیسپین کے علاقے سے ترک تک تیل اور گیس کی ترسیل کے لئے (رداس اور ایران سے بچ کر) پائپ لائن بچھانے کے بارے میں پالیسی طے کی تو آئیل کمپنیاں زیادہ مصارف اور علاقے میں افراتفری کے پیش نظر اس پالیسی پر عمل پیرا ہونے میں متامل تھیں۔ بنیادی مسئلہ جسے امریکہ حل نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ علاقے میں امن قائم کرنا تھا۔ جب تک وسطی ایشیاء اور کیسپین کے علاقے (افغانستان، تاجکستان، جارجیا، چیچنیا، نگورتھ کار باخ اور کروشیا) میں خانہ جنگی ختم نہیں ہوتی اور ایران اور روس کے وسیع تر صلح صفائی نہیں ہو جاتی، پائپ لائنیں بچھانا اور انہیں تجارتی لحاظ سے منافع بخش بنانا ممکن نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایران اور روس ان کا راستہ روک دیں گے یا انہیں تباہ کر سکیں گے۔

ایران اور روس اس کے مفاد میں تھا کہ طالبان مخالف اتحاد اسلحے کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہے اور علاقہ عدم استحکام کا شکار رہے تاکہ پائپ لائنیں بچھانے کا امریکہ منصوبہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ امریکہ آج بھی اس اہم سوال پر ذہنی الجھاؤ میں مبتلا ہے کہ آیا

اسے وسط ایشیائی ریاستوں کو تیل اور گیس کی حسب منشاء ذرائع سے برآمد کی اجازت دے کر ان کی معیشت کو سنبھالا دینا چاہیے یا جہاں تک پائپ لائنوں کا تعلق ہے، ان کے لئے ایران اور روس کو ممنوعہ علاقے قرار دیئے رکھنا چاہیے۔

امریکہ اور یونوکال کو افغانستان کے تعلق میں اس سوال کا سامنا تھا کہ آیا طالبان کی مشکل کشائی کے لئے پاکستان اور سعودی عرب پر انحصار کرنا چاہیے اور ملک کو از سر نو فتح کر کے افغانوں میں مفاہمت کا پرانا طریقہ آزمانا چاہیے یا یہ مناسب ہے کہ امریکہ قیام امن کے لئے کوشاں ہو اور افغان نسلی گروہوں اور دھڑوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے اور ایک وسیع البنیاد حکومت کے قیام میں مددگار ہو، جو مستقل استحکام کی ضامن ہو سکے۔ امریکہ کابل میں وسیع البنیاد اور کثیر النسلی حکومت کے قیام کے حق میں تھا، وہ کچھ عرصہ طالبان سے بھی امید لگائے رہا اور جب اس نے یہ امید ختم کی تو وہ پاکستان اور سعودی عرب کا راستہ روکنے کے حق میں نہیں تھا۔

سی آئی اے کے پاس طالبان کو اسلحہ اور گولہ بارود مہیا کرنے کے لئے مالی وسائل نہیں تھے۔ رہی یونوکال تو اس نے کبھی طالبان کو فوجی امداد فراہم نہیں کی تھی اور نہ اس کا وسیلہ بنی تھی۔ البتہ امریکہ اپنے روایتی حلیفوں پاکستان اور سعودی عرب کے ذریعے طالبان کی مدد کرتا رہا اور انہیں طالبان کی ضرورت کا اسلحہ اور سرمایہ فراہم کرتا رہا۔ افغانستان کے معاملے سے متعلق ایک اعلیٰ امریکی سفارت کار نے 1998ء میں بتایا کہ امریکہ طالبان کی مدد پر اس لئے بھی مجبور تھا کہ اس کے پاکستان اور سعودی عرب سے تعلقات تھے، یہ دونوں ممالک طالبان کی پشت پناہی کر رہے تھے، لیکن اب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ ہم نے صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ ہم مسئلے کے حل کے حامی ہیں۔ یہ امریکہ کی کوئی ڈھکی چھپی پالیسی نہیں تھی بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سرے سے کوئی پالیسی تھی ہی نہیں۔ ڈھکی چھپی پالیسی وضع کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے منصوبہ بندی کی، سرمائے کی اور بروقت فیصلے کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن افغانستان کے ضمن میں

امریکہ انتظامیہ کے اعلیٰ ترین سطح پر اس طرح کا کوئی عمل نہیں ہو رہا تھا۔ 1997ء میں طالبان کے ضمن میں امریکہ کے نقطہ نظر میں جو تبدیلی آئی اس کا محرک پاکستان کا انحطاط پذیر سیاسی اور اقتصادی بحران تھا۔ امریکی افسروں نے اپنے ان خدشات کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ منشیات، دہشت گردی اور اسلامی بنیاد پرستی کا خطرہ جو طالبان نے پیدا کیا ہے، وہ امریکہ کے پرانے لیکن اب یقینی طور پر کمزور حلیف پاکستان پر غالب آ سکتا ہے۔ امریکہ نے پاکستان کو ان روز افزوں خطروں سے متنبہ کیا، جو اسے درپیش تھے لیکن وہ آئی ایس آئی سے مایوس ہوا، جس نے طالبان کو سیاسی اور نسوانی محاذ پر لچکدار پالیسی اپنانے پر مجبور کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکی رویے میں تبدیلی کا پہلا کھلے عام اظہار، وزیر خارجہ میڈیسن آلبرائٹ نے نومبر 1997ء میں اسلام آباد میں کیا۔ پاکستان کے محکمہ خارجہ کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کہا کہ عورتوں سے متعلق طالبان کی پالیسی قابل نفرت ہے، اندرانھوں نے پاکستانی حکام کو انتباہ کیا کہ پاکستان وسطی ایشیا میں تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے امریکہ کو نقصان پہنچ رہا ہے، کیونکہ اسے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے پاکستان کے وسیلے کی ضرورت ہے، جس کی کمزوری، امریکہ کے لئے ضعف کا موجب ہے۔ لیکن نواز شریف کی حکومت خود اپنے مفاد سے غافل رہی، وہ پاکستان کو وسطی ایشیاء کے تیل اور گیس کی برآمد کا وسیلہ بنانا چاہتی تھی، جس کے لئے اس نے افغانستان میں قیام امن کو ضروری قرار دیا لیکن یہ مقصد اس کے نزدیک طالبان کی مکمل فتح کی صورت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ پاکستان بیک وقت نہ تو طالبان کو فتح سے ہمکنار کر سکتا ہے، نہ وسطی ایشیاء تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، نہ ایران سے دوستی کر سکتا ہے اور نہ بن لادن کے طرز کے دہشت گردوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ یہ خود فریبی پر مبنی ناکام اور متضاد پالیسی تھی، جس کا پاکستان اعتراف تک کرنے پر تیار نہیں تھا۔

امریکہ کی پالیسی میں تبدیلی کا محرک واشنگٹن میں اہم تبدیلیاں بھی تھیں۔ 1997ء

MashalBooks.org

میں بے اثر وارن کرسٹوفر کی جگہ ہیڈلیف آپرائٹ وزیر خارجہ مقرر کی گئیں۔ ان کا بچپن وسطی یورپ میں گزرا۔ انہیں وہاں انسانی حقوق کے ضمن میں جو تجربات حاصل ہوئے، ان کا ان کی فکر میں نمایاں رہنا اور ان کے ایجنڈے میں اہمیت حاصل کرنا فطری تھا۔ امریکی سفارت کاروں کی ایک نئی ٹیم کا واشنگٹن اور اسلام آباد میں تقرر عمل میں آیا اور یوں افغانستان کے معاملے سے نمٹنے کا نیا انداز شروع ہوا۔ جنوبی ایشیاء کے لئے نئے امریکی اسٹنٹ سیکرٹری کارل انڈر فرتھ، سابق صحافی ہونے کے ناتے افغانستان کے بارے میں زیادہ جانتے تھے۔ رافیل سے جتنا کرسٹوفر قریب تھا، اس سے کہیں زیادہ کارل انڈرفرتھ البرائٹ کے قریب تھا۔ البرائیٹ نجی طور پر پاکستان کی پالیسیوں اور طالبان پر کھلے عام تنبیہ کرتیں۔ اقوام متحدہ میں امریکی سفیر بل رچرڈسن نے اپریل 1998ء میں اسلام آباد میں کابل کا دورہ کیا۔ پاکستان نے طالبان پر کوئی حقیقی دباؤ نہیں ڈالا۔ انہیں یہ مشورہ ضرور دیا کہ وہ رچرڈسن کو پورا پروٹوکول دیں۔ اس اعتبار سے یہ دورہ تعلقات عامہ کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ رچرڈسن نے طالبان سے جو معاہدے کئے وہ چند گھنٹے بعد ملا عمر سے ان کی ملاقات میں منسوخ قرار پائے، اس دورے کا واحد مثبت حاصل یہ تھا کہ ایران کو یقین ہو گیا کہ امریکہ آئندہ افغان امن مذاکرات میں طالبان کو صرف گفتگو کے لئے ہی شامل کرے گا۔ اس سے افغانستان پر امریکہ اور ایران کی کشیدگی میں کمی ہو گئی۔

1996ء میں رافیل نے جو اقدامات کئے، ان کے حوالے سے دیکھا جائے تو امریکہ، افغانستان کے بحران میں لفظی دلچسپی ضرور رکھتا تھا لیکن کوئی حقیقی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ امریکہ کسی ایک یا دوسرے کے ساتھ دینے یا امن کے قیام کی پیچیدگیوں میں الجھنے سے گریزاں تھا۔ پاکستانیوں نے اس کمزوری کو بھانپ لیا اور امریکی دباؤ کی نفی کرنے لگے۔ وزیر خارجہ گوہر ایوب نے رچرڈسن کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے اور ٹوکیو کے دورے میں امریکیوں کے خوب لتے لئے اور کہا کہ امریکی کابل میں

اپنی کٹھ پتلیاں بٹھانے کی فکر میں ہیں، یہ لوگ پاکستان میں ایک کاک ٹیل پارٹی سے دوسری پارٹی تک منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ لیکن وہ کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکتے، کیونکہ افغانستان میں انہیں کوئی حمایت حاصل نہیں۔ اگست 1998ء میں بن لادن نے افریقہ میں امریکی سفارت خانوں پر جو حملے کرائے ان کے بعد پاکستان سے امریکی کشیدگی بڑھ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آئی ایس آئی نے 1998ء میں بن لادن کا طالبان سے تعارف کرایا تھا اور بعد میں اس سے تعلقات قائم رکھے، لیکن اب بن لادن کو پکڑنے میں امریکہ کی مدد کرنے سے انکار نے پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں۔ امریکہ کا لہجہ سخت ہوتا گیا، ڈپٹی سیکرٹری سٹیٹ سٹروب ٹابوٹ نے کہا کہ لگتا تھا کہ پاکستان کی سیاست میں جو خطرناک کھینچا تانی جاری تھی اور افغانستان میں جو بحران تھا ان کا باہم تعلق تھا۔ طالبان کے منظر پر آنے سے یہ خوف پیدا ہونا منطقی تھا کہ متشدد انتہا پسند اور فرقہ پرستی آس پاس کے ملکوں پر بھی اثر انداز ہوگی اور ان میں پھلنے لگے گی۔ اگر طالبان مسلک پھیلا تو ان ملکوں میں سے سب سے زیادہ پاکستان کو نقصان پہنچے گا۔

امریکی سعودی عرب پر طالبان کی برسرعام حمایت کرنے پر کھلے بندوں حرف گیری کرنے پر تیار نہیں تھے۔ تاہم نجی طور پر وہ سعودی عرب پر زور دیتے آ رہے تھے کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر طالبان سے کہیں کہ وہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں۔ اب تو امریکی کانگرس کے ارکان بھی امریکی پالیسی کے تضادات کا ذکر کرنے لگے ہیں۔ کانگرس کے رکن ڈانا روہر باکر نے اپریل 1999ء میں کہا کہ میں نے یہ سوال کئی بار پوچھا کہ کیا انتظامیہ نے کوئی ڈھکی چھپی پالیسی اپنا رکھی ہے، جس نے طالبان کو طاقت بخشی ہے اور اس دہشت ناک تحریک کو مقتدر رہنے کے قابل بنایا ہے۔ امریکہ کے سعودی عرب اور پاکستان سے گہرے روابط ہیں لیکن بدقسمتی ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان کی رہبری کرتے، وہ پالیسی سازی میں ہماری رہنمائی کرنے لگے ہیں۔

پاکستان کی مشکل یہ ہے کہ امریکہ نے بن لادن کو اس حد تک جن یا بھوت بنا کر دکھایا ہے کہ وہ کئی مسلمانوں کا ہیرو بن گیا ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں امریکی پالیسی کا ایک نکاتی ایجنڈہ ہے کہ بن لادن کو پکڑو، ہونا اصولاً یہ چاہیے تھا کہ افغانستان کی بنیاد پر پیدا ہونے اور پھیلنے والے دہشت گردی اور قیام امن پر توجہ زیادہ مرتکز رہتی۔ امریکہ کی بن لادن پالیسی تو ہے مگر کوئی افغانستان پالیسی نہیں۔ امریکہ نے پہلے طالبان کی حمایت کی اور اب انہیں مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔

امریکہ کی جانب سے طالبان کا استرداد ملک میں تحریک نسواں کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ عورتوں کے حقوق کی علمبردار زیبا شورش شاملے نے افغان عورتوں کے حق میں ایک دستخطی مہم شروع کی اور کلنٹن انتظامیہ کو طالبان کے خلاف سخت رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ عورتوں کی ٹریڈ یونینوں، انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والوں کے گروپوں نے اس مہم میں حصہ لیا ہے۔ کامیڈین جے لینو کی بیوی ماوس لینو نے ایک لاکھ ڈالر کا عطیہ دینے کا اعلان کیا تو اس سے دستخطی مہم کو خاصی تقویت ملی، ماس لینو نے مارچ 1998ء میں کانگرس کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہمارا ملک برسوں مجاہدین کو سوویت یونین کے خلاف لڑنے کے لئے ہتھیار دیتا رہا۔ اب افغانستان میں عورتوں کا جو حال ہے، اس کے حوالے سے امریکہ کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے۔

لینو کی مدد سے عورتوں کی تحریک نے 1999ء میں افغان عورتوں کی عزت افزائی کے لئے آسکرز کے بعد ایک بہت بڑی تقریب منعقد کی، جس میں مشہور اداکاروں نے شرکت کی۔ واشنگٹن پوسٹ نے لکھا کہ طالبان کی عورتوں کے خلاف جنگ ہالی وڈ میں ایک خصوصی تقریب کا سبب بن گئی ہے۔ پہلے تبت کا ذکر ہوتا تھا اب اس کی جگہ افغانستان نے لے لی ہے۔ معروف شخصیتوں کے کلچر میں لینو جیسی معروف شخصیت اور ان کی ہم نواؤں کی آراء کا بہت دور تک اثر ہوا۔ ہلیری کلنٹن نے اپنے مستقبل کے سیاسی کیریر کے لئے عورتوں کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر طالبان کی مذمت میں بیان

کے بعد بیان دینا شروع کر دیئے۔ ہلیری کلنٹن نے 1999ء میں ایک تقریر میں کہا کہ جب عورتوں کو نام نہاد مغربی پولیس، سر پر چادر نہ ہونے یا چلتے میں شور کرنے کی بنا پر وحشیانہ طور پر مارتی پیٹتی ہے تو مقصود صرف جسمانی ایذا پہنچانا اور مارنا نہیں ہوتا، بلکہ عورتوں کی روح کو کچلنا ہوتا ہے۔ امریکہ کی پالیسی نے اپنا چکر پورا کر لیا، پہلے طالبان کو غیر مشروط طور پر قبول کیا گیا اور اب غیر مشروط طور پر انہیں مسترد کر دیا گیا ہے۔

MashalBooks.org

آ قا یا مظلوم

پاکستان کی افغان جنگ

جون 1998ء کے آخری دنوں میں پاکستان کی خزانہ اور امور خارجہ کی وزارتوں میں ایک ہنگامہ برپا تھا، سینئر بیورو کریٹس ایک وزارت سے دوسری وزارت اور وزیراعظم سیکرٹریٹ میں بھاگے پھر رہے تھے۔ انہوں نے فائیلوں سے بھرے بریف کیس اٹھائے ہوئے تھے۔ انہیں وزیروں سے فائیلوں پر دستخط لینے تھے۔ چند روز بعد 30 جون کو 1998ء۔ 1997ء کا مالی سال اختتام کو پہنچا اور نئے مالی سال کا آغاز ہو گیا۔ ہر وزارت رواں مالی سال کے لئے منظور شدہ رقوم خرچ کرنا چاہتی تھی اور آنے والے سال کے لئے وزارت خزانہ سے زیادہ سے زیادہ رقوم منظور کرانے کے لئے کوشاں تھی۔ چند ہفتے پہلے (28 مئی کو) پاکستان نے بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد چھ ایٹمی دھماکے کئے اور مغرب نے دونوں ملکوں پر سزا کے طور پر پابندیاں لگا دیں۔ جس سے پاکستان کے لئے غیر ملکی کرنسی کا بہت بڑا بحران پیدا ہو گیا۔ جس سے 1996ء سے جو مندی چلی آ رہی تھی اور زیادہ گہری ہو گئی۔

بہرحال 28 جون کو وزارت خزانہ نے کابل میں طالبان انتظامیہ کے لئے تنخواہ کے طور پر 300 ملین روپے (6 ملین ڈالر) کی منظوری دی۔ اس سے وزارت خارجہ کو آئندہ چھ ماہ کے لئے افغانستان کے حکمرانوں کو ہر ماہ 50 ملین روپے دینے کی اجازت مل گئی۔ وزارت خزانہ کے لئے یہ رقم اپنے اور دوسری وزارتوں کے بجٹوں میں چھپانا تھی تاکہ 1999ء۔ 1998ء کے بجٹ کے ریکارڈ میں شامل نہ ہو سکے اور بین الاقوامی معطیوں (امداد دینے والے ملکوں) کی نظروں سے بچائی جا سکے، جن کا مطالبہ تھا کہ

حکومت کے اخراجات میں بھاری کمی کی جائے تا کہ بحران کی شکار معیشت کو کسی حد تک سنبھالا دیا جا سکے۔ 1998ء۔ 1997ء میں پاکستان نے طالبان کو امداد کے طور پر تقریباً 30 ملین ڈالر دیئے۔ اس امداد میں 6 لاکھ ٹن گندم، ڈیزل، پٹرولیم اور مٹی کا تیل شامل تھا۔ جس کی جزوی قیمت سعودی عرب نے ادا کی۔ اس کے علاوہ اسلحہ، گولہ بارود، بم، سوویت دور کے فوجی ساز وسامان، ٹینکوں اور بھاری توپوں، ایئر فورس اور ایئر پورٹ کی مشینی تنصیبات کے لئے اسپئیر پارٹس، سڑکوں کی تعمیر، قندھار میں بجلی کی فراہمی اور تنخواہوں کی ادائیگی پر خرچ ہونا تھا۔ پاکستان نے طالبان کو اپنے طور پر یوکرین اور مشرقی یورپ سے اسلحہ اور گولہ بارود خریدنے میں بھی مدد دی۔ تنخواہوں کے لئے دی جانے والی رقوم اس مقصد پر کم اور زیادہ تر اسلحے کی خریداری پر صرف کر دی جاتیں۔ کابل میں طالبان کے افسروں کو مہینوں تک تنخواہ ادا نہیں کی جاتی تھی۔ پاکستان سرکاری طور پر انکار کرتا آیا ہے کہ وہ طالبان کی مدد کرتا رہا ہے۔

امداد کی مہم سال ماضی کی روایت کے طور پر جاری تھی۔ 1980ء کے عشرے میں آئی ایس آئی نے اربوں ڈالر وصول اور صرف کئے۔ یہ امداد مجاہدین کے لئے امریکہ اور عرب ملکوں سے آتی تھی۔ سی آئی اے کی مدد اور حوصلہ افزائی سے یہ رقم آئی ایس آئی کی توسیع کے بھی کام آئی۔ آئی ایس آئی نے سینکڑوں فوجی افسروں کو نہ صرف افغانستان کے احوال و معاملات بلکہ ہندوستان، پاکستان کی تمام فارن انٹیلی جینس، ملکی سیاست، معیشت، ذرائع ابلاغ، ملک میں معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھنے پر مامور کیا۔

سی آئی اے نے آئی ایس آئی کو ملک میں ٹیلی فون کی ہر کال مانیٹر کرنے کے سامان سمیت جدید ترین ٹیکنالوجی فراہم کی۔ آئی ایس آئی صدر ضیاء الحق کی فوجی حکومت کی آنکھیں اور کان بن گئی اور 1989ء تک یہ پاکستان کی سب سے طاقتور سیاسی اور خارجہ پالیسی کی فورس بن گئی تھی اور بعد میں آنے والی سول حکومتوں اور پارلیمنٹ کے

MashalBooks.org

بعض امور میں پالیسی پر اثر انداز ہونے لگی۔ ہندوستان اور افغانستان اس ذیل میں آتے ہیں۔ 1990ء کے عشرے میں آئی ایس آئی نے پاکستان کی افغان پالیسی پر اپنی خصوصی گرفت رکھی۔ تاہم سرد جنگ کے خاتمے کے باعث آئی ایس آئی اپنے فنڈز سے محروم ہوگئی اور پاکستان کے شدید اقتصادی بحران کے سبب سے اس کے خفیہ بجٹ میں بے حد کمی کر دی گئی۔ آئی ایس آئی کے کم ہوتے ہوتے وسائل اب ایک اور جنگ کی طرف منتقل ہو گئے، وہ تھی کشمیری عوام کے قلب و ذہن کو جیتنے کی جنگ، جنہوں نے ہندوستان کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا تھا۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت (1996ء۔ 1993ء) میں وزیر داخلہ جنرل (ر) نصیر اللہ بابر نے طالبان کی حوصلہ افزائی کی، وہ افغان پالیسی کو آئی ایس آئی کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ بے نظیر بھٹو اور نصیر اللہ بابر دونوں آئی ایس آئی کی طاقت اور وسائل کے بارے میں خاصے پریشان تھے، جو اس نے بے نظیر بھٹو کے خلاف ان کے پہلے دور حکومت میں بے اطمینانی پیدا کرنے کے لئے خرچ کئے تھے اور جس کے سبب سے وہ 1990ء میں اقتدار سے محروم ہوگئیں۔ علاوہ بریں آئی ایس آئی کو طالبان کی صلاحیت کے بارے میں یہی شک تھا، وہ ابھی تک گلبدین حکمت یار کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں تھے کہ وہ افغان طلباء کی تحریک کی مالی مدد کرسکتی۔ بابر نے طالبان کی امداد کو سول سانچے میں ڈھال دیا۔ انہوں نے وزارت داخلہ میں افغان ٹریڈ ڈویلپمنٹ سیل قائم کیا، جس کا مقصد وسطی ایشیاء تک تجارتی راستے کھولنے کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کو مربوط کرنا تھا۔ اس کے علاوہ خفیہ فنڈ سے نہیں بلکہ وزارتوں کے مالی وسائل سے طالبان کو نقل و حمل کی سہولتیں فراہم کرنا تھا۔ جنرل بابر نے پاکستان کے محکمہ ٹیلی فون کو حکم دیا کہ وہ طالبان کے لئے ٹیلی فون کا نظام قائم کرے۔ اس طرح وہ پاکستان کے ٹیلی فون نظام کا حصہ بن گیا۔ پاکستان سے کسی بھی مقام سے 081 کے کوڈ کے ساتھ کوئٹہ کی طرح قندھار میں بھی ٹیلی فون کیا جا سکتا تھا۔ پبلک ورکس

ڈیپارٹمنٹ اور واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے سڑکوں کی تعمیر اور قندھار کو بجلی فراہم کرنا شروع کی۔ فرنٹیئر کور نے جو براہ راست جنرل بابر کے تحت تھی، طالبان کے کمانڈروں کے لئے وائرلیس نیٹ ورک قائم کر کے دیا۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (پی آئی اے) اور شہری ہوا بازی کے محکمے نے قندھار ایئر پورٹ، فائٹر جیٹ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کی مرمت کے لئے اپنے کاریگر اور ماہر بھیجے۔ ریڈیو پاکستان نے ریڈیو افغانستان کے لئے جواب ریڈیو شریعت کہلاتا ہے، فنی امداد فراہم کی۔

1995ء میں طالبان نے ہرات پر قبضہ کیا، اس کے بعد پاکستان کی کوششوں میں تیزی آ گئی۔ افغان ٹریڈ ڈویلپمنٹ سیل کے ڈائریکٹر جنرل نے سڑک کے راستے کوئٹہ سے ترکمانستان تک کا سفر کیا۔ ان کے ساتھ شہری ہوا بازی کے محکمے، پاکستان ٹیلی کام، پی آئی اے، پاکستان ریلوے، ریڈیو پاکستان اور نیشنل بینک آف پاکستان کے افسر وزارتوں اور سرکاری کارپوریشنوں نے طالبان کی مدد کے لئے منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے وہ سرمایہ صرف کرنا شروع کیا، جو پاکستان کی معیشت کی ترقی کے لئے مختص کیا گیا تھا۔

طالبان کی مدد کرنے اور انہیں کنٹرول کرنے کی کوششوں کے باوجود وہ کسی کی کٹھ پتلی نہیں، اسلام آباد نے انہیں کنٹرول کرنے کے جتنے بھی جتن کئے، طالبان نے ان کی مزاحمت کی۔ افغان تاریخ شاید ہے کہ کوئی غیر ملکی، افغانوں کو اپنی مرضی کے تابع نہیں کر سکا۔ برطانیہ اور روس نے بعد از خرابی بسیار یہ سبق سیکھا ہے۔ لگتا ہے کہ پاکستان نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا، وہ ابھی تک اپنے ماضی میں ہی رہ رہا ہے۔ سی آئی اے اور سعودی عرب کی مالی امداد نے پاکستان کو جہاد کی سمت اور راستہ متعین کرنے کا اختیار دے دیا ہے۔ علاوہ بریں طالبان کے پاکستان کے سرحدی علاقے میں آبادی پشتونوں سے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات بڑے پختہ ہیں۔ بیس برس کی جنگ اور پاکستان میں مہاجر کی حیثیت سے قیام نے انہیں مضبوط تر بنا دیا ہے۔ طالبان پیدا ہی

پاکستان کے افغان مہاجر کیمپوں میں ہوئے ہیں۔ پاکستانی مدرسوں میں پڑھے اور پاکستان میں رہنے والی مجاہدین کی پارٹیوں سے لڑائی کے طور طریقے سیکھے۔ ان کے خاندان کے افراد کے پاس پاکستانی شناختی کارڈ ہیں۔ طالبان کے پاکستان کی ریاستی اداروں، سیاسی جماعتوں، اسلامی تنظیموں، مدرسوں، منشیات کا ناجائز کاروبار کرنے والوں، تاجروں اور ٹرانسپورٹروں سے تعلقات اس وقت نمایاں ہوئے جب پاکستان میں اقتدار کا ڈھانچہ تقسیم اور انتشار کے عمل سے دوچار تھا۔ یہ صورت طالبان کو راس آئی کیونکہ انہیں آئی سی آئی کی طرح کی کسی ایک فریق سے رابطہ رکھنے یا اس پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ 1980ء کے عشرے میں طالبان کے آئی ایس آئی اور جماعت اسلامی سے خصوصی تعلقات تھے۔ ان کا کسی دوسری سیاسی جماعت یا اقتصادی گروپ سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس طالبان کے کئی پاکستانیوں کے مقابلے میں با اثر پاکستانی گروہوں سے کہیں زیادہ مراسم و روابط تھے۔ طالبان اپنے ان غیر معمولی تعلقات کی بنا پر ایک فریق کو دوسرے کے خلاف استعمال کرنے اور یوں پاکستان میں اپنے اثر و نفوذ کو بڑھاتے چلے گئے۔ بعض اوقات وہ حکومت کی وزارتوں کی مدد سے آئی ایس آئی کے مطالبوں اور ہدایتوں کو ماننے سے انکار کر دیتے، اس ضمن میں ٹرانسپورٹ مافیا بھی ان کی دست گیری کرتی، کبھی کبھار وہ وفاقی حکومت کے خلاف بھی اقدام کر لیتے۔ اس سلسلے میں انہیں بلوچستان اور سرحد کی صوبائی حکومتوں کی شہ حاصل ہوتی۔ طالبان کی تحریک بڑھی تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کون کس کو چلا رہا ہے۔ پاکستان جسے طالبان پر غالب رہنا چاہیے تھا۔ ان کا تابع ہو گیا۔ پاکستان کی سلامتی کے تقاضے، افغانستان کے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے بعض علاقوں پر دعوؤں کی بنا پر تشکیل پاتے رہے۔ 1950ء۔ 1960ء کے عشروں میں دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی تصادم ہوتے رہے۔ افغانستان مصر تھا کہ پاکستان کی پشتون قبائل کی پٹی کے رہنے والوں کو اجازت ملنی چاہیے کہ یہ آزادانہ فیصلہ کر سکیں کہ وہ پاکستان میں رہنا

چاہتے ہیں یا افغانستان کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ ضیاء حکومت کا خیال تھا کہ افغان جہاد کے نتیجے میں یہ مطالبات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ کابل میں پاکستان کی حامی حکومت کے برسر اقتدار آنے سے اس کو ضمانت مل جائے گی۔

فوجی ماہروں کا کہنا تھا کہ اس طرح پاکستان کو اپنے بنیادی دشمن ہندوستان کے خلاف دفاعی نقطہ نظر سے گہرائی مل جائے گی۔ پاکستان کا لمبوترا جغرافیہ، رقبے اور گہرائی کی کمی، اس کی فوج کے لئے طویل جنگ لڑنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ 1990ء کے عشرے میں یہ بھی سوچا گیا کہ دوست افغانستان، کشمیری انتہا پسندوں کو ایک ایسا اڈہ فراہم کر دے گا جہاں وہ تربیت پائیں گے، مالی معاونت حاصل کریں گے اور اسلحہ فراہم کریں گے۔

1992۔93ء میں ہندوستان کے دباؤ کے تحت امریکہ پاکستان کو دہشت گردی کا حامی اور منصرم قرار دینے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ پاکستان کشمیری انتہا پسندوں کو اپنے ہاں سے بھارتی کشمیر میں چھاپہ مار جنگ کے لئے بھیجتا ہے۔ پاکستان نے 1993ء میں بہت سے کشمیری گروپوں کے اڈے، مشرقی افغانستان میں منتقل کر کے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی، پاکستان نے اڈوں کی منتقلی کے لئے پہلے جلال آباد کی شوریٰ کو مالی امداد دی، بعد میں طالبان کو انہیں اپنی حفاظت میں لے لینے کے لئے کہا۔ حکومت نے کشمیری مجاہدین کی مالی امداد اور تربیت بھی نجی شعبے کو سونپ دی۔ اس ضمن میں تمام ذمہ داری مذہبی جماعتوں کو منتقل کر دی۔ 1996ء میں بن لادن سے کہا گیا کہ وہ طالبان سے تعاون کرے۔ خوست میں کشمیری مجاہدوں کے کیمپ بن لادن ہی کی نگرانی میں قائم تھے۔

تدریجاً" کشمیر کا مسئلہ پاکستان کی افغان پالیسی اور طالبان کو اس کی حمایت کا بنیادی محرک بن گیا۔ طالبان نے شاطرانہ چال سے خوب فائدہ اٹھایا اور پاکستان کے دوسرے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک انہوں نے کشمیری

اور پاکستانی مجاہدوں کو اڈے اور کیمپ فراہم کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان ان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ 1998ء میں ملا عمر نے کہا کہ ہم کشمیر میں جہاد کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ بعض افغان کشمیر میں قابض بھارتی فوج کے خلاف لڑ رہے ہیں، لیکن یہ افغان اپنے طور پر وہاں گئے ہیں۔

بہت سوں کے نزدیک فوجی گہرائی کا تصور غلطیوں اور مفروضوں سے مختلف ہے کیونکہ اس کے پیش کرنے والے یہ زمینی حقائق نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ملک کے اندر سیاسی استحکام، ترقی، وسیع تر خواندگی اور ہمسایہ ملکوں سے دوستانہ تعلقات قومی سلامتی کی بہتر ضمانت ہیں۔ بجائے افغانستان کے پہاڑوں میں فوجی گہرائی کے سراب کے پیچھے بھٹکنے کے صدر ضیاء الحق کے دور سے پاکستان کی افغانستان پالیسی کا بنیادی مقصد سٹریٹیجک گہرائی حاصل کرنا بتایا جاتا رہا۔ پاکستانی دانشور اقبال احمد نے لکھا کہ فوجی خیال میں یہ کسی تصور کی نفی ہے۔ سوائے اس کہ کہ ایسی جگہ کا ذکر ہو جس تک رسائی بہت مشکل ہو، جہاں کوئی شکست خوردہ فوج حفاظتی پناہ ڈھونڈ لے، اس کا حاصل ایک ایسا ملک ہو سکتا ہے جو غلط مفروضوں، بے بنیاد نظریوں، ناکام پالیسیوں، بے لچک رویوں اور فرقہ وارانہ تشدد کی آہنی جکڑ بندی میں پھنسا ہوا ہے۔ طالبان کی فتح کسی بہتری کا وسیلہ بننے کی بجائے پاکستان کی سیاسی اور سٹریٹیجک مشکلات میں اضافے کا موجب ہو گی۔

فوج کا خیال تھا کہ طالبان ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لیں گے۔ یہ سرحد جو برطانیہ نے قائم کی تھی پاکستان اور افغانستان کے درمیان متنازعہ چلی آ رہی ہے۔ کسی افغان حکومت نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ فوج نے یہ بھی سوچا کہ طالبان صوبہ سرحد میں نیشنلزم کو ختم کر دیں گے اور پاکستان کے اسلامی انقلاب پسندوں کو باہر جانے کا راستہ دیں گے اور یوں ملک میں اسلامی تحریک کا سدباب ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس طالبان نے ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرنے اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں پر افغانستان کے دعوے ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ طالبان نے پشتون نیشنلزم کو تقویت پہنچائی اور پاکستانی پشتونوں کو متاثر کرنا

شروع کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ طالبان نے پاکستان کے ان انتہا پسند اور متشدد سنی گروپوں کو اسلحہ بھی دیا اور پناہ بھی دی، جنہوں نے پاکستانی شعیوں کو قتل کیا اور پاکستان کو سنی ریاست بنانے اور اسلامی انقلاب کے ذریعے حکمرانوں کو اقتدار سے محروم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اولیور رائے نے 1997ء میں پیش گوئی کی تھی کہ بظاہر فتح یاب پاکستان کو اپنی کامیابی کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی، طالبان کی کامیابی نے پاکستان اور افغانستان کی سرحد عملاً ختم کر دی ہے۔ دونوں طرف کے پشتون قبائیل بنیاد پرستی کی طرف جا رہے ہیں اور منشیات کی ناجائز تجارت میں بیش از بیش ملوث ہو رہے ہیں، وہ خودمختاری حاصل کر رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بنیاد پرست قبائیلی جماعتیں پاکستان کی سرزمین پر قائم ہونے لگی ہیں۔ افغانستان کو عملاً جذب کرنے سے پاکستان میں مرکز گریز رجحانات کو تقویت ملے گی۔ درحقیقت افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ پاکستان میں طالبانی اثرات کو راسخ کرنے کا موجب ہوگا۔ طالبان پاکستان کو سٹرٹیجک گہرائی فراہم نہیں کر رہے، الٹا پاکستان طالبان کو سٹرٹیجک گہرائی فراہم کر رہا ہے۔ پاکستان نہ صرف اپنی سٹرٹیجک خیال اور نظر کا بلکہ اپنی انٹیلی جینس ایجنسیوں کا ہدف بن رہا ہے۔

آئی ایس آئی کی افغان جہاد کی تنظیم اس صورت میں ممکن تھی کہ ملک میں فوجی حکومت تھی اور باہر سے بے تحاشا مالی امداد آ رہی تھی۔ ایسے میں آئی ایس آئی کی ملک میں سیاسی مخالفت کو دبانا ممکن تھا۔ ضیاء الحق اور آئی ایس آئی کے پاس افغان پالیسی بنانے اور اسے نافذ کرنے کی طاقت تھی۔ کوئی انٹیلی جینس ایجنسی حتیٰ کہ سی آئی اے بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے آئی ایس آئی کو مقصد کی یکتائی بھی میسر آئی اور اسے پورا کرنے کی طاقت بھی، ایسے میں آئی ایس آئی کو کسی آزاد اور طاقتور لابی یا سیاسی مخالفوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جیسا کہ طالبان کے دور میں انہیں کئی پاکستانی فریقوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو آزادی کے ساتھ طالبان کی مدد کرتے تھے اور جن کا اپنا لائحہ عمل تھا۔ آئی ایس آئی افغان پالیسی پر بھی عمل درآمد کرتی اور اپنے دوسرے فرائض بھی ادا کرتی، اس بے پناہ

مصروفیت کی وجہ سے ٹھٹھک کر سوچنے اور روایت پسندوں کی مخالفت برداشت کرنے، بدلتے ہوئے حالات اور ہر لحظہ تغیر پذیر جغرافیائی اور سیاسی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے جس فکر و نظر اور لچک کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے پاس اس کی گنجائش ہی نہیں تھی، آئی ایس آئی اپنے ہی سخت اور بے لچک رویے کی اسیر ہو کر رہ گئی تھی، حتیٰ کہ طالبان کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہونے لگی تھی۔

آئی ایس آئی کے افغانستان میں جتنے بھی دست و بازو تھے سب کے سب پشتون تھے، ان میں سے اکثر اسلامی بنیاد پرستی کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ ان پشتون افسروں سے پہلے حکمت یار اور پھر طالبان کے ساتھ کام کرتے ہوئے کچھ اپنے مقاصد متعین کر لئے۔ جن میں پشتونوں کو اقتدار دلانا افغانستان میں نسلی اقلیتوں اور اعتدال پسند اسلام کی قیمت پر سخت گیر اسلامی ضابطے نافذ کرنا شامل تھا۔

آئی ایس آئی کے ایک ریٹائرڈ افسر کے مطابق یہ افسر طالبان سے زیادہ طالبان بن گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طالبان مخالف اتحاد اور پائپ لائن سے منسلک سیاست کا جو تجزیہ کرتے، وہ ناقص ہوتا۔ اس سے معروضی حقائق کو ملحوظ رکھنے کی بجائے جامد، بے لچک، نظری مفروضوں پر انحصار کیا جاتا۔ بہرحال اس وقت تک آئی ایس آئی نے اتنی طاقت حاصل کر لی تھی کہ حکومت وقت اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کر سکتی تھی اور نہ آرمی چیف آف سٹاف اس کی تطہیر کر سکتا تھا۔

جب طالبان منظر پر آئے تو آئی ایس آئی کے نزدیک ان کے آگے بڑھنے کی صلاحیت مشکوک تھی، جب حکمت یار کو کابل پر قبضہ کرنے میں ناکامی ہوئی اور سرمایہ بھی کم میسر آنے لگا تو آئی ایس آئی نے پسپائی اختیار کی۔ اس سے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو طالبان کے لئے اپنے طور پر امداد کا بندوبست کرنے کا موقعہ میسر آ گیا۔ 1995ء کے دوران آئی ایس آئی نے طالبان کے لئے امداد کے مسئلے پر بحث جاری رکھی۔ اس کا مرکز افغانستان میں پشتون اسلامی فیلڈ افسر تھے، جو طالبان کو زیادہ سے زیادہ امداد فراہم

کرنا چاہتے تھے۔ یہ افسر طویل المعیاد سٹرٹیجک منصوبہ بندی میں مصروف تھے، ان کی کوشش تھی کہ پاکستان کی طرف سے کم سے کم حمایت سامنے آئے تاکہ وسط ایشیاء کی ریاستوں اور ایران سے تعلقات خراب نہ ہوں۔ 1995ء کے موسم گرما تک فوج میں پشتونوں اور آئی ایس آئی نے طالبان کی پشت پناہی کرنے کا عزم کرلیا۔ بالخصوص جبکہ صدر برہان الدین نے پاکستان کے مخالف روس، ایران اور ہندوستان سے مدد طلب کر لی۔

اس وقت تک آئی ایس آئی کا تمام دوسرے پاکستانی حلیفوں سے جن سے طالبان کا گہرا رابطہ تھا، مقابلہ شروع ہو گیا۔ ان میں انتہا پسند ملا اور منشیات کا کاروبار کرنے والے شامل تھے۔ آئی ایس آئی حکومت اور ان حلقوں کے درمیان تند و تیز مقابلے نے افغان کے بارے میں پاکستان کے فیصلہ کن عمل کو مزید نقصان پہنچایا۔ پاکستان کی وزارت خارجہ اس کنفوژن کے باعث اس درجہ کمزور ہو گئی تھی کہ اس کا افغان پالیسی سے عملاً کوئی تعلق ہی نہ رہا، وہ ہر ہمسایہ ملک، روس، ایران اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے خراب ہوتے ہوئے سفارتی تعلقات کا مداوا کرنے کی اہل نہ تھی، ان ملکوں کا پاکستان پر الزام تھا کہ یہ علاقے میں عدم استحکام پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ آئی ایس آئی کے یکے بعد دیگرے آنے والے سربراہ نے اس تنقید اور مخالفت کو ختم کرانے کے لئے ماسکو، تران، تاشقند اور اشک آباد کے خفیہ دورے کئے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نواز شریف کی نئی منتخب حکومت پر بین الاقوامی نکتہ چینی ہوئی تو آئی ایس آئی طالبان کی زیادہ مدد کرنے سے گریز کرنے لگی۔ مئی 1997ء میں جب طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو آئی ایس آئی کا اندازہ تھا کہ طالبان حکومت کو تسلیم کرنے سے مخالف ہمسائے طالبان سے معاملہ کرنے لگیں گے اور طالبان سے ایسے تعلقات بہتر بنانے کے لئے پاکستان کی حمایت کی ضرورت محسوس کرنے لگیں گے۔ یہ ایک بھاری جواء تھا جو پاکستان کی طرف سے طالبان کو قبل از وقت

تسلیم کرنے پر بری طرح ناکام ہو گیا۔ طالبان اس وقت مزار شریف سے پیچھے دھکیل دیئے گئے تھے۔

پاکستان اپنے ناقدوں پر بشمول اقوام متحدہ کے بری طرح برسا، اقوام متحدہ افغان دھڑوں کو بیرونی امداد دینے والوں پر کھلے عام تنقید کرنے لگے تھی۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان پر طرفداری کرنے کا الزام لگایا۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر احمد کمال نے جنوری 1998ء میں کہا کہ اقوام متحدہ نے افغانستان کے تعلق میں اپنا اثر تدریجا" کم کر دیا ہے اور غیر جانبدار ثالث کی حیثیت کھو دی ہے۔ بعد میں احمد کمال نے اسلام آباد میں پاکستانی سفیروں کی کانفرنس میں کہا کہ افغانستان کے معاملے میں پاکستان تنہا اور الگ تھلگ نہیں ہوا۔ بلکہ باقی ماندہ دنیا پاکستان سے الگ ہو گئی ہے۔ وقت آئے گا جب اسے طالبان کے بارے میں پاکستان کی پوزیشن تسلیم کرنا پڑے گی۔ پاکستان کڑی بین الاقوامی تنقید کے باوصف طالبان کی پالیسیوں کی حمایت کر رہا تھا۔ یہ حقیقت بھلا دی گئی تھی کہ ملک کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ افغانستان کے ساتھ دوطرفہ سمگلنگ، سب سے بڑے نقصان کا موجب تھی۔ اس ناجائز تجارت سے جو وسطی ایشیاء، ایران اور خلیجی ریاستوں تک پھیل گئی تھی، ان سب ملکوں کی خاص طور پر پاکستان کی آمدنی میں کمی کا موجب تھی۔ سمگل ہو کر آنے والی اشیائے صرف کے باعث ملکی صنعت معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ افغانستان سے تجارتی راہداری سمگلنگ کا اتنا بڑا وسیلہ بن گئی تھی کہ پوری دنیا میں اس کی نظیر شاید ہی کہیں اور ملتی ہو۔ اس ناجائز تجارت نے طالبان، پاکستانی سمگلروں، ٹرانسپورٹروں، منشیات فروشوں، بیورو کریٹوں، سیاست دانوں، پولیس اور فوجی افسروں کا ملغوبہ سا نکال دیا تھا۔ یہ تجارت ہمسایہ ملکوں کے لئے نقصان رساں مگر طالبان کی آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ بن گئی۔

بلوچستان میں چمن میں اور افغانستان میں سپن بالڈک دو سرحدی چوکیاں ہیں۔ جہاں سے سمگلنگ ہوتی دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک دن میں 300 ٹرک یہاں سے گزرتے

ہیں۔ ٹرک ڈرائیور، پاکستانی کسٹم افسر اور طالبان آپس میں دوستانہ فضا میں گھل مل جاتے ہیں اور قہوہ پیتے رہتے ہیں۔ ادھر ٹرکوں کی لمبی قطار لگی ہوتی ہے، ہر کوئی یہ بات جانتا ہے، یہاں بیٹھے ڈرائیور ایسی ایسی کہانیاں سنتے ہیں جنہیں سن کر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے افسروں کے بال کھڑے ہو جائیں، کئی بڑے مرسیڈیز اور بیڈفورڈ ٹرک چوروں کے ہیں اور ان پر جعلی نمبر پلیٹیں بھی لگائی گئی ہیں۔ ان میں جو سامان رکھا ہوتا ہے، اس کا کوئی رسید پرچہ نہیں ہوتا۔ ڈرائیور جعلی ڈرائیونگ لائسنسوں پر روٹ پرمٹوں اور پاسپورٹوں کے بغیر چھ بین الاقوامی سرحدیں عبور کر لیتے ہیں۔ سامان میں انگلش، جاپانی، چینی اور امریکی سامان، آلات اور پرزے، پاکستانی گندم، چینی، مشرقی، یورپی کلاشنکوفیں اور ایرانی پٹرولیم تک دنیا جہان کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان پر نہ کوئی کسٹم ادا کیا جاتا ہے اور نہ سیلز ٹیکس۔ اس آزاد تجارت کو افغانستان کی خانہ جنگی کے سبب سے فروغ حاصل ہوا ہے۔ منشیات کا کاروبار پاکستانی، ایرانی اور وسط ایشیائی ریاستوں کے اداروں کی ٹوٹ پھوٹ اور کرپشن سے اس سرحدی تجارت کو بہت بڑھاوا ملا ہے۔ ایک محرک اس علاقے میں چیزوں کی مانگ اور طلب ہے۔ پاکستانی اور افغان ٹرانسپورٹ اور ڈرگ مافیا نے مل کر اس طلب کو بڑھا دیا ہے۔ پاکستان کے سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے ایک افسر نے 1995ء کے اوائل میں مجھے بتایا کہ اب یہ کسی کے کنٹرول میں نہیں۔ طالبان کو سرمایہ ٹرانسپورٹر دیتے ہیں تاکہ سڑکیں کھلیں اور سمگلنگ میں آسانی ہو جائے، یہی مافیا افغانستان اور پاکستان میں حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کا موجب ہے۔ کسٹم ڈیوٹی میں کمی کے باعث اس سال پاکستان کی آمدنی میں 30 فیصد کمی ہونے کا خدشہ ہے۔

ان علاقوں میں تجارت ہمیشہ ہی پرخطر رہی ہے۔ شاہراہ ریشم جو ازمنہ وسطیٰ میں چین کو یورپ سے ملاتی تھی، افغانستان اور وسطی ایشیاء سے ہو کر گزرتی تھی، وہی قبائیلی اور خانہ بدوش اسے چلاتے تھے جو آج ٹرک ڈرائیور ہیں۔ شاہراہ ریشم نے یورپ کو عرب فتوحات ہی کی طرح متاثر کیا۔ تجارتی کاروان آرام و آسائش کا سامان ہی نہیں لاتے

تھے،نظریات، مذہب، نئے ہتھیار اور سائنسی انکشافات کی منتقلی کا بھی وسیلہ تھے۔ ایک کاروان پانچ چھ ہزار اونٹوں پر مشتمل ہوتا ہوگا۔ یہ جتنا سامان لاتا وہ ایک بڑے تجارتی بحری جہاز میں آ سکتا ہوگا۔ کاروان کا ایک قافلہ سالار ہوتا تھا۔ کاروان اس کی سربراہی میں بالکل فوج کی طرح چلتا، سالار کے علاوہ ایک جنرل سٹاف ہوتا، کارواں کے سخت اصول اور ضابطے ہوتے، راستے میں چوکیاں ہوتیں، جہاں قافلے پڑاؤ کرتے۔ لوٹ مار کرنے، شب خون مارنے والے خانہ بدوشوں سے بچنے کے لئے باقاعدہ حفاظتی انتظامات ہوتے۔ 2000 برس میں اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آج کے سمگلر بھی اسی نوع کے فوجی طرز کے حفاظتی انتظامات کرتے ہیں، بس اتنا فرق ہے کہ اونٹوں کی جگہ ٹرکوں نے لے لی ہے۔

1950ء میں بین الاقوامی معاہدوں کے تحت پاکستان نے خشکی میں گھرے ہوئے افغانستان کو کراچی کی بندرگاہ کے ذریعے ڈیوٹی کے بغیر درآمدات کرنے کی اجازت دی۔ ٹرکوں والے مقفل کنٹینر کراچی سے لیتے اور افغانستان لے جاتے۔ کچھ چیزیں کابل میں بیچتے اور باقی کا مال لے کر واپس پاکستان آ جاتے اور یہاں کی مارکیٹوں میں فروخت کر دیتے۔ یہ محدود لیکن فروغ پذیر تجارت تھی۔ اس سے پاکستانیوں کو سستی، ڈیوٹی فری اشیاء، خاص طور پر جاپانی برقی آلات اور سامان مل جاتا۔ 1980ء میں افغانستان کے ان شہروں کو بھی یہ سامان ملنے لگا جہاں کمیونسٹوں کا کنٹرول تھا۔ 1992ء میں جب کابل فتح ہوا تو اس وقت وسط ایشیاء میں نئی مارکیٹیں بن گئیں۔ افغان مہاجروں کی واپسی کے ساتھ خوراک ایندھن اور عمارتی سامان کی ضرورت پیدا ہوگئی۔ جس کی نقل وحمل کے لئے ٹرک درکار تھے۔ یوں ایک بار پھر ٹرانسپورٹ مافیا کی بن آئی، لیکن افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہو جانے سے ٹرانسپورٹر سخت مایوس ہوئے، ان کے ٹرکوں کو کسی ایک راستے سے گزرنے کے لئے درجنوں جگہ جنگی سرداروں کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔ پشاور کا ٹرانسپورٹ مافیا کابل کے گرد مسلسل جنگ کے باوجود پاکستان، شمالی افغانستان

اور ازبکستان کے درمیان تجارت کرتا رہا۔ کوئٹہ کا ٹرانسپورٹ مافیا مشکل میں تھا کیونکہ قندھار کے جنگی سرداروں نے پاکستان سے آنے والی شاہراہ پر درجنوں مقامات پر ٹول ٹیکس لینے کے لئے زنجیریں باندھ رکھی تھیں۔ کوئٹہ میں مقیم ٹرانسپورٹ مافیا ایران اور ترکمانستان تک محفوظ راستے کھولنے میں دلچسپی رکھتا تھا، بھٹو حکومت بھی اسی پالیسی پر کاربند تھی۔

طالبان کا کوئٹہ کے مافیا سے اچھے تعلقات تھے۔ اس نے سب سے پہلے طالبان کو مالی امداد دی تھی۔ ابتداء میں کوئٹہ مافیا طالبان کو ماہانہ ادائیگی کرتا تھا، لیکن جیسے جیسے طالبان نے مغرب کی جانب بڑھنا شروع کیا، انہوں نے زیادہ سرمایہ طلب کرنا شروع کیا۔ اپریل 1995ء میں جن لوگوں سے میری بات ہوئی انہوں نے بتایا کہ طالبان نے صرف ایک دن میں کوئٹہ کے ٹرانسپورٹروں سے 6 ملین روپے (13000 ڈالر) وصول کئے، اس سے دگنی رقم انہوں نے ہرات پر پہلے حملے کی تیاری پر کوئٹہ میں وصولی کی۔ یہ تمام عطیات اس کسٹم ڈیوٹی سے الگ تھے جو طالبان، پاکستان سے افغانستان میں داخل ہونے والے ٹرکوں سے ٹول ٹیکس کے طور پر وصول کرتے تھے۔ یہ طالبان کی سرکاری آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ بن گیا۔ راستے محفوظ ہو جانے سے سمگلنگ کا علاقہ ڈرامائی طور پر بڑھ گیا۔ ٹرکوں کے قافلے کوئٹہ سے چلتے اور قندھار پہنچتے۔ پھر جنوب کی جانب ایران کا رخ کرتے، مغرب کی طرف ترکمانستان جاتے اور پھر وسط ایشیائی ریاستوں تک پہنچتے۔ حتیٰ کہ روس بھی ان کی رسائی میں آتا۔

جلد ہی کوئٹہ کے ٹرانسپورٹ مافیا نے طالبان پر زور دینا شروع کیا کہ وہ ہرات پر قبضہ کریں تاکہ ترکمانستان تک کی سڑک پر ان کا کنٹرول ہو جائے۔ آئی ایس آئی نے شروع میں طالبان کو مشورہ دیا کہ وہ ہرات پر حملہ نہ کریں لیکن کوئٹہ مافیا کے طالبان پر زیادہ اثر تھا۔ 1996ء میں طالبان سے کہا کہ وہ کابل پر قبضہ کر کے شمال کی جانب کا راستہ کھول دیں۔ کابل فتح کرنے کے بعد طالبان نے پشاور سے کابل جانے والے ہر

ٹرک پر 6000 روپے ٹیکس لگا دیا۔ اس سے پہلے ایک ٹرک پر تیس ہزار سے پچاس ہزار روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ ٹرانسپورٹ مافیا نے طالبان کے لیڈروں کو ٹرک خریدنے اور اپنے رشتہ داروں کو اس پر آمادہ کر کے، کاروبار میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ ڈرگ مافیا نے ہیروئن کی نقل وحمل پر زکوٰۃ دینے کی پیش کش کی، جو طالبان کی آمدنی کا اہم وسیلہ بن گئی۔

اس تجارت کا سب سے بڑا نقصان پاکستان کو پہنچا۔ سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے اندازہ لگایا کہ پاکستان کو 1993۔1992ء میں کسٹمز کی مد میں 5ء3 بلین روپے 1994ء۔1993ء میں گیارہ بلین روپے، 1995۔1994ء میں 20 بلین روپے 1998۔1997ء میں 30 بلین روپے کا خسارہ ہوا۔ ہر سال کا بڑھتا ہوا خسارہ طالبان کی توسیع کا نتیجہ تھا۔ اے ٹی ٹی معاہدے کے سبب سے پاکستان میں کرپشن میں بے اندازہ اضافہ ہو گیا۔ پاکستان کی سبھی ایجنسیاں کسٹمز، کسٹمز انٹیلی جینس، سی بی آر، فرنٹیئر کانسٹیبلری اور قبائلی علاقے کی انتظامیہ سبھی رشوت لینے لگیں۔ افغانستان کی سرحد پر کسٹمز کی اسامیاں حاصل کرنے کے لئے سینئر بیوروکریٹس کو بھاری رشوت دی جانے لگی۔ رشوت کو سرمایہ کاری سمجھا جاتا، رشوت دے کر ملازمت حاصل کرنے والے خود رشوت لینے لگتے، یہ لعنت بلوچستان اور صوبہ سرحد میں سیاست دانوں اور وزیروں تک پھیل گئی۔ ان دونوں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنر ٹرکوں کے چلنے اور گندم افغانستان کو برآمد کرنے کے لئے پرمٹ جاری کرتے۔ 1995ء اور دوبارہ 196ء میں سینئر فوجی افسروں نے مجھ سے شکایت کی کہ دونوں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنروں میں روٹ پرمٹ جاری کرنے میں جو مقابلہ ہو رہا ہے وہ رشوت کا بڑا ذریعہ ہے، جس نے پوری انتظامی مشینری کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ رشوت افغانستان سے متعلق آئی ایس آئی کی پالیسی میں مداخلت ہے اور یوں پاکستان کے سیاست دانوں پر طالبان کے وسیع تر کنٹرول کا سبب بنتی ہے۔

MashalBooks.org

مافیا نے اپنی تجارت بڑھانے کے ساتھ افغانستان کو تہی دامن کر دیا۔ افغانستان میں لاکھوں ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے درخت کاٹ دیئے اور پاکستانی مارکیٹ میں بھیج دیئے۔ دیہی علاقہ درختوں سے خالی ہو گیا۔ وہاں کسی نے دوبارہ درخت نہیں لگائے۔ فیکٹریاں، گاڑیاں، بجلی اور گلیوں کے کھمبے توڑ ڈالے گئے، اس طرح جو لوہا اور سکریپ ملا وہ پاکستان کی سٹیل ملوں کے پاس بیچ دیا گیا۔ کراچی اور دوسرے شہروں میں موٹر گاڑیوں کی چوری کی وارداتیں عام ہونے لگیں۔ کار چور ان گاڑیوں کو افغانستان منتقل کر دیتے، وہاں سے افغانستان اور پاکستانی گاہکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے۔ 1998 ـ 1992ء میں صرف کراچی سے 65 ہزار موٹر گاڑیاں چوری کی گئیں۔ یہ پہلے افغانستان بھیجی گئیں، وہاں سے نمبر پلیٹ وغیرہ بدل کر دوبارہ پاکستان میں لا کر بیچ دی گئیں۔

ٹرانسپورٹ مافیا، دوبئی، شارجہ اور دوسری خلیجی ریاستوں سے برقی آلات اور سامان سمگل کرتا ہے اور افغانستان کی قومی ایئر لائنز کے ذریعے خشک میوہ اور لکڑی میں ہیروئن چھپا کر ان ریاستوں کو سمگل کر دی جاتی ہے۔ قندھار، کابل اور جلال آباد سے پرواز میں براہ راست خلیجی ریاستوں کے لئے جاتیں، اس حوالے سے طالبان جیٹ ایج میں داخل ہو گئے اور شاہراہ ریشم کے ذریعے ہونے والی سمگلنگ کو دور جدید کی تجارتی بنیاد مل گئی۔ افغانستان کے لئے درآمدات، پاکستان کے کالے دھن میں اضافے کا وسیلہ بن گئیں۔ 1973ء میں کالے دھن کی مالیت کا اندازہ 15 بلین روپے کی لگ بھگ تھا جو 1996ء میں 1115 بلین روپے تک جا پہنچا۔ مجموعی قومی پیداوار میں اس کا حصہ 20 فیصد سے بڑھ کر 51 فیصد ہو گیا۔ اسی عرصے میں ٹیکس اور کسٹمز ڈیوٹی کی نادہندگی 195 بلین روپے سے بڑھ کر 152 بلین روپے ہو گئی۔ اس اضافے کی سالانہ اوسط 88 بلین روپے تھی۔ سمگلنگ کے ذریعے ہونے والی تجارت سے 1993ء میں پاکستان کی زیر زمین معیشت کو 100 بلین روپے حاصل ہوئے۔ 1998ء میں یہ رقم بڑھ کر 300

بلین روپے تک پہنچ گئی۔ یہ رقم ملک کی مجموعی درآمدات پر اٹھنے والے مصارف (10 بلین ڈالر) کے 30 فیصد کے برابر ہے، یا اسے 1999-1998ء کے لئے 300 بلین روپے کی مجموعی مالیاتی وصولی کے مقررہ ہدف کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان سالانہ 50 بلین روپے کی منشیات کی سمگلنگ ہوتی ہے۔صوبہ سرحد میں باڑہ مارکیٹیں، سمگل شدہ بیرونی مال سے بھری پڑی ہیں۔اس سے پاکستانی صنعت کو بے پناہ نقصان ہو رہا ہے۔ پاکستان نے جو خود ایئر کنڈیشنز بنا رہا تھا، 1994ء میں صرف 30 ملین روپے کے بیرونی ایئر کنڈیشنز درآمد کئے۔ افغانستان نے جہاں برائے نام بجلی ہے، ایک بلین روپے کے ایئر کنڈیشنز درآمد ہوئے، جو سب کے سب پاکستان کی باڑہ مارکیٹوں میں پہنچ گئے اور مقامی صنعت کاروں کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے پر مجبور کرنے کا موجب بن گئے۔ ڈیوٹی فری جاپانی ایئر کنڈیشنز کی قیمت پاکستان میں بننے والے ایئر کنڈیشنز کے برابر تھی۔ اس لئے لوگ جاپانی ایئر کنڈیشنز ہی خریدتے۔ پشاور کے باہر حیات آباد کی باڑہ مارکیٹ میں دکانداروں نے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے غیر ملکی مصنوعات کے نام کے ہی بورڈ لگا رکھے ہیں۔مثال کے طور پر برطانیہ کی مارکس اینڈ سپنسر جاپان کی سونی یہ چیزیں اصل اور ڈیوٹی فری ہونے کے باعث مقبول ہیں۔افغانستان کے لئے راہداری تجارت نے صوبہ سرحد کی معیشت تباہ کر دی ہے اور لوگوں نے جائز کمائی کا تصور ترک کر دیا ہے اور سمگلنگ کو اپنا جائز حق تسلیم کرنے لگے ہیں۔ یہ بات سرحد کے وزیر اعلیٰ مہتاب احمد خان نے 1998ء میں کہی تھی۔

اس طرح کی معیشت کی تباہی اور رشوت کا فروغ ایران میں بھی جاری تھا۔ٹرانسپورٹ مافیا کی طرف سے افغانستان اور پاکستان کے لئے ایران سے تیل اور دوسری اشیاء کی سمگلنگ ایران کے مالی نقصان، مقامی صنعت کی تباہی اور اعلیٰ ترین حکومتی سطح پر رشوت پھیلانے کا سبب بنی۔ ایرانی حکام نے نجی طور پر تسلیم کیا کہ بنیاد یا سرکاری اہتمام میں

قائم صنعتی ادارے اور انقلابی گارڈز (پاسداران) پٹرولیم کی مصنوعات کی سمگلنگ سے فوائد حاصل کر رہے ہیں۔ ان مصنوعات پر ایران کے مقابلے میں افغانستان میں 2000 سے 3000 فیصد زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔ افغان جنگی سرداروں کو جنگی مشینری کو متحرک رکھنے کے لئے بہت بڑی مقدار میں تیل درکار ہے، جلد ہی بلوچستان میں پٹرول پمپوں کے مالکوں نے مافیا کے ذریعے پاکستانی کمپنیوں سے بالا بالا اور کسٹمز ڈیوٹیوں سے آزاد، سستا ایرانی تیل حاصل کرنا شروع کر دیا۔

پاکستان نے افغانستان کو تجارتی راہداری کی جو سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں، ان پر قدغن لگانے کی کئی بار نیم دلانہ کوششیں کی گئیں اور چاہا کہ باقی سامان کی درآمد پر پابندی لگا دی جائے، لیکن طالبان نے نئی شرائط ماننے سے ہر بار انکار کیا اور مافیا نے وزراء پر دباؤ ڈالا، جس کے باعث حکومت کو پسپائیت اختیار کرنا پڑی۔ اسلام آباد میں کوئی حلقہ ایسا نہیں تھا جو پاکستان کی معیشت کو پہنچنے والے نقصان کی طرف انگلی اٹھا سکتا یا طالبان کو شرائط ماننے پر مجبور کر سکتا۔ آئی ایس آئی طالبان کے انکار کی بنا پر ان کی حمایت سے دست کش ہونے کی دھمکی دینے پر بھی تیار نہیں تھی۔ پاکستانی اور غیر ملکی سرمایہ کار ششدر تھے کہ حکومت ان کے مفاد کو خاطر میں لانے کی بجائے طالبان کے مفاد کو مقدم جانتی ہے اور پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچانے پر تل گئی ہے، اس طرح کہ اس نے پاکستان کا ریاستی سرمایہ طالبان کو منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ایک طرح سے غیر سرکاری امداد تھی، جس سے طالبان کو فائدہ پہنچا اور وہ پاکستانی جو طالبان کے معاملات میں وکیل تھے، امیر کبیر بن گئے۔ انہوں نے ایک نہایت ہی طاقتور حلقہ قائم کر لیا، جو طالبان کے لئے پاکستان کی امداد جاری رکھنے پر مصر تھا۔

افغانستان کے حالات اور ان کے اثرات نے پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کر دیا۔ 1980ء کے عشرے میں افغانستان پر سوویت حملے کے نتیجے میں ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر پیدا ہوا، جس نے پاکستان کی معیشت اور سیاست کو شدید نقصان پہنچایا۔ امریکی

مورخ پال کینڈی نے لکھا، افغان جنگ میں اس سال تک سرگرم عملی حصہ لینے کی وجہ سے پاکستان کی معاشرتی ہیئت میں تبدیلی آ گئی ہے کہ کسی بھی حکومت کے لئے موثر طور پر کاروبار چلانا بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں اور زیادہ دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ جدید ترین ہتھیاروں کی بہتات ہو گئی ہے۔ تشدد اور منشیات کے بے تحاشہ پھیلاؤ نے اس میں وحشت کا عنصر نمایاں کر دیا ہے۔ 1990ء کے عشرے کے اواخر تک اس کے اثرات اور نمایاں ہوئے اور ریاستی اداروں کے اثر و افادیت کو محدود کرنے کا سبب بنے، افغانستان سے تجارتی راہداری، پاکستانی معیشت کو اپاہج کرنے لگی، اس کی خارجہ پالیسی اسے مغرب اور قریبی ہمسائیوں سے الگ تھلگ کرنے کی محرک بنی۔ امن و قانون تباہ ہو گیا۔ اسلامی انتہا پسند اپنے قاعدوں اور ضابطوں پر عمل کرنے لگے۔ نئ شیعہ مخالف جماعتیں سامنے آ گئی، جسے طالبان کی حمایت اور پناہ حاصل تھی۔ 1996ء سے 1999ء کے درمیان سینکڑوں شیعہ ہلاک کر دیئے گئے۔ فرقہ وارانہ خون ریزی پاکستان کے اکثریتی سنیوں اور اقلیتی شیعوں کے درمیان مخالف بڑھانے کا سبب بننے لگی۔ 80 ہزار پاکستانی انتہا پسند جو 1994ء سے طالبان کے ہمراہ لڑتے رہے تھے اور جنہوں نے طالبان کی تربیت بھی کی تھی، وہ انتہا پسندوں کا بازو شمشیرزن تھے، وہ پاکستان میں طالبان کی طرز کا انقلاب لانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

صوبہ سرحد اور بلوچستان کی پشتون پٹی کے قبائیلی گروپ، طالبان کی نقل میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ 1995ء سے مولانا صوفی محمد نے باجوڑ ایجنسی میں اپنی تنظیم نفاذ شریعت محمدی کی رہنمائی کرتے ہوئے شریعت کے نفاذ کے لئے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سینکڑوں افغان اور پاکستانی طالبان اس بغاوت میں شامل ہو گئے، لیکن فوج نے انہیں کچل دیا۔ تنظیم کے لیڈروں نے افغنستان میں طالبان کے ہاں پناہ لے لی۔ دسمبر 1998ء میں تحریک طلباء نے اورکنٹرئی ایجنسی میں دو ہزار افراد کی موجودگی میں قانونی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک قاتل کو برسر عام موت کی سزا دے دی۔

انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ پشتون پٹی میں طالبان طرز کا انصاف نافذ کریں گے۔ انہوں نے طالبان کی تقلید میں ٹی وی، موسیقی اور ویڈیو پر پابندی لگا دی۔ طالبان کے حامی دوسرے پشتون گروہ کوئٹہ میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سینما گھروں کو آگ لگا دی۔ ویڈیو کی دکانوں کے مالکوں کو گولی مار دی، سٹیلائیٹ ڈشیں توڑ دیں اور عورتوں کو گلی کوچوں سے نکال کر گھروں میں بند کر دیا۔

1998ء میں مزار شریف سے طالبان کا قبضہ ہونے کے بعد پاکستان نے اسے فتح سے تعبیر کیا اور دنیا سے مطالبہ کیا کہ طالبان کی تحریک کو تسلیم کر لیا جائے، جس کا 80 فیصد افغانستان پر کنٹرول ہو گیا ہے۔ پاکستان کے فوجی اور سویلین لیڈروں کا اصرار تھا کہ طالبان کی کامیابی، پاکستان کی کامیابی ہے اور ان کی پالیسی صحیح اور غیر متبدل ہے۔ پاکستان کا خیال تھا کہ افغانستان میں ایران کا اثر ختم ہو جائے گا۔ روس اور وسطی ایشیاء کی ریاستیں طالبان سے پاکستان کے ذریعے ہی معاملہ کریں گی اور مغرب کو بھی اسلام کی طالبان والی تشریح قبول کرنا پڑے گی۔

اگرچہ عام لوگوں کو پاکستان کے طالبان کے رنگ میں رنگے جانے کے امکان پر تشویش بڑھتی جا رہی تھی، لیکن لیڈروں نے اندرون ملک پھیلتے ہوئے انتشار کو نظر انداز کئے رکھا۔ باہر کے لوگوں کو پاکستان، افغانستان، سوڈان اور صومالیہ کی طرح ناکام یا ناکام ہوتا ہوا ملک دکھائی دینے لگا۔ ایک ناکام ریاست کا مطلب مرتی ہوئی ریاست نہیں۔ اگرچہ اس طرح ہو بھی سکتا ہے۔ ایک ناکام ریاست وہ ہے جس میں دیوالیہ سیاسی قیادت کی پالیسیاں بار بار ناکام ہوتی رہیں اور وہ اسے ان پر نظر ثانی کرنے کی معقول وجہ نہ سمجھیں۔ پاکستان کے اہل اقتدار نے افغانستان سے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کا برائے نام تاثر بھی نہیں دیا۔ جنرل ضیاء نے ایک مغل شہنشاہ کی طرح کافر ہندوستان، شیعہ ایران اور مسیحی روس کے مابین ایک سنی خلا قائم کرنے کا خواب دیکھا، جنرل ضیاء کو یقین تھا کہ افغان مجاہدین کا پیغام وسطی ایشیاء میں پھیلے گا۔ اسلام کا

احیاء ہوگا اور پاکستان کی سربراہی میں قوموں کا اسلامی بلاک قائم ہوگا۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ ان کا ورثہ پاکستان کا کیا حلیہ بنائے گا۔

MashalBooks.org

ایران اور سعودی عرب

1999ء کے موسم بہار میں تہران میں تبدیلی اور اعادے کا احساس بیدار ہوا۔ اسلامی انقلاب کے بعد 20 برس تک تہران کی عورتیں سر سے پاؤں تک کالے حجاب میں حکما" لپٹی رہیں۔ اب اچانک حجاب کے نیچے سے چیتے کی کھال سے بنا ہوا لباس اور سمور جھانکنے لگا۔ بعض عورتیں برساتیاں اور ٹوپی نما حجاب پہنتیں، جن کے نیچے سے منی سکرٹ صاف دکھائی دے جاتے۔ تنگ جینز، کالی ریشمی جرابیں اور اونچی ایڑی کے جوتے ان کے لباس کا حصہ بننے لگے۔ اب لباس کے معاملے میں کوئی سخت قاعدہ نہیں تھا۔ عورتیں اپنی پسند کو معیار بنانے لگیں۔ حجاب کے معاملے میں نرمی، سید محمد خاتمی کے صدر چنے جانے کے بعد ایرانی معاشرے میں تبدیلی کی صرف ایک نشانی تھی۔ سید محمد خاتمی 1977ء میں 70 فیصد ووٹوں کی اکثریت سے صدر منتخب ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک سخت گیر قدامت پسند مخالف انتظامیہ کو شکست دی تھی۔ صدر خاتمی کو زیادہ تر نوجوانوں کے ووٹ ملے، جن کا جی 25 فیصد بے روزگاری اور کساد بازاری سے بھر گیا تھا، انہیں خیال تھا کہ خاتمی عنان اقتدار سنبھال کر اقتصادی ترقی کے دور کا آغاز کریں گے اور ایک کھلا معاشرہ تشکیل دیں گے۔

صدر خاتمی کی کامیابی سے ایران کے بیرونی دنیا سے تعلقات میں فوری بہتری آئی، ایران نے مغرب سے رابطہ قائم کیا۔ اپنے پرانے دشمن امریکہ سے ''مختلف تہذیبوں کے درمیان مذاکرات کی ضرورت'' کی بنیاد پر تجدید تعلق کی بنیاد رکھی۔ دنیائے عرب سے تعلقات بہتر بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ افغانستان کا مسئلہ ایران، امریکہ اور

عرب دنیا کے درمیان تعلقات کا بنیادی محرک بنا۔ امریکہ کے سفیر بل رچرڈسن پہلے ہی اشارہ دے چکے تھے کہ افغان بحران کے حل میں مدد دینے کے لئے امریکہ ایران کو مذاکرات میں شریک کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ایران اپنے پرانے دشمن سعودی عرب سے بھی گفت وشنید کر رہا تھا۔ ایران کے نئے وزیرخارجہ کمال خرازی نے مئی 1998ء میں کہا کہ ایران اور سعودی عرب کے درمیان مثبت فضا حوصلہ افزاء ہے اور دونوں فریق افغانستان میں تصادم کوختم کرانے کے لئے تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ خرازی ایک منجھے ہوئے سفارکار ہیں۔ انہوں نے گیارہ برس تک اقوام متحدہ میں ایران کی نمائندگی کی ہے۔ ان کی نرم روسفارتی طور طریقے اور انداز ایک ایسے انقلاب کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں نرمی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ایران کے نئے لیڈر طالبان سے سخت ناراض تھے لیکن وہ اس کے ساتھ حقیقت پسند بھی تھے، وہ جانتے تھے کہ ایران کی اقتصادی ترقی اور سیاسی کھلے پن کے لئے افغانستان میں امن کا قیام ضروری ہے۔ ہمسائے میں استحکام، ایران کو اپنی بین الاقوامی تنہائی ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ خاتمی کو طالبان سے لڑنے کا دور دور تک خیال نہیں تھا لیکن چھ ماہ بعد جب طالبان نے مزار شریف میں چھ ایرانی سفارت کار ہلاک کر دیئے تو ایران نے افغانستان سے ملنے والی ایرانی سرحد پر ڈھائی لاکھ ایرانی فوجی متعین کر دیئے اور حملہ کرنے کی دھمکی دینے لگے۔ طالبان سے کشیدگی بڑھی تو ایران اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات نے مزید اہمیت حاصل کر لی۔

ایران اور عربوں کے درمیان شدید دشمنی میں افغانستان کشیدگی کا صرف ایک سبب تھا۔ سنی عرب اور شیعہ ایران کے تنازعے کے پس منظر پرغور کریں تو پتہ چلے گا کہ ایرانی اور عرب ایک دوسرے کو فتح اور ایک دوسرے پرحکومت کرتے آئے ہیں۔ 1501 میں صفوی خاندان کے شاہ اسماعیل نے ایران کو اسلامی دنیا کی پہلی اور واحد شیعہ ریاست کا درجہ دے دیا۔ اہل فارس اور عربوں، دونوں نے ہی وسطی ایشیاء اور افغانستان پرحکومت

کی۔ فارس کی حکومت پر ثقافت اور زبان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، جو آج بھی موجود ہیں۔ بیسویں صدی میں انقلابی ایران اور عراق کے درمیان طویل جنگ 1981۔(88ء) میں 15 لاکھ ہلاک اور زخمی ہوئے، اس جنگ میں تمام عرب ملکوں نے عراق کے صدام حسین کی حمایت کی، جس کی وجہ سے ایران اور عربوں کی دشمنی اور زیادہ گہری ہوگئی، جب وہ جنگ شروع ہوئی تو دوسری جنگ افغانستان میں شروع ہو رہی تھی۔ یہاں بھی برسوں پرانی دشمنیاں جاری رہنا تھیں۔ اس دفعہ سرد جنگ اور امریکہ کا عرب ملکوں کی حمایت سے ایران کو تنہا کرنے کا مقصد اس کا سبب بنا۔

ایران اور سعودی عرب دونوں افغان تصادم کے سلسلے میں ایک طرف تھے۔ دونوں نے افغانستان پر سوویت حملے کی شدید مخالفت کی، مجاہدین کی حمایت کی اور افغان حکومت اور سوویت یونین کو تنہا کرنے کے لئے بین الاقوامی طور پر جو اقدامات کئے جا رہے تھے ان کی تائید کی، لیکن انہوں نے باہم مخالف افغان مجاہدین کی حمایت کی۔ ایران نے کابل کی حکومت سے اپنے سفارتی تعلقات ختم نہیں کئے۔ سعودی عرب مجاہدین کی حمایت کے سلسلے میں امریکہ اور پاکستان کے موقف پر انحصار کئے ہوئے تھا۔ وہ سنی پشتون گروپوں کو سرمایہ بھی فراہم کرتا اور اسلحہ بھی۔ شیعہ افغانوں کو انہوں نے نظر انداز کئے رکھا۔ سعودی عرب الگ سے وہابیت کے فروغ کے لئے بھی سرمایہ دیتا رہا۔ امریکہ مجاہدین کو جتنی امداد دیتا، اتنی ہی امداد سعودی عرب بھی دیتا۔ انہوں نے ڈالر کے بدلے ڈالر کا مسلک اپنا لیا تھا۔ سعودی عرب نے 1980ء اور 1990ء کے درمیان مجاہدین کو سرکاری طور پر 4 ارب ڈالر کی امداد دی، اسلامی عطیات، اداروں اور شہزادوں کی طرف سے دی جانے والی امداد اس سے الگ تھی۔ آئی ایس آئی کو الگ سرمایہ مہیا کیا جاتا۔ 1989ء میں سعودی عرب نے اسلام آباد میں مجاہدین کی جلا وطن حکومت قائم کرنے کی خاطر آئی ایس آئی کے افغان لیڈروں کو رشوت دینے کے لئے 26 ملین ڈالر دیئے۔ مجاہدین لیڈروں نے عبوری حکومت میں ایک وہابی کو وزیراعظم مقرر کر کے

MashalBooks.org

سعودی عرب کی تسکین کا اہتمام کیا۔

مارچ 1990ء سعودی عرب نے گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی کو ایک سو ملین ڈالر اور فراہم کئے۔ حکمت یار اور جنرل شاہنواز فوج کی مدد سے صدر نجیب اللہ کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سعودی امداد اسی سلسلے میں تھی، یہ الگ بات ہے کہ وہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اپریل 1992ء کے بعد سعودی کابل میں مجاہدین کی حکومت کو سرمایہ اور تیل فراہم کرتے رہے۔ تیل پاکستان کے راستے بھیجا جاتا۔ تیل کی یہ فراہمی پاکستان میں یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں اور آئی ایس آئی کے لئے رشوت کا اہم ذریعہ بن گئی۔ امریکہ اور ایران کے کشیدہ تعلقات کے باعث ایران میں رہنے والے مجاہدین کو بین الاقوامی امداد میسر نہیں آ رہی تھی۔ 20 لاکھ افغان مہاجرین کو بھی جو افغان سے بھاگ کر ایران آ گئے تھے، کوئی بیرونی امداد نہیں مل رہی تھی، جبکہ پاکستان میں پناہ لینے والے 30 لاکھ افغان مہاجروں کو انسانی بنیادوں پر امداد حاصل تھی۔ ایران، عراق جنگ کے باعث ایران کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، اس لئے وہ خود بھی افغان مہاجروں کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر رہا تھا۔ 1980ء کے پورے عشرے میں امریکہ نے افغانستان کے تعلق میں ایران کی مکمل ناکہ بندی کئے رکھی، اس سے ایران، امریکہ کے اور زیادہ خلاف ہو گیا اور یہ یقین ہو گیا کہ سرد جنگ ختم ہوئی اور امریکہ افغانستان کے منظر سے ہٹ گیا تو ایران معاملات پر پورے زور سے اثر انداز ہونے لگے گا۔

ایران کی ابتدائی امداد صرف افغان شیعوں کو حاصل رہی، خاص طور سے جن کا تعلق ہزارہ قبیلے سے تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کے پاسداران انقلاب پوری دنیا میں لبنان سے پاکستان تک شیعہ انتہا پسندوں کی مالی امداد کر رہے تھے۔ 1982ء تک ایرانی سرمائے اور اثر نے ایران کے تربیت یافتہ ہزارہ قبائیلیوں کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں روایتی قیادت کو پرے ہٹانے پر ابھارا۔ یہ قیادت 1979ء میں سوویت حملے کی مزاحمت کے دوران سامنے آئی تھی، بعد میں آٹھ افغان شیعہ گروپوں کو تہران میں

سرکاری درجہ دے دیا گیا، لیکن ایران انہیں ضرورت کے مطابق مناسب مالی یا فوجی امداد فراہم نہیں کر سکا، اس کے نتیجے میں ہزارے، جن کی ایران مدد کر رہا تھا، افغانستان کے اندرونی تصادم میں برائے نام رہ گئے۔ وہ سوویت یونین کے خلاف جنگ آزما ہونے کی بجائے، زیادہ تر آپس میں ہی لڑنے لگے۔ ہزاروں میں گروہ بندی ایران کی کم نگاہی اور نظریاتی پالیسیوں کا نتیجہ تھی۔ تہران سے وفاداری کو تو بڑی اہمیت دی جاتی رہی لیکن ان میں اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس نہ کیا گیا۔

1988ء تک سوویت انخلاء یقینی دکھائی دینے لگا تو ایران کو بھی ہزاروں کو تقویت پہنچانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انہوں نے ایران میں مقیم آٹھ ہزارہ گروپوں کو حزب وحدت میں باہم متحد اور مدغم کیا۔ اب ایران نے مجاہدین کی نئی حکومت کی تشکیل کے لئے ہونے والے بین الاقوامی مذاکرات میں حزب وحدت کی شرکت پر اصرار کرنا شروع کیا۔ مجوزہ حکومت پشاور میں مقیم مجاہدین کی جماعتوں کو بنانا تھی۔ اس کے باوجود کہ ہزارہ اقلیت میں تھے اور انہیں افغانستان پر حکومت کرنے کی امید بھی نہیں تھی۔ ایران کا مطالبہ تھا کہ مجاہدین کی آئندہ حکومت میں ہزاروں کو 50 فیصد یا کم سے کم 25 فیصد نمائندگی دی جائے۔

ایران اور سعودی عرب میں دو وجوہ کی بنا پر مخالفت نے شدت اختیار کر لی۔ اولاً سعودی عرب نے وہابیت کے فروغ کے لئے زیادہ سے زیادہ عرب بھیجنا شروع کیے، ثانیا افغانستان میں شیعوں کی مخالفت بڑھنے لگی تھی۔ پاکستان نے دونوں میں توازن برقرار رکھا۔ دونوں کا قریبی حلیف ہونے کے تعلق سے پاکستان زور دیتا آ رہا تھا کہ کابل کی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنا اور اسے برقرار رکھنا چاہیے۔ 1989ء میں سوویت فوجوں کے انخلاء کے بعد جب ایران، کابل حکومت کے قریب تر ہوا تھا سعودی عرب اور ایران کی باہمی مخالفت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایران کا خیال تھا کہ کابل کی حکومت واحد طاقت تھی جو افغانستان پر سنی پشتونوں کو غلبہ پانے سے روک سکتی

تھی، ایران نے حزب وحدت کو پھر سے مسلح کیا۔ 1992ء میں کابل پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا تو وحدت نے نہ صرف ہزارہ جات پر بلکہ مغربی کابل کے خاصے بڑے حصے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس اثناء میں سعودیوں کو ایک بڑا دھچکا لگا۔ سبب یہ تھا کہ ان کے دو بڑے وہابی ہم مسلک گلبدین حکمت یار اور عبدالرسول سیاف میں باہم ناچاقی ہو گئی۔ گلبدین نے کابل میں بننے والی مجاہدین کی حکومت کی مخالفت کی اور کابل پر بمباری کے لئے ہزاروں سے اتحاد کر لیا۔ سیاف نے مجاہدین کی حکومت کی حمایت کی۔ یہ تقسیم دراصل سعودی عرب کی خارجہ حکمت عملی کا شاخسانہ تھی، جو 1990ء میں کویت پر عراق کے حملے کے ضمن میں اپنائی گئی تھی۔ سعودی عرب نے بیس برس تک اسلامی دنیا میں وہابیت کے فروغ کے لئے سینکڑوں وہابی جماعتوں کی مالی امداد کی تھی اور ان ملکوں کی اسلامی تحریکوں میں اثر ونفوذ حاصل کر لیا تھا، لیکن جب سعودی عرب نے ان اسلامی گروپوں سے کہا کہ وہ سودا چکائیں اور عراق کے خلاف سعودی عرب اور امریکہ کے ہم نوا ملکوں کا ساتھ دیں تو ان میں سے اکثریت ان گروپوں کی تھی جنہوں نے حکمت یار اور افغان گروپوں سمیت صدام حسین کی حمایت کی، برسوں کی سعودی مساعی اور اربوں ڈالر ضائع چلے گئے کیونکہ سعودی عرب قومی مفاد کی بنیاد پر خارجہ پالیسی بنانے میں ناکام ہو گیا تھا۔

سعودی عرب کی مشکل یہ ہے کہ وہ مغربی اطوار کی حامل ایک ایسی اشرافیہ کے حق میں ہے جس کی بنیاد قدامت پسند بنیاد پرستی پر ہو، لیکن جو اس اشرافیہ کا حصہ نہیں، وہ برملا طور پر مغرب کے مخالف ہیں۔ وابستگان اقتدار نے وہابیت کو فروغ دیا اور اس ضمن میں یہ پروا نہیں کی اس طرح ان کی ملک کے اندر اور باہر طاقت کو ضعف پہنچے گا، عجب بات یہ ہوئی کہ اعتدال پسند افغان گروپوں نے جنہیں سعودی نظر انداز کرتے چلے آئے تھے، ضرورت کے وقت سعودی سلطنت کی حمایت کی۔

1992ء اور 1995ء کے درمیانی عرصے میں افغان جنگ نے جب شدت اختیار کی

تو ویسے ہی ایران اور سعودی عرب کے درمیان مخالفت میں اضافہ ہو گیا۔ سعودیوں اور پاکستانیوں نے کئی بار کوشش کی کہ تمام گروپ باہم مل بیٹھیں۔ تاہم انہوں نے ایران اور ہزاروں کو تمام اہم معاہدوں سے الگ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ 1992ء کے معاہدہ پشاور جو پاکستان اور سعودی عرب کی کوششوں سے طے پایا تھا، اس میں کہا گیا تھا کہ مجاہدین کابل میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد باہم طاقت کی تقسیم کیسے کریں گے۔ 1993ء میں اسلام آباد اور جلال آباد کے مجاہدوں کے مطابق خانہ جنگی بند کرائی جانی تھی، اس سمت میں کیا پیش رفت ہوگی؟ یہ تو بعد کی بات تھی، پہلے مرحلے میں ہی ایران اور ہزاروں کو الگ چھوڑ دیا گیا، یعنی انہیں معاہدوں میں شامل نہیں کیا گیا۔ 1990ء کے عشرے میں پاکستان اور سعودی عرب نے ایران کو اس طرح معاہدوں سے باہر رکھا جس طرح کا سلوک 1980ء کی دہائی میں امریکہ نے ایران سے روا رکھا تھا۔ اس سے ایران کے دل میں تلخی اور زیادہ بڑھ گئی۔

ایرانی اب زیادہ حقیقت پسند ہو چلے تھے، انہوں نے نہ صرف افغان شیعوں کی بلکہ فارسی بولنے والے ان تمام نسلی گروپوں کی حمایت کرنا شروع کر دی، جنہوں نے پشتون غلبے کی مزاحمت کی تھی۔ ایران کا تاجکوں سے فطری تعلق تھا، دونوں ایک ہی قدیم نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے، لیکن 1993ء میں احمد شاہ مسعود نے کابل میں ہزاروں پر جو وحشیانہ حملے کئے تھے، ان کی بنا پر ایران سخت ناراض تھا۔ تاہم ایران نے محسوس کر لیا کہ جب تک وہ غیر پشتونوں کی حمایت نہیں کرتا، پشتون سنی افغانستان پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ 1993ء میں پہلی مرتبہ ایران نے صدر برہان الدین ربانی اور ازبک جنگی سردار، جنرل عبدالرشید دوستم کو بھاری فوجی امداد دینا شروع کی اور تمام نسلی گروپوں پر زور دیا کہ وہ صدر برہان الدین ربانی کے ساتھ مل جائیں۔

ایران کے نئے موقف کے باعث مفادات کے ضمن میں اس کے پاکستان کے ساتھ اختلافات نے شدت اختیار کر لی۔ پاکستان چاہتا تھا کہ کابل پر اس کے ہم نوا پشتونوں

کو اقتدار حاصل ہو۔ پاکستانی اور سعودی ہزاروں کو ہر سطح پر اقتدار سے الگ رکھنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ پاکستان نے 1980ء کے عشرے میں سعودی اور ایرانی مفادات میں توازن برقرار رکھنے کی جو سفارتی پالیسی اپنا رکھی تھی، اب اسے ترک کر کے سعودیوں کا ساتھ دینے کا راستہ اپنایا گیا۔

سوویت یونین کے خاتمے اور وسطی ایشیاء کے کھل جانے سے ایران کو اپنی بین الاقوامی تنہائی سے نکلنے کی نئی تحریک ہوئی۔ ایران نے وسطی ایشیاء کی جانب تیزی سے پیش رفت کی۔ ایرانی وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی نے نومبر 1991ء میں ترکمانستان کا دورہ کیا اور ترکمانستان اور ایران کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا معاہدہ کر لیا۔ یہاں بھی امریکہ نے ایران کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ امریکہ کے وزیر خارجہ جیمز بیکر نے 1992ء میں اعلان کیا کہ امریکہ وسط ایشیاء کو ان کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر ممکن اقدام کرے گا۔ وسطی ایشیاء کے نئے کمیونسٹ حکمرانوں کو ابتداً ایران کے بارے میں بہت سے شکوک اور شبہات تھے۔ انہیں شک تھا کہ ایران وسطی ایشیاء میں اسلامی بنیاد پرستی پھیلائے گا۔ ایران نے اس قسم کے مفروضوں کو مسترد کیا اور روس سے قریبی تعلقات قائم کر لئے۔ 1989ء میں سوویت وزیر خارجہ ایڈورڈ شیور نازوے نے تہران کا دورہ کیا، جس سے دونوں ملک کے درمیان برف پگھلنے لگی، انہوں نے آیت اللہ خمینی سے ملاقات کی۔ آیت اللہ نے اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے روس اور ایران کے درمیان قریبی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی۔ جس سے ایرانیوں کی نظر میں نئے روس کو وقعت حاصل ہوگئی۔ 1989ء اور 1993ء کے درمیان روس نے ایران کو فوجی صلاحیت بڑھانے کے لئے 10 بلین ڈالر کا اسلحہ اور فوجی ساز و سامان دیا۔ ایران نے غیر مسلم سابق روسی ریاستوں جارجیا، یوکرین اور آرمینیا سے تعلقات قائم کر کے علاقے میں اپنی حیثیت کو بہتر بنا لیا۔ تہران نے آرمینیا سے جنگ میں آذربائیجان کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا اور یہ فیصلہ اس کے باوجود کی کہ ایران کی آبادی کا 20

MashalBooks.org

فیصد آذری لوگوں پر مشتمل ہے۔ ایران نے تاجکستان میں خانہ جنگی ختم کرانے میں روس اور اقوام متحدہ کی مدد کی، ایران اور وسطی ایشیاء کی ریاستوں کو افغان پشتون بنیاد پرستی اور اسے پاکستان اور سعودی عرب سے ملنے والی حمایت کے ضمن میں سخت شبہات تھے۔ اس طرح ایران، روس اور وسط ایشیائی ریاستوں کے اتحاد کی طرف سے غیر پشتون نسلی گروپوں کو حمایت حاصل ہوگئی۔ طالبان کے منظر پر آنے سے پہلے غیر پشتون نسلی گروپ موجود تھے۔

اس کے مقابلے میں سعودی عرب نے روس یا وسط ایشیائی ریاستوں سے الگ الگ تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی، سعودیوں کو وسطی ایشیائی ریاستوں میں سفارت خانے قائم کرنے میں چار سال لگ گئے۔ سعودیوں نے قرآن مجید کے لاکھوں نسخے وسط ایشیاء بھیجے، وسط ایشیائی مسلمانوں کو حج کے موقعے پر مالی سہولتیں فراہم کیں اور ان کے ملاؤں کو سعودی عرب میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے، جہاں انہیں وہابیت سے بہرہ ور کیا گیا۔ ان اقدامات سے وسط ایشیائی ریاستوں کے حکمران خاصے پریشان ہوئے، چند ہی برسوں میں ازبکستان، قازقستان اور کرغیزستان کے حکمرانوں کو کہنا پڑا کہ وہابیت ان کے ملکوں میں استحکام کے لئے بہت بڑا سیاسی خطرہ ہے۔

سعودی عرب طالبان کو افغانستان میں سعودی عرب کے اثر ورسوخ کی بحالی کا ایک اہم وسیلہ سمجھتے تھے۔ طالبان سے پہلے سعودی تعلقات، سعودی شہزادوں کے شکار کے دوروں کے حوالے سے قائم ہوئے۔ ان کا آغاز 1994۔95ء میں سعودی اور خلیجی شہزادوں کی قندھار میں آمد سے ہوا۔ عرب شکاریوں کی پارٹیاں بڑے ٹرانسپورٹ طیاروں کے ذریعے قندھار پہنچیں، وہ اپنے ساتھ جدید اور آرام دہ جیپ گاڑیاں لائے، واپس جاتے ہوئے وہ یہ گاڑیاں اپنے میزبان طالبان کو تحفے کے طور پر دے گئے، سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ شہزادہ ترکی نے باقاعدگی سے قندھار کے دورے کرنے شروع کئے۔ جولائی 1996ء میں شہزادہ ترکی کے اسلام آباد اور قندھار کے دورے کے

MashalBooks.org

بعد سعودیوں نے طالبان کو سرمایہ، موٹر گاڑیاں اور کابل پر طالبان کے کامیاب حملے کے لئے تیل فراہم کرنا شروع کیا، جو سعودی کمپنیوں، ڈیلٹا اور نگارگو افغانستان میں گیس کی پائپ لائنیں بچھانے میں مصروف ہوگئیں۔ مقامی تجارت کا ریاض پر دباؤ بڑھنے لگا کہ طالبان کو فتح یاب کرنے میں مدد دی جائے۔

سعودی عرب کے وہابی علماء نے شاہی خاندان کو طالبان کی حمایت پر آمادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ریاستی کونسل اور چار دوسرے ریاستی شعبوں میں علماء کو فرمانروا کے مشیر ہونے کے ناتے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ شاہ ان کی رائے کو بڑی وقعت دیتے۔ 1990ء میں عراق سے جنگ کے موقعہ پر شاہ فہد کو 35 علماء کا اجلاس طلب کرنا اور ان سے سعودی عرب میں امریکی فوج کے قیام کے حق میں فتویٰ جاری کرنے کے لئے کہنا پڑا تھا۔ سعودی انٹیلی جینس اور سرکاری امداد سے چلنے والے اداروں نے اس ضمن میں علماء سے بھرپور تعاون کیا۔ ان اداروں نے 1980ء کے عشرے میں بھی افغان مجاہدین کی امداد کی تھی اور اب وہ طالبان کی حمایت کرنے لگے تھے۔ علماء نے سلطنت کے طول وعرض میں بے شمار مساجد سنبھال رکھی تھیں۔ جہاں جمعہ کی نماز میں خطبوں کے ذریعے انہوں نے سعودی عوام کو طالبان کے حق میں کر دیا۔ سعودی معاملات پر گہری نظر رکھنے والے تجزیہ نگار نواف عبید کے مطابق علماء میں سے جس شخصیت نے طالبان کے لئے سعودی امداد ہموار کی، وہ وزیر انصاف اور علماء کی کونسل کے اہم رکن شیخ محمد بن جابر کی ہے۔ طالبان نے جواب میں شاہی خاندان اور سعودی علماء کے لئے عزت وتکریم کا اظہار کیا اور وہابی شعائر پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا۔ مذہبی پولیس کا قیام اس کا ثبوت ہے۔ اپریل 1997ء میں طالبان کے لیڈر ملا ربانی نے شاہ فہد سے ملاقات کی اور سعودیوں کی تعریف کی اور کہا کہ سعودی عرب دنیائے اسلام کا مرکز ہے۔ ہم اس کی امداد کے طالب ہیں۔ شاہ فہد نے طالبان کے اقدامات کی اور ملک میں شریعت کے نفاذ پر اظہار مسرت کیا۔ شاہ فہد سے ملاقات کے بعد طالبان نے بتایا کہ سعودیوں نے

MashalBooks.org

طالبان کی مزید امید کرنے کا یقین دلایا ہے۔ ملا ربانی نے بتایا کہ شاہ فہد بہت مہربان تھے، انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ جتنا کچھ بن پڑا، طالبان کی مدد کی جائے گی۔

سعودی عرب کی طرف سے طالبان کی حمایت کے بعد ان پر بن لادن کو ملک بدر کرنے کے لئے دباؤ ڈالنا مشکل ہو گیا۔ امریکہ کے دباؤ کے باوجود سعودی عرب اس سلسلے میں متامل تھا۔ قندھار میں ملا عمر نے شہزادہ ترکی کی ذاتی طور پر توہین کی تو اس کے بعد ہی سعودی عرب نے طالبان کے سفارتی تعلقات میں کمی کر دی۔ ذاتی نوعیت کی توہین سعودی فیصلے کی محرک بنی، خارجہ پالیسی میں تبدیلی اس کا سبب نہ تھی۔ سعودی عرب نے وہابیت برآمد کرنے کے سلسلے میں جو منفی نوعیت کے تجربات ہوئے، ان سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

سعودی عرب کی طالبان کی ابتدائی امداد سے ایران کو یقین ہو گیا کہ امریکہ بھی اپنی 1980ء کے عشرے کی پالیسیوں پر عمل درآمد کے ذریعے ایران کے مخالفوں سے مل کر اسے تنہا کرنے کی کوششوں کو تیز تر کر رہا ہے۔ تہران کے مطابق امریکہ کا نیا مقصد وسطی ایشیاء سے گیس اور تیل کی پائپ لائنیں بچھانا تھا لیکن اس طرح کہ وہ ایران کے پاس سے گزر جائیں۔ ایران کے علاقے سے نہ گزریں۔ کابل پر طالبان کا قبضہ ہوا تو ایرانی اخبارات نے سرکاری موقف کا اظہار کیا۔ اخبار جمہوری اسلامی نے لکھا کہ کابل پر طالبان کے قبضے کا منصوبہ واشنگٹن نے بنایا، ریاض نے اس کے لئے مالی امداد فراہم کی اور نقل وحمل کی سہولتوں کا اہتمام اسلام آباد نے کیا۔ بہرحال افغانستان سے ایران کی لاتعلقی کا اصل سبب اندرونی تھا۔ ایرانی قیادت سخت گیروں اور اعتدال پسندوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سخت گیر عناصر پوری دنیا میں شیعوں کی حمایت کا دم بھرتے تھے اور اعتدال پسند طالبان مخالف اتحاد کی سوچ سمجھ کو نپے تلے انداز میں حمایت کرنے کے حق میں تھے اور چاہتے تھے کہ طالبان کا سختی سے سامنا نہ کیا جائے۔ ایران کو بھی کچھ اسی طرح کی مشکلات درپیش تھیں جن میں پاکستان گھرا ہوا تھا۔ پاکستان کے کئی شعبے اور ادارے

افغان پالیسی کی تشکیل میں ذاتی مفادات کو معیار ٹھہرائے ہوئے تھے۔ ایران کی فوج، خاص داران انقلاب، انٹیلی جینس ایجنسیاں، شیعہ علماء اور طاقتور بنیادیں جن پر تمام تر اختیار مذہبی رہنماؤں کا تھا اور جس کے حسابات کی جانچ پڑتال کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ افغانستان سے متعلق معاملات طے کرنے میں پیش پیش تھے۔ ایران کے وزیر خارجہ اور نائب وزیر خارجہ بروجری برائے امور افغانستان، متذکرہ اداروں کو مساوی سطح پر رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ بروجروی منجھے ہوئے سفارت کار ہیں۔ وہ صدر اکبر علی افسنجانی کے دور میں بھی اسی منصب پر فائز رہے اور صدر خاتمی کے مقتدر ہونے کے بعد بھی اسی حیثیت میں فرائض انجام دیتے رہے۔ مزار شریف میں ایرانی سفارت کاروں کا قتل ہوا تو انہیں استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ بیک وقت فاختہ کا کردار بھی ادا کرتے اور عقاب کا بھی، اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ وہ ایک وقت میں کس سے مخاطب ہیں، وہ یہ دھیان بھی رکھتے تھے کہ ایران کے پاکستان اور سعودی عرب کے ساتھ مفادات کا تصادم ایک حد میں رہے۔ قابو سے باہر نہ ہونے پائے، اس کے برعکس سعودی عرب کے وزیر خارجہ شہزادہ مسعود الفیصل نے افغان پالیسی اپنے بھائی شہزادہ ترکی اور سعودی انٹیلی جینس کے سپرد کر رکھی تھی۔

افغان ریاست کے ختم ہو جانے سے منشیات اور اسلحے کی وسیع آمد سے ایران کی اپنی سلامتی کے لئے چند در چند خطرے پیدا ہو گئے۔ افغانستان کی مختلف نسلوں اور قبائل کے درمیان تصادم اور اختلافات کا ایک تو ایران پر اثر انداز ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا، دوسرے لاکھوں افغان مہاجروں کی آمد سے ایران کی معیشت پر بھاری بوجھ آ پڑا، عام ایرانی ان مہاجروں کو پسند نہیں کرتے تھے، یہ الگ معاشرتی عنصر تھا، ایران میں ہیروئن کے عادی افراد کی تعداد 30 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ہیروئن کے اتنے ہی نشئی پاکستان میں بھی ہیں۔ ایران سے تیل، اشیائے خوردنی اور دوسری اشیاء کی افغانستان میں سمگلنگ سے بھی مالی خسارہ اور اقتصادی مسائل پیدا ہونے لگے، تیل کی قیمتوں میں عالمی

سطح پر جو کمی ہوئی اس کے سبب سے ایران کی آمدنی میں نمایاں کمی ہوگئی اور اسے تعمیر نو کے لئے اضافی کوششیں کرنا پڑی۔

ایرانیوں کے لئے سب سے تشویشناک امر یہ تھا کہ 1996ء سے طالبان خفیہ طور پر ان ایرانی گروپوں کی پشت پناہی کر رہے تھے، جو حکومت کے مخالف تھے۔ طالبان نے قندھار میں اہل سنت و الجماعت کو پناہ دے رکھی تھی، جنہوں نے زرستان اور سیستان کے صوبوں کے ایرانی سنی انتہا پسندوں کی تربیت کی۔ ان کے ترجمانوں نے، جن کا تعلق ترکمان، بلوچی اور افغان اقلیتوں سے تھا، دعویٰ کیا کہ ان کا مقصد تہران میں شیعہ حکومت کا تختہ الٹنا اور ان کی جگہ طالبان کی طرز کی سنی حکومت قائم کرنا تھا۔ یہ خواہش عامیانہ نوعیت کی تھی، کیونکہ ایران کی 95 فیصد آبادی شیعہ تھی۔ اس میں باغیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کا ہونا کوئی ان ہونی بات نہ تھی۔ اس گروپ کو طالبان کی مالی اور اسلحے کی امداد حاصل تھی۔ ایرانیوں کو یہ یقین بھی تھا کہ پاکستانی بھی اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

1996ء میں کابل کے فتح ہو جانے کے بعد ایران نے طالبان مخالف اتحاد کی فوجی امداد میں اضافہ کر دیا۔ 1998ء میں مزار شریف پر طالبان کے قبضے کے بعد بھی یہی عمل جاری رہا۔ ایران کا طالبان مخالف اتحاد سے کوئی سرحدی رابطہ نہیں تھا، اس لئے وہ مسعود کی فوج کے لئے فضائی اور ریلوے کے ذریعے امداد بھیجتا رہا۔ اس کے لئے اسے ترکمانستان، ازبکستان اور کرغیزستان سے اجازت لینا پڑتی۔ 1998ء میں ایرانی انٹیلی جینس نے تاجکستان میں کلیاب کے مقام پر احمد شاہ مسعود کے اڈے پر فضائی راستے سے اسلحہ پہنچانا شروع کیا، مسعود کا تہران میں اکثر آنا جانا ہوگیا۔ ایران کی طرف سے اسلحے کی ترسیل کا انکشاف اکتوبر 1998ء میں اس وقت ہوا، جب کرغیزستان کی سیکورٹی فورسز نے ایک ٹرین روکی، جس کی سولہ ریل کاروں میں 700 ٹن ہتھیار اور گولہ بارود لدا ہوا تھا۔ ٹرین ایران سے تاجکستان جا رہی تھی اور اس میں لدے ہوئے اسلحے کو انسانی

امداد کہہ کر چھپایا گیا تھا۔

طالبان اتحاد کے لئے ایران کی حمایت پر سخت کبیدہ خاطر ہوئے۔ یوں 1997ء میں طالبان نے کابل میں ایرانی سفارت خانہ بند کر دیا۔ عذر میں یہ الزام لگایا گیا کہ ایران اور افغانستان میں امن و استحکام کو تباہ کر رہا ہے۔ ستمبر 1997ء میں مزار شریف پر قبضہ کرنے کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد طالبان نے ایک بیان میں کہا کہ ایرانی طیارے بین الاقوامی طور پر مسلم قانون اور ضابطوں کے علی الرغم ایرانی فضا کی خلاف ورزی کرتے اور ان ہوائی اڈوں تک سامان پہنچاتے ہیں، جن پر ایران کے مخالفوں کا قبضہ ہے۔ اس دخل اندازی کے نتائج ایران کو بھگتنا پڑیں گے، جو اسلام کا دشمن ہے۔ افغانستان ایرانی حکومت کے مخالفوں کو افغان علاقے میں پناہ دینے اور اس طرح ایران کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

1998ء میں ایرانی سفارت کاروں کے قتل نے ایران کو طالبان کے خلاف جنگ پر قریباً مجبور کر دیا۔ مغربی افغانستان پر ایرانی حملے کو بے پناہ عوامی حمایت حاصل تھی۔ جس سے تہران میں ان سخت گیر عناصر نے فائدہ اٹھانا چاہا جو صدر خاتمی کو کمزور کرنے کے درپے تھے، حتیٰ کہ مصلح جو وزیر خارجہ کمال خرازی بھی نہایت سخت زبان استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے 14 اگست 1998ء کو کہا کہ طالبان پشتون ہیں، وہ تمام دوسرے نسلی گروہوں کو مسلسل مزاحمت کا خطرہ مول لئے بغیر منظر سے ہٹا نہیں سکتے۔ اس صورت میں ملک میں امن قائم نہیں ہو سکے گا، میں طالبان اور ان کے حامیوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ ہم اپنی سرحدوں پر عدم استحکام اور سازش برداشت نہیں کر سکتے، ہمارا پاکستان سے معاہدہ ہے کہ افغان مسئلہ جنگ سے حل نہیں ہوگا، اب جو ہوا ہے اسے ہم قبول نہیں کر سکتے۔

ایران کو کئی معاملوں میں پاکستان کی طرف سے زک اٹھانا پڑی۔ 1996ء میں جب صدر برہان الدین ربانی ایران کے مشورے پر اپنی حکومت کی بنیاد میں توسیع کر رہے

تھے اور پشتونوں اور دوسرے گروپوں کو حکومت میں شامل کر رہے تھے تو طالبان نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ ایران نے اس یقین کا اظہار کیا کہ پاکستان نے صدر ربانی کی کوشش کو ناکام بنایا ہے۔ جون 1997ء میں وزیراعظم نواز شریف تہران گئے۔ انہوں نے صدر خاتمی سے مل کر افغانستان میں جنگ بندی کا مطالبہ اور اعلان کیا کہ مسئلے کا کوئی فوجی حل نہیں ہوسکتا۔ ایران کا خیال تھا کہ پاکستان معاہدے کی پابندی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اخبار جمہوری اسلامی نے لکھا کہ پاکستان نے ہمارے اعتماد کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔ ایرانی عوام کا اس پر اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ پاکستان ہماری سلامتی کے لئے مسائل پیدا کرتا رہے۔

1998ء کے موسم گرما میں پاکستان نے ایران کو ایک مشترکہ سفارتی امن مشن میں شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ درمیانی درجے کے ایرانی اور پاکستانی سفارت کاروں نے پہلی مرتبہ مزار شریف اور قندھار کا اکٹھا سفر کیا، وہ باہم مخالف گروپوں سے بات چیت کرنے گئے تھے۔ چند ہفتے بعد طالبان نے مزار شریف پر حملہ کیا اور ایرانی سفارت کاروں کو قتل کر دیا، جس کے باعث ایک دوسرے کے مخالف گروپوں کے درمیان مصالحت کرانے کا مقصد فوت ہو گیا۔ ایرانیوں کو یقین ہو گیا کہ پاکستانیوں نے امن کی تحریک کے نام پر انہیں دھوکہ دیا ہے، کیونکہ جب وہ امن کی بات کر رہے تھے تو طالبان کو مزار شریف پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ ایران نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ پاکستان نے مزار شریف میں ایرانی سفارت کاروں کے تحفظ کا یقین دلایا تھا۔ جب ایرانی سفارت کار قتل ہوئے تو ایران نے سخت غم و غصے کا اظہار کیا اور طالبان اور پاکستان کو اس المیے کا ذمہ دار قرار دیا۔ ایرانی افسروں کا کہنا تھا کہ ملا دوست محمد، جس نے مبینہ طور پر ایرانی قونصل خانے پر طالبان کے قبضے کی قیادت کی تھی۔ سفارت کاروں کو عمارت کے تہہ خانے میں جمع کیا اور پھر انہیں گولیوں سے اڑانے سے قبل قندھار سے وائرلیس پر بات کی۔

طالبان کا جواب تھا کہ جو ایرانی ہلاک ہوئے، وہ سفارت کار نہیں تھے بلکہ انٹیلی جینس کے ایجنٹ تھے، جو طالبان کے مخالفوں کو اسلحہ پہنچاتے رہے تھے۔ اس کے بعد سفارتی سطح پر جو تو تکار شروع ہوئی، اس سے ایران اور پاکستان کے درمیان اعتماد ہوا بن کر اڑ گیا۔ ایرانی اس پر سخت غصے میں تھے کہ طالبان کے اقدامات سے امریکہ سے ایران کی بڑھتی ہوئی مصالحت کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا۔ امریکہ کی سیکرٹری خارجہ میڈیسن البرائٹ نے جون 1998ء میں کہا تھا کہ ایران جو کردار علاقے میں ادا کرتا رہا ہے، اس نے امریکہ اور ایران کے تعلقات کو سیکرٹری خارجہ کے لئے بڑی دلچسپی کا بہت اہم موضوع بنا دیا ہے۔ اس خیال سے کہ امریکہ پہلی مرتبہ انہیں سنجیدگی سے لے رہا ہے، ایرانیوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ کمال خرازی نے مجھے بتایا کہ افغانستان کے مسئلے پر امریکہ اور ایران کا تعاون ایک مثالی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے اور اس بات کا مظہر بھی کہ اس خطے کی اصل حقیقت اور امن و سلامتی کے فروغ کے لئے جو کردار ایران ادا کر سکتا ہے امریکہ اسے بہتر طور پر سمجھنے لگا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم عرصے سے انہیں (امریکہ کو) یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایران اس خطے کا مرکزی کھلاڑی ہے۔ طالبان کے بارے میں واشنگٹن کے خیالات میں تبدیلی آنے سے بھی امریکہ اور ایران ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔ دونوں ممالک اب یکساں خیالات رکھتے ہیں اور طالبان کی منشیات اور عورتوں سے متعلق پالیسیوں، دہشت گردوں کو پناہ دینے اور طالبان طرز کی اسلامی بنیاد پرستی کے ناقد ارادوں سے پیدا ہونے والے خطروں کا وقوف رکھتے ہیں۔ امریکہ کے لئے اب شیعہ بنیاد پرستی نہیں بلکہ طالبان کی سنی بنیاد پرستی خطرے کا موجب ہے۔

طالبان تو اب سعودی عرب کے لئے بھی خفت اور پشیمانی کا موجب ہیں۔ اس لئے تہران کو ریاض کے قریب آنے میں مدد ملی ہے۔ طالبان کا بن لادن کو اپنے ہاں پناہ دینے سے، ان کی انتہا پسندی کا پردہ چاک اور سعودی استحکام کے لئے خطرہ پیدا کر دیا

ہے۔ ایران اور سعودی عرب میں مفاہمت کا عمل اس وقت بھی جاری رہا، جب 1998ء میں ایران افغانستان پر حملہ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ مئی 1999ء میں صدر خاتمی نے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ 30 برسوں میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی ایرانی لیڈر نے سعودی عرب کا دورہ کیا تھا۔

طالبان سعودی منحرفین کی حمایت کر کے سعودیوں کی سلامتی کے لئے بھی خطرہ پیدا کر رہے تھے۔ ماضی میں سعودی عرب نے طالبان کی بنیاد پرستی کو چنداں اہمیت نہیں دی، یہ بات دھیان میں نہیں رکھی کہ افغانستان میں سیاسی سودے بازی اور اقتدار میں شرکت کے لئے جوڑ توڑ سے جو صورت حال پیدا ہوگئی، اس کے کیا مضمرات ہوں گے! لیکن اب وہ یہ رویہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ سعودی خارجہ پالیسی ذاتی تعلقات اور سرپرستی کی اساس پر چلتی رہی تھی، اس میں ریاستی اداروں کا عمل دخل کم تھا۔ اب یہ طے کرنا مشکل تھا کہ افغانستان کے تعلق میں کوئی پالیسی کس طرح اپنائی جا سکتی ہے جو وہابیت کی بجائے سعودی عرب کے قومی مفادات اور علاقے میں استحکام کی محافظت کا وسیلہ بن سکے۔

صدر خاتمی کو اگر ایران میں اصلاحات کے عمل کو جاری رکھنا تھا تو اس کے لئے ایرانی حکومت کو افغانستان میں پر امن تصفیے کی ضرورت تھی تا کہ طالبان مخالف اتحاد کو مالی امداد دینے پر جو وسائل صرف ہو رہے ہیں، وہ ختم ہوں۔ منشیات کا کاروبار، اسلحہ افغانستان سے پھیلنے والی فرقہ واریت اور اس نوع کی دوسری بدعنوانیوں کا خاتمہ اور امریکہ سے صلح صفائی کا مقصد پورا کیا جا سکے۔ طالبان کی بنیاد پرستی نے ایران اور سعودی عرب کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی مدد کی اور پاکستان کے دونوں ملکوں سے تعلق کو کمزور کر دیا۔ ایران کا سفارت کاروں کے دھارے میں شامل ہونے کا سب سے بڑا نقصان پاکستان کو ہوا۔ تاہم مغرب سے تنہائی ختم کرنے کے لئے ایران کو یہ ظاہر کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ عالمی برادری کا ایک ذمہ دار اور استحکام پیدا کرنے کا اہل رکن ہے۔

MashalBooks.org

اس کا پہلا ثبوت افغانستان میں امن بحال کرنے میں اس کی موثر مدد اور کردار ہوتا۔

MashalBooks.org

حرف آخر

افغانستان کا مستقبل

افغانستان کی خانہ جنگی کو اس اعتبار سے ''یتیم'' کہا جا سکتا ہے کہ ہرجائی اور موقع پرست دنیا نے اسے یوگوسلاویہ کے حق میں نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ بات اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل بطروس غالی نے 1995ء میں کہی تھی۔ ان کا کہنا صحیح تھا کہ مغربی دنیا اپنی توجہ اپنی پسند کے مسئلوں پر مرکوز کر لیتی ہے۔ اس کی مثال یوگوسلاویہ کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ افغانستان سے توجہ ہٹا لی گئی، خانہ جنگی، نسلی اختراق اور متحارب فریقوں اور گروپوں کی اپنی اپنی جگہ جتھہ بندی ریاستی ناکامی کا سبب بن گئی ہے۔ افغانستان قابل عمل نہیں رہا۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی ریاست ناکام ہو جاتی ہے تو معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ آنے والی نسلوں کی کوئی جڑ بنیاد نہیں رہتی، وہ اپنا تشخص کھو دیتی ہے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد رہ جاتا ہے کہ وہ آپس میں لڑتی بھڑتی رہیں۔ بڑے وحشی بن جاتے ہیں، وہ جنگ اور جنگی سرداروں کی طاقت ہی کو سمجھتے اور مانتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ثالث لخدار براہیمی نے کہا کہ ہمارا واسطہ ایک ناکام ریاست سے ہے، جس کی حالت ایک ایسے زخم کی ہے، جو خراب ہو گیا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے صاف کرنے کے لئے کہاں سے آغاز کیا جائے۔

پوری افغان آبادی ایک بار نہیں بلکہ کئی بار اجڑی ہے۔ کابل کی تباہی نے اسے بیسویں صدی کے اواخر ڈاسڈن شہر بنا ڈالا ہے۔ پرانے زمانے کی شاہراہ ریشم کے چوراہے پر اب میلوں تک ملبے کے ڈھیر لگے ہیں، اب کہیں تنظیمی ڈھانچے کے آثار تک باقی نہیں، پھر معاشرہ کس بنیاد پر قائم ہو اور کس حوالے سے برقرار رہے۔ 1998ء میں

عالمی ریڈکراس نے ایک رپورٹ میں بتایا تھا کہ جن افغان خاندانوں کی سربراہ بیوہ عورتیں ہیں، ان کی تعداد 98,000 تک پہنچ چکی ہے، جن خاندانوں کے سربراہ جسمانی طور پر معذور افراد ہیں، ان کی تعداد 63000 ہے۔ 45000 افراد جنگ میں زخمی ہونے کے بعد علاج کرانے پر مجبور تھے۔ کتنے لوگ مارے گئے، ان کا اندازہ نہیں۔ ملک میں صرف ایسی فیکٹریاں موجود ہیں، جہاں مصنوعی اعضا، بیساکھیاں اور ویل چیئرز بنتی ہیں۔

افغانستان کی تقسیم مرکب نوعیت کی ہے۔ نسلی فرقہ وارانہ، دیہی، شہری، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ، وہ جن کے پاس بندوقیں ہیں اور وہ جن کے پاس کوئی اسلحہ نہیں۔ معیشت اندھے کنوئیں کی مثال ہے، جس میں ہمسایوں سے ناجائز تجارت، منشیات کی سمگلنگ اور اسلحے کر رہے ہیں۔ سویڈش ایڈورکرانڈرش کے اندازے کے مطابق ملک کی ترقی کے لئے جس کم سے کم انتظامیہ کی ضرورت ہے، اسے چلانے کے لئے مرکزی ہئیت حاکمہ کے قیام میں دس سے پندرہ برس لگ سکتے ہیں۔

طاقت اور اتھارٹی کا جو تعلق صدیوں میں قائم ہوا تھا، وہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ کسی ایک گروپ یا لیڈر کے پاس ملک کو پھر سے متحد کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ قومی یا قبائیلی تشخص علاقائی نسبتوں کو فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ افغان اب اپنے آپ کو افغان یا پشتون اور تاجک نہیں کہتے بلکہ قندھاری، پنجے شیری، ہراتی، کابلی یا جوز جانی کہلانے لگے ہیں۔ یہ تفریق عمودی بھی ہے اور افقی بھی۔ ایک ہی نسل کے یا ایک ہی وادی اور شہر کے رہنے والے لوگ تقسیم در تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ پشتون قبائیلی ڈھانچے کی تباہی میں مشترکہ قبائیلی جائیداد اور چراگاہوں کے ختم ہونے کا دخل ہے۔ جنگ یا نقل مکانی اس کے اہم محرک ہیں۔ غیر پشتون اپنے جنگجو لیڈروں اور اپنی جائے پیدائش کے حوالے کو اپنی بقاء کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

قبائیلی سردار جو کبھی باہمی اختلاف اور تصادم کو ختم کرانے میں اہم کردار ادا کرتے تھے،

مارے گئے یا وطن چھوڑ کر چلے گئے۔ پرانی تعلیم یافتہ حکمران اشرافیہ سوویت حملے کے بعد بھاگ گئی۔ اس کی جگہ نئی حکمران اشرافیہ نے نہیں لی، جو قیام امن کے لئے بات چیت کر سکتی۔ سیاسی طبقہ بھی نہیں جو مصالحت یا سودا کروا سکے۔ آبادی کے مختلف چھوٹے حصوں کی قیادت کے دعویدار لیڈروں کی کمی نہیں۔ لیکن کوئی بڑا اور موثر لیڈر نہیں۔ اس صورت حال میں جبکہ جنگ ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ سوال بہت اہم ہو جاتا ہے کہ آیا افغانستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور اس کے نسلی تفرقے اور عدم استحکام پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

افغانستان میں جنگ کے جاری رہنے کا زیادہ تر الزام باہر والوں پر آتا ہے، جو اپنے اپنے گروپوں کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں، اس سے مداخلت اور تشدد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سابق سوویت یونین نے اپنی وحشیانہ دخل اندازی سے اس عمل کا آغاز کیا لیکن اسے اس کا بڑا ہولناک نتیجہ بھگتنا پڑا۔ سوویت آرمی میں میجر کی حیثیت سے فرائض انجام دینے والے اور بعد میں صدارتی انتخاب میں حصہ لینے والے امیدوار الگزینڈر نے کہا کہ ہم نے افغانستان کو اپنی روح اور اپنے دل میں بسا لیا ہے۔ کمزور سیاسی مہم جوئی اور غیر مستند انقلاب کو برآمد کرنے کی کوشش ہمارے خاتمے کا سبب ثابت ہوئی۔

افغان مجاہدین کا سوویت یونین، سوویت سلطنت اور بذات خود کمیونزم کے خاتمے میں بڑا دخل ہے۔ افغان ان تبدیلیوں کا سارا کریڈٹ خود لیتے ہیں، لیکن مغرب کا موقف اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ صرف اتنا مانتا ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے میں افغانستان کا حصہ ہے۔ افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء سے گورباچوف کا پریسٹوریکا اور گلاسنوٹ کا تجربہ ناکام ہوگیا۔ جس کا محرک خیال یہ تھا کہ سوویت نظام میں اندر سے تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ افغانستان میں دخل دینے والوں کے لئے اس میں ایک سبق ہے، یہ کہ افغانستان میں مداخلت کاروں کا اپنا شیرازہ منتشر ہو سکتا ہے۔ افغانوں کی طاقت سے نہیں بلکہ ان طاقتوں کی وجہ سے جو مداخلت کاروں کے کمزور

معاشروں میں سر اٹھا رہی ہیں۔ ہر ممکن جلدی سے افغانستان سے پرے ہٹنے کے بعد چند ہی برسوں میں امریکہ کو سفارت کاروں کی ہلاکت، سفارت خانوں کی تباہی، نیو یارک میں بموں کے دھماکوں اور اس کی گلیوں میں سستی ہیروئن کی تجارت جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اس لئے بھی کہ افغانستان بین الاقوامی دہشت گردی اور ڈرگ مافیا کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔ افغان، امریکہ کے ساتھ چھوڑ جانے پر سخت ناراض ہیں۔ انہوں نے امریکہ کی خاطر سرد جنگ لڑی۔ 1980ء کی دہائی میں امریکہ سوویت یونین کے ساتھ پورا اترنے کے لئے آخری افغان تک کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا، لیکن جب سوویت فوج افغانستان سے نکل گئی تو امریکہ امن کی بحالی اور بھوکے عوام کا پیٹ بھرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں تھا۔ علاقائی طاقتوں نے امریکہ کی پسپائی سے پیدا ہونے والے سیاسی خلاء سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا اثر بڑھانے کے لئے افغانستان کے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔

آج امریکہ ایک آدھ مسئلہ لے کر اس کے گرد اپنی پالیسیاں وضع کرنے لگا ہے، یہ پائپ لائنوں کا مسئلہ ہو، عورتوں سے بدسلوکی کا سوال ہو یا دہشت گردی ہو یا کچھ اور۔ غرض امریکہ یہی ثابت کر رہا ہے کہ اس نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ یونوکال کے ناکام پراجیکٹ سے امریکہ کے پالیسی سازوں کو بہت کچھ سیکھنا چاہیے تھا لیکن اس کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے۔ امریکی سفارت کار وسطی ایشیاء میں آئل کمپنیوں اور حکومتوں کو آمادہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ باکو سے سائی ہان تک بڑی پائپ لائن بچھائیں، لیکن اس میں بھی غیر معینہ عرصے تک تاخیر ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ 2000ء تک جو تعمیر شروع ہوئی تھی، وہ اب 2003ء پر جا پڑی ہے، جو 2005 تک بھی موخر ہو سکتی ہے۔ یونوکال کے پراجیکٹ کی ناکامی کے کئی اسباق ہیں۔ وسطی ایشیاء سے کوئی پائپ لائن اس وقت تک نہیں بچھائی جا سکتی جب تک علاقے افغانستان، تاجکستان، نگورنو کاراباخ، چیچنیا اور جارجیا میں امن قائم اور کردوں کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ تصفیہ طلب

MashalBooks.org

لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے یہ علاقہ بارود کا ڈھیر بنا ہوا ہے، جو کسی وقت بھی بھک سے اڑ سکتا ہے۔ جب تک علاقے میں عمومی مفاہمت نہیں ہو جاتی کوئی محفوظ پائپ لائن تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ روس کو بھی علاقے کی ترقی کے عمل سے ہمیشہ کے لئے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ روس جب تک منصوبوں کے نفاذ اور تکمیل میں شریک نہیں ہوتے، وہ ان کی مزاحمت بھی کرتے رہیں گے اور انہیں ناکام بنانے کی سعی میں بھی مصروف رہیں گے، اس طرح جب تک مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والوں میں جاری جنگ و جدل اور ریاستوں میں اختلاف کا بیج بونے کا سبب بنا رہتا ہے۔ پائپ لائنیں بچھانا محض خواب و خیال رہے گا، نسلی اختلافات جدید دور کی ایک واضح حقیقت ہیں۔ جنہیں دور کرنے اور ریاستوں کو متحد رکھنے کے لئے مستقل اور مسلسل سفارتی کوششوں کی ضرورت ہے۔ جنگی سرداروں کو رشوت دے کر چپ کرانے کا طریقہ اس ضمن میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

جہاں خانہ جنگی ہو، سیاسی تبدیلیاں ہو رہی ہوں، عدم استحکام ہو، اسلامی بنیاد پرستی کا پیدا کردہ ماحول ہو، منشیات ہوں، اسلحے کی فراوانی ہو، وہاں آئیل کمپنیاں پائپ لائنیں نہیں بچھا سکتیں، وہ متذکرہ وجوہ کی بنا پر خطرے میں رہیں گی۔ پرانی عظیم گیم یا سازشی کھیل جن خطروں سے متعلق تھا، ان میں طاقت کا کبھی براہ راست استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ روس اور برطانیہ نے سرحدوں کا تعین کیا، معاہدوں پر دستخط کئے اور افغانستان کو اپنے درمیان بغیر ریاست کے طور پر قائم رہنے دیا۔ نئے کھیل کا مقصد علاقے کو استحکام سے بہرہ ور کرنا اور اسے مستقل شکل دینا ہونا چاہیے۔ کشیدگیاں اور مخالفتیں پیدا کرنا نہیں۔ امریکہ واحد عالمی طاقت ہے جو تمام ہمسایہ ملکوں کو افغانستان میں مداخلت کرنے سے روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسے یہ مقصد پورے عزم بالجزم سے حاصل کرنا چاہیے، اب تک اس نے جو گومگو کا رویہ اپنائے رکھا ہے، وہ ترک کر دینا چاہیے۔ سرد جنگ کے ختم ہونے سے پاکستان کی امریکہ سے شراکت ختم ہوگئی ہے۔ وہ گہرے اقتصادی بحران کا شکار ہے، اس کے باوجود وہ کابل میں اپنے حلقہ اثر میں توسیع کرنا

چاہتا ہے۔ پاکستان 1947ء میں قائم ہوا، جب سے اسے ہندوستان ایسے ہمسائے کی مخاصمت کا سامنا ہے، جو حجم میں اس سے سات گنا بڑا ہے۔ سلامتی سے متعلق تفکرات نے پاکستان کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن فوجی اور سول انٹیلی جینس سے تعلق رکھنے والے با اثر افراد 1950ء سے اس کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سول سوسائٹی کو کام کرنے ہی نہیں دیا۔ یہی لوگ پاکستان کی سلامتی کو درپیش خطروں کی نوعیت کا تعین اور ان کا حل پیش کرتے ہیں۔ منتخب حکومتوں، پارلیمنٹ، شہری تنظیموں اور رائے عامہ کو یہ فرض ادا کرنے ہی نہیں دیا گیا۔

1988ء سے چار منتخب حکومتوں کو برطرف کیا گیا۔ دس حکومتیں آئیں اور گئیں، اندرونی استحکام محض خیال و خواب ہے، تشخص، سیاسی جواز، اقتصادی بدنظمی، معاشرتی انتشار ایسے گہرے بحرانوں کی موجودگی میں اشرافیہ نے تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ شاہانہ طرز سے پھیلنے کا مظاہرہ کیا ہے۔ پاکستان دو محاذوں پر کشمیر اور افغانستان میں دوسروں کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اسلامی بنیاد پرستی، منشیات، اسلحے، سماجی انتشار کا ہدف ہے۔ اسے اس کے مضمرات کا کوئی دھیان نہیں، یہی وجہ ہے کہ طرز عمل کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ پاکستان طالبان طرز کے اسلامی انقلاب کے لئے پک چکا ہے، جس کے آنے سے مشرقِ وسطیٰ، جنوبی اور وسطی ایشیاء کا استحکام یقینی طور پر خطرے میں پڑ جائے گا۔

پاکستان کے پالیسی ساز یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ کابل میں کوئی مستحکم حکومت قائم ہوتو وہ تعمیرنو کے لئے پاکستان پر انحصار کرے گی۔ خوراک، تیل اور بیرونی دنیا سے تعلق کے لئے پاکستان ہی کا سہارا لے گی۔ افغانستان کی تعمیرنو کے لئے کارکن، ماہر کاریگر، ساز وسامان فراہم کرنے سے پاکستان کی معیشت کو فائدہ پہنچے گا۔ افغان مہاجر واپس جا سکیں گے۔ ان کے نان نفقے پر جو خرچ اٹھ رہا ہے، اس کا بار ختم ہو جائے گا اور وہ مخدوش اداروں کو پھر سے بہتر بنیادوں پر منظم کر سکے گا۔ ان پر موثر کنٹرول کرنے کے اہل ہو

جائے گا اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کر سکے گا۔

پاکستان، افغانستان کے معاملات میں رذیل ہے۔ ایران کی مداخلت دفاعی نوعیت کی ہے، وہ محدود اثر رکھنے اور طالبان کے مکمل اثر سے محفوظ رہنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن ایران نے بھی شیعہ کارڈ، فارسی زبان کا کارڈ کھیل کر اور نسلی گروپوں کی مدد کر کے انہیں ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کرنے اور یوں افغانستان کی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ایران نے ہزارہ قبائیل اور ازبکوں کی بطور خاص مدد کی ہے۔ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ایران نے طالبان مخالف اتحاد کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ایران کی پالیسیاں، ایرانی اشرافیہ کی اقتدار کے حصول کے لئے اندرونی کشمکش کی غماز ہیں۔ یہ کشمکش گزشتہ دو برس سے شدت اختیار کر چکی ہے۔

پاکستان اور ایران کے درمیان اعتماد اور مفاہمت کا مکمل خاتمہ، بحالی امن کے عمل کے لئے نقصان دہ اور افغانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ دونوں ملکوں ایران اور پاکستان کے درمیان افغانستان میں خانہ جنگی ختم کرانے کے سلسلے میں کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے ہاں بھی اور افغانستان میں بھی شیعوں اور سنیوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کے لئے مالی امداد دے رہے ہیں، جس سے پورے علاقے میں دھماکہ خیز فرقہ وارانہ جھگڑے شروع ہو سکتے ہیں۔ طالبان کے آنے سے افغانستان اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ فرقہ واریت، نسلی اختلافات اور ایک دوسرے کو مٹا ڈالنے کے منفی جذبے کی گرفت میں آ گیا ہے۔

وسط ایشیائی ممالک نئے کھلاڑی ہیں، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنے قومی مفادات کو درپیش خطروں سے بچنے کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت کا احساس کر لیا ہے۔ افغانستان میں پشتونوں کا غلبہ ان کے مفاد میں نہیں ہے۔ وہ طالبان طرز کے اسلامی جذبات کو پسند نہیں کرتے۔ افغانستان میں آباد ان کی نسلوں کے لوگ اگر شریک اقتدار ہو سکے تو وہ انہیں طالبان کے خلاف مزاحمت کے لئے امداد دیتے رہیں گے۔

اس سے پاکستان کے افغانستان کے راستے وسطی ایشیاء تک پائپ لائنیں بچھانے اور مواصلات کے رشتے قائم کرنے کے منصوبے کبھی عمل میں نہیں ڈھل سکیں گے۔

طالبان نے پورے ملک کو فتح کر لیا تو وسطی ایشیاء کی ریاستیں طالبان کی حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گی، لیکن اس کا کم ہی امکان ہے کہ وہ اپنے تیل اور گیس کو طالبان کے کنٹرول میں آئے ہوئے افغانستان اور پاکستان کے راستے برآمد کرنے پر آمادہ ہو سکیں۔

بظاہر سعودی عرب کوئی ایسی خارجہ پالیسی اپنا نہیں سکا جو اس کے قومی مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ اس کی خارجہ پالیسی کا محور وہابیت اور وہابی لابی کا مفاد ہے۔ ملا عمر نے سعودی شاہی خاندان کی ذاتی ہتک کی۔ جس کے بعد سعودیوں نے طالبان کی مدد کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہابیت برآمد کرنے کا اندرون ملک منفی اثر ہوا ہے اور شاہی خاندان کے اثر ورسوخ میں کمی ہونے لگی ہے۔ اسامہ بن لادن کی طرف سے سعودی حکومت پر رشوت ستانی اور بدنظمی کے ضمن میں نکتہ چینی کا سعودی عوام نوٹس لینے لگے ہیں۔ افغانستان میں امن قائم نہ ہوا تو درجنوں بن لادن، افغانستان میں اپنے اڈوں میں اسامہ بن لادن کی جگہ لینے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔

طالبان کے لئے سعودی حمایت ہر جگہ مسلمانوں کے لئے سخت پریشانی کا موجب ہے، کیونکہ طالبان اسلام کی جو تشریح کر رہے ہیں، وہ منفی اور تباہ کن ہے۔ مغربی دنیا اب اسلام کو طالبان اور اسامہ بن لادن کی دہشت گردی سے منسوب کرنے لگی ہے۔ بہت سے مغربی مبصر طالبان کو الگ طور پر دیکھنے کی بجائے اسلام کو مجموعی طور پر قابل مذمت گرداننے لگے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام میں برداشت کا مادہ نہیں، دوسرے وہ جدیدیت کے خلاف ہے۔ طالبان اکثر اسلامی بنیاد پرست گروپوں کی طرح اسلام کی تمام روایات کو چھوڑ کر صرف دینیات پر ہی زور دے رہے ہیں۔ اسلامی فلسفہ، سائنس، فنون، جمالیات اور تصوف کو انہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح اسلام کی

جامعیت اور تنوع اور معاشرت کی تعمیر سے متعلق قرآنی احکام کو جن کی اساس انصاف اور مساوات پر ہے، بھلا دیا گیا ہے اور اس حقیقت سے صرف نظر کر لیا گیا ہے کہ حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو انصاف اور مساوات کے اصولوں پر کاربند معاشرت کی خوبیوں سے بہرہ اندوز کریں۔ ابتدائی مسلم عرب تہذیب، ثقافتی دینی اور نسلی رنگا رنگی سے مزین تھی۔ آج اسلامی دنیا میں مملکتوں کی جو ناکامیاں دکھائی دیت ہیں، وہ سیدھی راہ سے بھٹک جانے، اصل جذبہ و احساس سے محروم ہو جانے، تنگی آمریت کے چنگل میں پھنس جانے اور دین کی تعبیر و تشریح میں وسعت نظری کا مظاہرہ نہ کر سکنے کا نتیجہ ہیں۔ مسلم تاریخ فتوحات، تجدید اور شکست کے چکر کی صورت میں رہی ہے۔ فریڈینڈ بروڈیل نے لکھا ہے کہ شاید یہ اسلام کا مقدر رہا ہے کہ اس نے ازمنہ قدیم کے لوگوں کو جو اس کے حلقے میں آئے، متاثر کیا لیکن پھر ان کی طاقت کی زد میں آ گیا۔ زخم لگتے اور مندمل ہوتے رہے۔ اسلام کی شہری زندگی نے خود سر جنگی سرداروں کو انسان بنا دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا طالبان اسلامی روایت کی پیروی میں اپنے آپ کو بدل سکیں گے یا اپنی پالیسیوں میں اعتدال پیدا کر سکیں گے؟ اور افغانستان کی نسلی اور ثقافتی تنوع کو جذب کر کے افغانستان کے جائز حکمران بن سکیں گے؟ ان کی موجودہ صورت میں تو یہ مشکل دکھائی دیتا ہے۔ طالبان دراصل قبائلی معاشرے، جسے وہ نظر انداز کرنے کی کوشش میں ہیں اور ریاستی ڈھانچے کے درمیان جسے قائم کرنے سے وہ انکار کرتے ہیں، پھنسے ہوئے ہیں۔ پشتونوں میں قبائلی تقسیم، اقتدار کے بنیادی تقاضے پورے کرنے میں سرراہ ہے۔ طالبان غیر پشتونوں کو نظر انداز کر کے کسی نچلی سطح کے بھی مطالبات کی تسکین کا اہتمام نہیں کر سکے۔ ماضی میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پشتونوں کے غلبے کے باوجود کاروبار ریاست چلانے کے لئے تمام نسلی گروپوں کی اہم شخصیتوں کی شرکت اور تعاون کا حصول لازم ہے۔ بیوروکریسی اور فوج دونوں میں غیر پشتونوں نے ہمیشہ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ رائے افغان سکالر اشرف غنی کی ہے، جس کی صداقت

سے کوئی صاحب الفکر انکار نہیں کر سکتا۔ طالبان چونکہ افغان تاریخ سے نا آشنا ہیں، اس لئے وہ تاریخ کے پورے دھارے کو موڑنے کی کوشش میں ہیں۔

طالبان افغان ریاست کی وضاحت کرنے سے بھی انکار کرتے ہیں، ریاست ہوگی تو اس پر حکومت کی جا سکے گی۔ لیکن وہ کیا چاہتے ہیں؟ اس کا ان کے ذہن میں کوئی خاکہ نہیں ہے۔ مرکزی حاکمیت، ریاستی تنظیموں، کمان اور کنٹرول کے اصولوں اور کوئی میکنزم، جس کے ذریعے عوام کی شرکت کا اہتمام ہو سکے، لویا جرگہ، اسلامی شوریٰ یا پارلیمنٹ، عوام کو ریاستی امور میں شریک کرنے کے وسیلے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں اکثر افغانوں کے لئے طالبان کو ماننا یا بیرونی دنیا کا طالبان کی حکومت کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ ایک موثر حکومت کے قیام کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ایک مشترکہ اور قابل قبول ریاست کی وضاحت ہو جائے۔ جو جنگ کے لگائے ہوئے زخموں کے اندمال کا بندوبست کرنے پر قادر ہو۔ لیکن ملا عمر کے گرد جو قندھاری گروپ جمع ہے وہ نہ تو بیرونی عناصر کو تسلیم کرنے پر تیار ہے اور نہ ہی بیرونی مشورہ قبول کرنے پر آمادہ ہے۔ طالبان کے اندر تقسیم کا عمل بڑی تیزی سے جاری ہے۔ یہ بعید از امکان نہیں کہ اعتدال پسند طالبان ملا عمر کے اور قندھاری گروپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ کوئی جنگی سردار کبھی اپنے آپ کو شہری عوام کے سلسلے میں ذمہ دار قرار نہیں سمجھا کرتا۔

اقوام متحدہ اور این جی اوز اس بنیادی سوال پر غور کرنے لگے ہیں کہ وہ انسانی بنیادوں پر جو امداد فراہم کر رہے ہیں وہ خانہ جنگی کو طول دینے کا سبب بن گئی ہیں کیونکہ بیرونی امداد کے سبب آبادی زندہ ہے۔ جنگی سردار عوام کے تعلق میں اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے کہ جنگ سے بے نیاز ہو کر انہیں عام لوگوں کی ضروریات بھی پوری کرنا ہے۔ وہ تمام وسائل کو جنگ کی آگ میں جھونک رہے ہیں۔ سوڈان اور صومالیہ میں بھی اقوام متحدہ اور امدادی ایجنسیوں کو اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس طرح بین الاقوامی امدادی اداروں کو آج اور آئندہ بھی ایک بہت بڑا چیلنج درپیش رہے گا۔ ایسا

دکھائی دیتا ہے کہ ایک ہی افغان این جی او ہے جس کی بنیاد سمگلنگ اور منشیات کے ناجائز کاروبار پر ہے، جو تھوڑی سی تعمیر طالبان نے کی ہے وہ سمگلنگ اور منشیات کی نقل و حمل میں آسانی پیدا کرنے کے تعلق سے کی ہے۔ مثلاً سڑکوں کی مرمت کی گئی ہے، پٹرول پمپ قائم کئے گئے ہیں، امریکی تاجروں کو موبائیل، ٹیلی ویژن نظام قائم کرنے کے لئے مدعو کیا گیا ہے، یہ سب کچھ ناجائز کاروبار کی رفتار بڑھانے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ اس کے تمام تر فوائد ٹرانسپورٹ اور ڈرگ مافیا کو حاصل ہو رہے ہیں۔ کسی جنگی سردار نے سکولوں کی عمارات، ہسپتالوں، آب رسانی کا نظام یا شہری ترقیات سے متعلق کسی ادارے کی تعمیر نہیں کی ہے۔

موجودہ شکل میں طالبان افغانستان پر حکومت کرنے یا بین الاقوامی برادری کی طرف سے تسلیم کئے جانے کی امید نہیں رکھ سکتے۔ وہ شمالی افغانستان فتح کر لیں تو جب بھی وہ استحکام نہیں لا سکتے۔ غیر پشتون ان کے خلاف چھاپہ مار جنگ جاری رکھیں گے، یہ جنگ اس دفعہ وسطی ایشیاء اور ایران سے ہوگی، جس سے علاقے میں اور زیادہ عدم استحکام پیدا ہوگا۔ افغانستان کی پشتون پٹی میں طالبان کا واحد متبادل مزید بدنظمی اور انتشار ہی ہو سکتا ہے۔ کابل کے جنوب کے افغانوں کی اکثریت غالباً اس سے اتفاق کرے گی کہ طالبان آج اتنے ہر دل عزیز نہیں جتنے اپنی آمد کے وقت تھے۔ لیکن عام لوگوں کے لئے ان کے تحفظ اور بہبود کے لئے وہ لوگ ان سے اچھے ہیں جو ان کے آنے سے پہلے تھے۔ ان کا کوئی صحیح متبادل نہیں، سوائے انتشار کے۔ مگر طالبان کو محض خواہش سے ہٹانا ممکن نہیں۔ البتہ یہ امکان ضرور ہے کہ طالبان مختلف دھڑوں میں بٹ جائیں اور ایک دوسرے سے الگ اور ایک دوسرے کے مخالف علاقوں میں محدود ہو جائیں۔ کابل، قندھار اور ہرات ان علاقوں کے مراکز ہیں۔

طالبان کا مخالف اتحاد جنوبی پشتون علاقے کو فتح کرنے اور اس پر حکومت کرنے کا اہل نہیں، مسعود اب تک اتنے پشتونوں کو اپنا ہم نوا نہیں بنا سکے جو طالبان کو مسترد کرتے

MashalBooks.org

ہوں اور جو انہیں قومی سطح کی حیثیت دے سکتے ہوں۔ اپوزیشن کے لئے زندہ رہنے کا ایک ہی امکان یا صورت ہے کہ وہ پشتونوں کے بعض دھڑوں کو اپنے ساتھ ملا سکیں۔ بلاشبہ اس سے جنگ طول پکڑ لے گی لیکن اس سے طالبان بھی کمزور ہوں گے اور شاید یہ بھی ممکن ہو جائے کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے گفت وشنید کرنے پر راضی ہو جائیں۔ طالبان مخالف اتحاد کوئی ایسا کم سے کم ریاستی ڈھانچے بھی نہیں بنا سکے یا کوئی نمائندہ قیادت سامنے نہیں لا سکے کہ تمام غیر پشتونوں کو جذب کر سکتے یا ساتھ ملا سکتے۔ ان کے اندرونی اختلافات اور لڑائی جھگڑوں اور لیڈروں کی حصول اقتدار کے لئے کشمکش نے بہت سے افغانوں کی نظروں میں ان کا وقار کم کر دیا ہے، وہ اگرچہ طالبان کو پسند نہیں کرتے لیکن انہیں طالبان مخالف اتحاد پر بھی کوئی اعتماد نہیں۔

حصے بخرے ہونے کا ڈر شروع سے ہی موجود رہا ہے اور 1996ء سے ہی جنوب اور شمال کے درمیان لکیر کھینچی چلی آ رہی ہے۔ جنوب پشتون کا اور شمالی غیر پشتونوں کا جنہیں کوہ ہندوکش ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ رہا کابل تو اس کے لئے دونوں فریقوں میں مقابلہ ہے۔ مختلف علاقوں میں جس وسیع پیمانے پر قتل عام ہوتا رہا ہے، فرقہ واریت کو ہوا ملتی رہی ہے اور نسل کشی کی مہمیں چلتی رہی ہیں، ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ خوش قسمتی سے جنگی سرداروں میں کوئی ملوشیوچ یا صدام حسین نہیں جو اپنے اقتدار کے تحفظ اور ایک دوسرے سے مخاصمتوں کی بقاء کے لئے ملک کی تقسیم تک کی قیمت چکانے کے لئے تیار ہو۔ مداخلت کے باوجود کسی ہمسائے کو یہ بھی پسند نہیں کہ افغانستان کے حصے بخرے ہو جائیں، کیونکہ اس صورت میں نسلی امتیازات کا پنڈورا باکس کھل جائے گا، جو افغانستان کی سرحدوں کے باہر بھی اثر انداز ہونے لگے گا۔ اس کے علاوہ وسیع پیمانے پر ہجرت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، مہاجروں کی آمد کے ساتھ منشیات، اسلحہ اور اسلامی بنیاد پرستی کمزور ریاستوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ افغان ریاست کی رسمی تقسیم یا حصوں میں

بٹنا ممکن ہے لیکن اب تک کسی فریق نے اس کی خواہش نہیں کی، اسی سے مستقبل میں امن کی بحالی کا دور شروع ہونے کی کچھ امید بندھتی ہے۔

اقوام متحدہ کی قیام امن کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ جب تک بیرونی طاقتیں جنگی سرداروں کی پیٹھ تھپکتی رہیں گی، انہیں مالی امداد اور اسلحے دیتی رہیں گی، اس وقت تک خانہ جنگی ختم نہیں ہو سکے گی، ایک حل ممکن ہے وہ یہ کہ بحالی امن کے لئے افغانستان کے باہر سے عمل کا آغاز ہو۔ افغانستان کے تمام ہمسایہ ممالک پہلے اس بات پر رضامند ہو جائیں کہ وہ افغانستان میں اسلحہ نہیں جانے دیں گے۔ وہ اس پر سختی سے کاربند ہوں اور اقوام متحدہ کو اس کا موثر جائزہ لینے دیں۔ علاقائی ریاستیں اپنے اپنے پسندیدہ فریقوں کو پورے ملک پر حکومت کرنے پر اکسانے اور شہ دینے کی بجائے افغانستان میں محدود علاقوں کو اپنا حلقہ اثر قرار دے لیں۔ ایران اور پاکستان باہم مذاکرات کے ذریعے طے کر لیں کہ پاکستان اپنے اثر کو پشتون پٹی تک محدود رکھے گا، جبکہ ایران مغربی وسطی افغانستان میں اثر رکھنے اور شیعہ اقلیت کے تحفظ کے لئے ضمانتیں حاصل کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔

مختصراً یہ کہ ہر ہمسایہ ملک نہ صرف اپنی قومی سلامتی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا بلکہ دوسرے ہمسایوں کی سلامتی کو بھی مساوی درجہ دے گا۔ افغانستان میں بیرونی اثر کو ختم نہیں کیا جا سکتا، لیکن باہمی رضامندی سے اور قابل قبول حد تک اسے محدود رکھا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی ہمسایہ ملک اپنے ہمسایوں کی سلامتی سے متعلق مفادات کو نقصان پہنچانے کا نہیں سوچ سکتی۔ اس ضمن میں کسی معاہدہ پر کام کرنا خاص شکل ہے، اس میں سفارت کاروں کے علاوہ ہر ملک کی فوج اور انٹیلی جینس کے افسر بھی شریک ہوں گے۔ اقوام متحدہ اور عالمی برادری بھی ضمانت دے گی کہ جو معاہدے طے پائیں گے وہ آئندہ افغانستان کے حصے بخرے کرنے کا سبب نہیں بنیں گے اور نہ ہی افغانستان میں حکومت کے قیام کے عمل میں دخل اندازی کا موجب ہوں گے۔

افغانستان کے داخلی تصفیے کے لئے وسیع البنیاد حکومت کے قیام پر اصرار لاحاصل ہے۔ ملا عمر اور مسعود کے یک جا بیٹھنے اور مل کر کابل سے حکومت کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جنگ بندی ہو، ابتدائی مرحلے میں ایک کمزور مرکزی حکومت قائم ہو۔ اتفاق رائے سے کابل کو غیر فوجی شہر اور علاقہ قرار دیا جائے اور علاقائی سطح پر جو دھڑے قابض ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے، تمام دھڑے ایک مضبوط مرکزی حکومت کے قیام پر طویل مدت کے لئے رضامند ہوں۔ البتہ مختصر مدت کے لئے اپنی خودمختاری قبول کرلیں۔ اس طرح وہ اپنی آزادی اور فوجی یونٹ برقرار رکھ سکیں گے لیکن اس کے ساتھ کابل میں ایک مرکزی پولیس فورس کی تشکیل میں حصہ بٹائیں گے۔ مختلف دھڑے تعمیر نو کے لئے آزادانہ بنیاد پر بیرونی امداد حاصل کریں گے، لیکن ملک کے تباہ شدہ ڈھانچے کی تعمیر کے لئے مرکزی حکومت کے توسط سے مل جل کر کام کریں گے۔ اسی طرح ان کے درمیان زیادہ مفاہمت اور اعتماد پیدا ہوگا۔ تمام دھڑے اپنے علاقوں میں انتخاب یا چناؤ کے ذریعے نمائندہ ادارے قائم کرنے کے لئے عمل کا آغاز کریں گے، یہ ادارے پایان کار، مرکزی جرگہ یا شوریٰ قائم کرنے کا وسیلہ بنیں گے۔

اس نوع کے معاہدے کرنا کتنا مشکل ہوگا، اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر موجودہ حالات میں جب مختلف فریقوں اور دھڑوں میں دشمنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، بہرحال ان سب کو اسی طرح آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ تعمیر نو کا ایک بڑا پیکج تیار کیا جائے، جو بین الاقوامی امدادی اداروں، عالمی بنک یا بڑے معطیوں نے بنایا ہو اور جس پر اسی صورت میں عمل درآمد ہو جب کم سے کم بنیادی تصفیہ ہو جائے۔ یہ بنیادی طور پر جنگی سرداروں کے لئے رشوت اور افغان عوام کے لئے ان پر دباؤ ڈالنے کے ل ئے تحریک ہوگی کہ وہ معاہدہ قبول کرلیں۔ بحالی امن کے لئے سنجیدہ عمل اور عالمی برادری کی طرف سے قیام امن کے سچے جذبے سے کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے

میں اب تک جو رویہ اپنائے رکھا گیا ہے، اس کی اصلاح کرنا ہوگی۔

افغانستان میں قیام امن سے پورے خطے کو بے پناہ فوائد حاصل ہوں گے۔ افغانستان میں تعمیر نو سے اقتصادی فائدہ ہوگا۔ افغان جنگ سے اس خطے میں اسلحہ کی جو بھر مار ہوئی ہے، منشیات، دہشت گردی، فرقہ پرستی اور کالے دھن کے سبب سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں وہ ان سے عہدہ برآء ہو سکے گا۔ علاقے میں پاکستان کی تنہائی ختم ہو سکے گی۔ وہ وسط ایشیاء سے مواصلات کا سلسلہ قائم کر سکے گا اور اس کے توسط سے وسط ایشیائی ریاستوں کو سمندر تک رسائی کا بہت ہی چھوٹا راستہ مل جائے گا۔ ایران عالمی برادری میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکے گا۔ اسے وسطی ایشیاء، جنوبی ایشیاء اور مشرقِ وسطیٰ کے مرکز میں ایک بڑی تجارتی ریاست کا درجہ مل جائے گا۔ ترکی کو افغانستان میں ترکی نسل کے لوگوں سے اپنے تاریخی رشتے بحال کرنے میں مدد ملے گی۔

چین کو زیادہ احساس تحفظ ملے گا اور اسے پسماندہ مسلم صوبے سنکیانگ کی اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے کی مہلت ملے گی۔ روس وسطی اور جنوبی ایشیاء سے زیادہ حقیقت پسندانہ روابط قائم کر سکے گا، ان روابط کی اساس اقتصادی حقائق پر ہوگی۔ چھوٹی اجارہ دارانہ خواہشات ان کی محرک نہیں ہوں گی، اس کے اعصاب پر افغان جنگ کے سبب سے جو خوف اور تناؤ مسلط ہوا تھا، اس سے چھٹکارا پا لے گا۔ افغانستان سے گزرنے والی تیل اور گیس کی پائپ لائنیں، افغانستان کا تعلق علاقے بھر سے قائم کرنے کا واسطہ ہوں گی، اسے اپنی تباہ شدہ معیشت کی بحالی اور تعمیر نو کے لئے بیرونی امداد تیزی سے میسر آنے لگے گی۔ امریکہ وسط ایشیاء کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندانہ پالیسی وضع کر سکے گا اور ایک محفوظ ماحول میں علاقے کی توانائی کے وسائل سے استفادہ کر سکے گا اور دہشت گردی سے موثر طور پر نمٹ سکے گا۔

لیکن اگر افغانستان میں جنگ جاری رہتی ہے اور ہم اسے نظر انداز کئے رکھتے ہیں تو پھر بدترین نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ پاکستان کو طالبان کی طرز کے اسلامی

انقلاب کا سامنا کرنا پڑے گا، جو اسے اور پورے علاقے کو مزید غیر مستحکم کر دے گا۔
ایران عالمی برادری سے الگ تھلگ اور اس کی مغربی سرحد عدم استحکام کا شکار رہے گی۔
وسط ایشیائی ریاستیں اپنے توانائی اور معدنی وسائل، مختصر راستوں کے ذریعے برآمد نہیں کرسکیں گی۔ ان کی اقتصادی حالت تباہ ہوئی تو انہیں اسلامی انتہا پسندوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عدم استحکام ان کا مقدر رہے گا۔ اس کے باوجود روس کی معیشت اور معاشرت انحطاط پذیر ہے۔ وہ وسطی ایشیاء پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لئے کوشاں رہے گا۔

MashalBooks.org

ضمیمہ 1

1966ء میں کابل پر قبضے کے بعد عورتوں اور دیگر ثقافتی مسائل کے بارے میں طالبان کے فرامین

مذہبی پولیس: امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے متعلق صدارت عامہ کا فرمان کابل، نومبر 1996ء۔

عورتو! اپنے گھروں سے باہر نہ نکلو، اگر نکلنا پڑے تو ان عورتوں کی طرح نہ نکلو جو اسلام سے پہلے فیشن ایبل لباس پہنتی، سرخی پوڈر لگاتی اور مردوں کے سامنے بے حجاب آ جایا کرتی تھیں۔

اسلام نجات دلانے والا مذہب ہے، اس نے عورتوں کو خصوصی وقار دلانے کا عہد کر رکھا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو قابل قدر ہدایات دی ہیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ ایسے بے کار لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بنیں جو انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ عورتوں اپنے خاندان کے لئے استاد کا درجہ رکھتی ہیں، انہیں افراد خاندان میں ربط وضبط قائم رکھنے کی ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔ خاوند، بھائی اور باپ، خاندان کو ضروریات زندگی (خوراک کپڑا وغیرہ) فراہم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ عورتوں کو تعلیم، معاشرتی ضروریات یا سماجی خدمت کے سلسلے میں گھر سے نکلنا پڑے تو وہ اسلامی شریعت کے احکام کے مطابق اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھیں، جو عورتیں زیب وزیبائش کے ساتھ زیورات سے آراستہ، تنگ اور خوبصورت لباس پہن کر اپنے آپ کو دکھاتی ہیں، ان پر اسلامی شریعت

کی رو سے لعنت ہے، وہ کبھی جنت میں نہیں جائیں گی۔

خاندان کے تمام بڑوں اور ہر مسلمان کی اس ضمن میں ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہماری تمام بزرگوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے خاندان پر صحیح طرح کنٹرول رکھیں اور معاشرتی مسائل اور مشکلات سے بچیں۔ بصورت دیگر ان عورتوں کو دھمکایا جائے گا۔ ان سے باز پرس ہوگی اور انہیں اور خاندان کے بزرگوں کو مذہبی پولیس کی طرف سے سخت سزا دی جائے گی۔

مذہبی پولیس (منکرات) کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان معاشرتی مسائل کے خلاف جدوجہد کریں اور یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رکھیں جب تک یہ برائیاں ختم نہیں ہو جاتیں۔

(2)

سرکاری ہسپتالوں، نجی کلینکوں کے اسلامی شرعی اصولوں کے مطابق طریق کار، جو امیر المومنین ملا محمد عمر کی جانب سے وزارت صحت نے متعین کیا۔

کابل، نومبر 1996ء:

1۔ عورتیں علاج کے لئے خواتین معالجوں کے پاس جائیں۔ اگر کسی مرد معالج کی ضرورت پڑ جائے تو بیمار خاتون اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے ساتھ اس کے پاس جائے۔

2۔ مریضہ کے طبی معائنے کے وقت مریضہ اور معالج دونوں شرعی حجاب پہنے رہیں۔

3۔ مرد معالج سوائے متاثرہ حصہ کے مریضہ کے کسی دوسرے حصے کو نہ دیکھے اور نہ چھوئے۔

4۔ بیمار خواتین کی انتظار گاہیں محفوظ طور پر باپردہ ہونی چاہئیں۔

5۔ بیمار عورتوں کی باری لگانے والی بھی عورت ہونی چاہے۔

6۔ رات کو ہسپتال کے جن کمروں میں بیمار عورتیں ہوں، ان میں کوئی مرد ڈاکٹر بلائے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔

7۔ مرد ڈاکٹروں اور خاتون ڈاکٹروں کے مل بیٹھنے اور باہم گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کسی مسئلے پر تبادلہ خیال ضروری ہو تو حجاب کے ساتھ کیا جائے۔

8۔ خاتون ڈاکٹر سادہ لباس پہنیں، انہیں نئے سٹائیل کے کپڑے پہننے، سرخی پوڈر لگانے اور زیب وزیبائش کی اجازت نہیں۔

9۔ خاتون ڈاکٹر اور نرسوں کو ان کمروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں جہاں بیمار مرد ہوں گے۔

10۔ ہسپتال کا عملہ مقررہ اوقات میں مساجد میں نماز ادا کرے گا۔

11۔ مذہبی پولیس کسی وقت بھی معائنے یا کنٹرول کے لئے جاسکتی ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا، جو ان احکام کی خلاف ورزی کرے گا، اسے اسلامی قوانین کے مطابق سزا دی جائے گی۔

(3) صدارت عامہ: امر بالمعروف، دسمبر 1996ء۔

1۔ عورتوں کی سرکشی اور بے حجابی روکنے کے لئے کوئی ڈرائیور راستے میں کسی ایسی عورت کو گاڑی میں نہیں بٹھائے گا، جس نے ایرانی طرز کا برقعہ پہن رکھا ہوگا۔ اس حکم کی خلاف ورزی پر ڈرائیور کو قید کی سزا دی جائے گی، اگر اس طرح کی عورتیں گلی کوچوں میں نظر آئیں گی تو ان کے گھر تلاش کر کے ان کے خاوندوں کو سزا دی جائے گی۔ اگر عورتیں بھڑکیلے اور دلکش لباس پہنے ہوں گی اور ان کے ساتھ کوئی مرد رشتے دار نہیں ہوگا تو ڈرائیور انہیں اپنی گاڑی میں نہیں بٹھائیں گے۔

2۔ موسیقی کی ممانعت کے لئے ابلاغ عامہ کے ذرائع کی طرف سے کئی جانے والے نشریے، دکانوں، ہوٹلوں، موٹر گاڑیوں، رکشوں میں کیسٹ اور موسیقی ممنوع ہے۔ پانچ دن تک جائزہ لیا جائے گا، اس کے بعد اگر کسی دکان سے کیسٹ نکلا تو دکاندار کو قید میں ڈال دیا جائے گا اور دکان مقفل کر دی جائے گی۔ پانچ افراد کی ضمانت پر دکان کھول دی جائے گی اور بعد میں قیدی کو رہا کر دیا جائے گا، اگر کسی موٹر گاڑی میں سے کیسٹ نکلا تو ڈرائیور کو قید کر دیا جائے گا۔ پانچ گواہوں کی ضمانت پر گاڑی چھوڑ دی جائے گی اور ڈرائیور کو بعد میں رہا کر دیا جائے گا۔

3۔ داڑھی مونڈنے اور تراشنے کو روکنا: ڈیڑھ ماہ تک شیو نہ کرنے کے بعد اگر کسی نے داڑھی مونڈی اور داڑھی تراشی تو اسے اس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک اس کی داڑھی بڑھ نہیں جاتی۔

4۔ کبوتر پالنے اور تاش کھیلنے کی روک تھام کے لئے: دس دن کے اندر یہ عادت یا مشغلہ ترک کرنا پڑے گا، دس دن کے بعد کبوتر اور دوسرے پالتو پرندے مار دیئے جائیں گے۔

5۔ پتنگ بازی کی ممانعت کے لئے شہر میں پتنگوں کی دکانیں ختم کر دی جائیں گی۔

6۔ بت پرستی کی ممانعت کے لئے: موٹر گاڑیوں اور دکانوں، ہوٹلوں، کمروں اور دوسری جگہوں سے تصویریں، پورٹریٹ ختم کر دیئے جائیں گے۔ سرکاری عملے کے ارکان ان جگہوں میں لگی تصویریں پھاڑ دیں گے۔

7۔ جوئے کی روک تھام کے لئے: پولیس کی مدد سے جوئے خانے تلاش کر کے جواریوں کو ایک مہینے کے لئے قید کر دیا جائے گا۔

8۔ منشیات کا استعمال ختم کرانے کے لئے: نشہ بازوں کو قید کرایا جائے گا اور منشیات فراہم کرنے والے افراد اور دکانوں کا پتہ چلایا جائے گا، دکانیں مقفل کر دی

MashalBooks.org

جائیں گی۔ دکانداروں اور نشہ کرنے والوں کو سزا دی جائے گی اور قید میں ڈال دیا جائے گا۔

9۔ برطانوی اور امریکی طرز کے بال تراشنے کی ممانعت کے لئے ان لوگوں کو جو لمبے بال رکھتے ہیں، گرفتار کر کے مذہبی پولیس کے محکمے میں لے جا کر ان کے بال کاٹ دیئے جائیں گے۔ بال کاٹنے کا معاوضہ مجرموں سے لے کر حجام کو دیا جائے گا۔

10۔ قرضوں پر سود: بڑے نوٹوں کے عوض چھوٹے نوٹ لینے پر اور منی آرڈروں پر معاوضہ کی روک تھام کے لئے، تمام منی چینجروں کو مطلع کیا جائے گا کہ رقوم کے ان تین قسم کے تبادلوں پر عائید پابندی کی خلاف ورزی پر طویل عرصے کی قید کی سزا دی جائے گی۔

11۔ شہر میں بہتی ندیوں کے کنارے نوجوان لڑکیوں کے کپڑے دھونے پر پابندی ہے، جو نوجوان لڑکیاں اس ضابطے کی خلاف ورزی کریں گی، انہیں اسلامی قواعد کے مطابق پورے احترام کے ساتھ ان کے گھروں میں لے جایا جائے گا اور ان کے خاوندوں کو شدید سزا دی جائے گی۔

12- شادی بیاہ کے موقعے پر ناچ گانے کی ممانعت، خلاف ورزی پر خاندان کے سربراہ کو گرفتار کر کے سزا دی جائے گی۔

13۔ موسیقی کے لئے ڈھول وغیرہ بجانے کی روک تھام: اس کی ممانعت کا اعلان کیا جائے گا، اگر کوئی خلاف ورزی کرے گا تو مذہبی علماء سے فیصلہ کرنے کے لئے کہا جائے گا۔

14۔ عورتوں کے لباس سینے اور درزیوں کو ان کا ماپ لینے کی ممانعت ہوگی، دکانوں میں عورتوں کے یا فیشن کے میگزین نکلے تو درزی کو قید کر دیا جائے گا۔

15۔ جادوگری روکنے کے لئے: تمام متعلقہ کتابیں جلا دی جائیں گی اور جادوگروں

کواس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ وہ تائب نہیں ہو جاتے۔

16۔ نماز ادا نہ کرنے والوں کے لئے اور بازار میں نماز کے لئے اجتماع کا حکم:
نماز مقررہ اوقات پر ادا کی جائے گی۔ تمام گاڑیوں کی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔ تمام لوگوں کے لئے مساجد میں جانا لازم ہوگا۔ نوجوانوں کو نماز کے وقت دکانوں میں دیکھا گیا تو انہیں قید کر لیا جائے گا۔

MashalBooks.org

ضمیمہ 2

طالبان کا ڈھانچہ

طالبان کے رہنما ملا محمد عمر ہیں جو امیر المومنین کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ایک دس رکنی عبوری حکمران کونسل یا سپریم شوریٰ، سب سے طاقتور حکمران ادارہ ہے، اس کا صدر مقام قندھار ہے، دو کمیٹیاں شوریٰ کو رپورٹ کرتی ہیں، ایک کابل کی شوریٰ کی عبوری کابینہ ہے، دوسری فوجی شوریٰ ہے۔سپریم شوریٰ کے بنیادی ارکان، قندھار 1997-1994ء

ملا محمد عمر امیر المومنین، طالبان کی تحریک کے سربراہ۔

ملا محمد غوث اخوند قائم مقام وزیر خارجہ، جون 1997ء تک

ملا محمد حسن اخوند ملٹری چیف آف سٹاف

ملا محمد فاضل اخوند سربراہ آرمی کورز

ملا عبدالرزاق سربراہ کسٹمز ڈیپارٹمنٹ

ملا سید غیاث الدین آغا قائم مقام وزیر اطلاعات

ملا خیرالدین خیرخواہ قائم مقام وزیر داخلہ

ملا عبدالستار سنسانی قائم مقام چیف جسٹس افغانستان

ملا احسان اللہ احسان گورنر سٹیٹ بینک

ملا عبدالجلیل قائم مقام وزیر خارجہ امور، جون 1997ء کے بعد فوجی شوریٰ کا ڈھانچہ

ملا محمد عمر کمانڈر انچیف

ملا محمد حسن ملٹری چیف آف سٹاف

ملا رحم اللہ اخوند　　چیف آف آرمی سٹاف

ملا محمد فاضل　　سربراہ آرمی کورز

ملا جمعہ خان　　آرمی ڈویژن کے سربراہ

ملا محمد یونس　　آرمی ڈویژن کے سربراہ

ملا محمد گل　　آرمی ڈویژن کے سربراہ

ملا محمد عزیز خان　　آرمی ڈویژن کے سربراہ

ملا محمد طاہر آرمڈ فورس نمبر 4 کابل شوریٰ کے قائم مقام وزراء 1999ء

ملد محمد عباس اخوند　　پبلک ہیلتھ

ملا عبید اللہ اخوند　　ڈیفنس

ملا داڑ اللہ اخوند　　تعمیرات

ملا طاہر انوری　　خزانہ

ملا امیر خان متقی　　اطلاعات وثقافت

ملا عبداللطیف منصور　　زراعت

ملا محمد عیسیٰ　　پانی اور بجلی

ملا احمد اللہ نانائی　　مواصلات

ملا نور الدین ترابی　　انصاف

مولوی حمد اللہ نعمانی　　اعلیٰ تعلیم

مولوی احمد جان　　معدنیات اور صنعت

مولوی جلال الدین حقانی　　قبائلی امور

مولوی فیض اللہ فیضان　　تجارت

قاری دین محمد　　منصوبہ بندی

مولوی کلام الدین　　وزیر برائے مذہبی پولیس

MashalBooks.org

طالبان تحریک کے ارکان کا حسب نسب

د = درانی پشتون سابق جماعتی نسبتیں

غ = غلزئی پشتون حزبی (خ) حزب اسلامی (یونس خالص)

ن = پشتون نہ درانی، نہ غلزئی حزبی (ح) حزب اسلامی (گلبدین حکمت یار)

دگ = دوسرے نسلی گروپ جم = جماعت اسلامی (ربانی)

ب ا = بانی ارکان طالبان

ن 1 ف ا = نیشنل اسلامی فرنٹ آف افغانستان (گیلانی

مج = سابق مجاہد کمانڈر

حر = حرکت (مولوی محمد نبی محمدی)

نام عہدہ نسب/عمر قبیلہ/عہدہ تفصیل

ایم محمد عمر لیڈر

میونہ/قندھار 37 سال بانی رکن

غ۔ ہوتک۔مج سابق حزبی (خ)

قندھار مدرسہ کے تعلیم یافتہ یک چشم: حکومت کے سربراہ

ایم محمد ربانی چیئرمین کابل شوریٰ

قندھار 38 سال بانی رکن

کاکڑ۔مج، سابق حزبی (خ)

محمد حسن

1997ء کے بعد وزیر خارجہ

قندھار

غ۔ ہوتک (مج)

تعلیم، مدرسہ

MashalBooks.org

ایم محمد غوث

وزیر خارجہ 1997ء میں ریٹائرڈ قندھار بانی رکن 50 سال

7 انتزئی (مجاہد) سابق حزبی (خ) ایک آنکھ سے محروم، دوسری سے بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ ملاعمر کے قریبی دوست 1987ء میں مزار شریف پر قبضہ کیا۔

عبدالرزاق محکمہ کسٹمز قندھار (د) یوپلزئی سابق (حزبی) (خ)

[tag]1cp5 ایم سعید غیاث الدین

تعلیم

فریاب

مجاہد سابق (حرکت)

رسمی تعلیم نہیں، تاجر، کان میں بالے پہنتے ہیں

ایم خیر اللہ خیر خواہ

داخلہ

قندھار

د، یوپلزئی مجاہد، سابق، حرکت

حقانیہ کے فارغ التحصیل

احسان اللہ خان

گورنر سٹیٹ بینک

قندھار پنجواج

غلزئی پشتون

سابق گورنر خوست۔ 1997ء میں مزار شریف میں ہلاک ہوئے

مولوی عبدالستار سنانی

MashalBooks.org

[5pc2]gat چیف جسٹس قندھار، سپریم کورٹ

قندھار 80

اسحاق زئی

قندھار، مدرسہ کے تعلیم یافتہ

محمد عباس

صحت، اقوام متحدہ کی ایجنسیوں سے مذاکرات پر مامور

عروزگان، بانی رکن، 40

غ، ہوتک مجاہدین سابق حزبی (خ)

مدرسہ رسول/ مدرسہ حقانیہ کے تعلیم یافتہ، قندھار میں تجارت سے وابستہ رہے، قندھار کے میئر بعد میں اٹارنی جنرل، کمانڈر باغلان فورس

عبیداللہ

دفاع

قندھار

غ، ہوتک، باخر (سابق حرکت)

تعلیم: مدرسہ کوئٹہ، مزار شریف پر قبضہ کیا۔ طالبان اور آئی ایس آئی کے درمیان رابطہ

داداللہ محمد اللہ اخوند

تعمیرات خزانہ

قندھار

الکوزئی

مدرسہ کے تعلیم یافتہ

امیر خان متقی

انفارمیشن/ کلچر

MashalBooks.org

لوگر (بانی رکن)

سابق: حرکت پشتون، زد، زغ، کوچی خانہ بدوش، مجاہد (سابق حرکت)

کوئٹہ، حقانیہ کے تعلیم یافتہ، ملا عمر کے پرانے دوست، مزار کے بعد باغلان فورس کے

کمانڈر

عبداللطیف منصور

زراعت

پاکتیا

غلزئی

حقانیہ کے تعلیم یافتہ

محمد عیسیٰ

پانی، بجلی

قندھار

غلزئی ہوتک، مجاہد سابق حرکت

اللہ داد اخوند

مواصلات

قندھار

غلزئی ہوتک، مجاہد سابق (حزبی)

صوبہ سرحد میں اپنا مدرسہ تھا

نورالدین غزالی

انصاف

عروض گان

MashalBooks.org

غلزئی ہوتک

یک چشم

حمید اللہ نعمانی

اعلیٰ تعلیم

زبول

درانی افغانی

رسمی تعلیم نہیں پائی

احمد جان

معدنیات

پکتیا 40

غلزئی داران

حقانیہ سے تعلیم حاصل کی، سعودی عرب میں قالینوں کے بیوپاری، پشاور میں طالبان کے ٹریڈ کمشنر/ آئیل کمپنیوں سے مذاکرات

جلال الدین حقانی

سرحد امور

پکتیا 55

غلزئی داران مجاہد (سابق حزبی) (خ)

1947ء میں داؤد کے خلاف اسلامی تحریک کی قیادت کی، نقل وطن کر کے پاکستان آ گئے۔ پکتیا میں تعلیم پائی، چھ سال حقانیہ میں رہے۔ مجاہدین کے کمانڈر رہے۔ 1991ء میں خوست پر قبضہ کیا۔ 1995ء میں طالبان سے مل گئے۔

[gvrule 180 45 700 1] صادق اخوند

تجارت

قندھار
غلزئی ہوتک مجاہد، سابق حرکت
ناخواندہ، 1997ء میں مزار شریف پر قبضہ کیا
مولوی جلیل اللہ مولوی زئی
اٹارنی جنزل
ہرات 68
خواجہ
تعلیم دیوبندی مدرسہ (ہندوستان) سے حاصل کی، 1988ء میں مجاہدین کی حکومت کے
مشیر رہے، ربانی کے وزیر تعلیم رہے
قاری دین محمد
منصوبہ بندی
بدخشان
تاجک مجاہد سابق جماعت اسلامی
کونسل کے تاجک رکن
مولوی کلام الدین
مذہبی پولیس کے سربراہ
لوگر، بار یکی بارک 38
غلزئی، مہمند مجاہد، سابق حرکت
لوگڑ اور حقانیہ کے تعلیم یافتہ مرکزی نبی محمدی (ربانی حکومت میں) زبول میں طالبان میں
شرکت کی
محمد حسن
گورنر قندھار

MashalBooks.org

عروضگان بانی رکن 45
درانی، اچکزی مجاہد، سابق حرکت
کوئٹہ کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ عرض گان میں روسیوں سے لڑے، ایک ٹانگ نہیں، انگلیوں کے پور کٹ گئے ہیں۔
وکیل احمد
سیکرٹری ملا عمر
قندھار
غیر پشتون کا کٹر بنیادی رکن
ملا عمر کے چیف معاون طالبان کے ترجمان
شیر محمد قاضی
نائب وزیر خارجہ
بوگڑ
غلزئی ستنا قاضی
سابق پولیس افسر ہندوستان میں تربیت پائی
عارف اللہ عارف
نائب وزیر خزانہ
پکتیا زرود
غلزئی سلیمان حرکت
چھٹے درجے تک بڑھے، پھر 14 برس حقانی میں رہے۔ پاکستان میں جہاد کیا۔

MashalBooks.org

ضمیمہ 3

طالبان کے سلسلہ وار واقعات

اپریل : کابل اور افغانستان پر مجاہدین کا قبضہ، صدر نجیب اللہ نے کابل میں اقوام متحدہ کے احاطہ میں پناہ لے لی۔

1993ء صدر ربانی اور حکمت یار کے درمیان خونریز جنگ، 10 ہزار شہری ہلاک ہو گئے۔

1994ء جنوری:

دوستم اور حکمت یار کا کابل پر حملہ، مخالف دھڑوں میں لڑائی سے کابل ملبے کا ڈھیر بن گیا۔

فروری :

اقوام متحدہ نے محمود مسطری کو افغانستان میں خصوصی مشن کا سربراہ مقرر کیا۔ پاکستان کا سفارت خانہ بند کر دیا گیا۔

اکتوبر:

چھ مغربی سفارت کار، پاکستان کے وزیر داخلہ نصر اللہ بابر کی قیادت میں اسماعیل خان سے ملاقات کے لئے ہرات گئے۔

28 اکتوبر کو وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی اسماعیل خان اور دوستم سے اشک آباد میں ملاقات ہوئی۔

4 نومبر:

30 ٹرکوں پر مشتمل ایک پاکستانی قافلے کو جنگی سرداروں نے قندھار کے قریب روکا، لڑائی میں پاکستانی قافلے کے 20 افراد ہلاک ہو گئے۔ اسی دوران طالبان منظر پر نمودار ہوئے۔

5 نومبر:

طالبان نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور ٹرکوں کو آزاد کرا دیا، چار دن کی جھڑپوں میں 50 افراد مارے گئے۔

25 نومبر:

طالبان نے دو جنوبی صوبوں لشکر گڑھ اور ہلمند کا کنٹرول سنبھال لیا۔

1995ء

یکم جنوری:

3000 پاکستانی طالبان پشاور سے کابل روانہ ہوئے۔

2 فروری:

طالبان کابل سے 25 میل کے فاصلے پر وردک صوبے میں داخل ہو گئے۔

11 فروری:

طالبان نے صوبہ لوگر پر قبضہ کر لیا، 30 صوبوں میں سے نو صوبوں پر طالبان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ صدر ربانی نے طالبان سے مذاکرات کے لئے ایک وفد بھیجا۔

14 فروری:

طالبان نے چار اسیاب پر قبضہ کر لیا اور حکمت یار مقابلہ کئے بغیر بھاگ گئے۔

18 فروری:

طالبان نے ممکنہ عبوری حکومت میں شمولیت کے لئے تین شرائط پیش کیں:

۔1 طالبان پر مشتمل غیر جانبدار فوج تشکیل دی جائے۔

۔2 صرف اچھے مسلمان شرکت کریں اور

MashalBooks.org

۔3 پورے تیس صوبوں کو نمائندگی دی جائے۔

7 مارچ:

طالبان کی اور فرح کی طرف پیش قدمی، ہرات پر قبضہ کرنے کی کوشش، طالبان جنوبی کابل میں داخل ہو گئے، ہزارے اپنی جگہ خالی کر گئے۔

11 مارچ:

مسعود کا کابل کے نزدیک طالبان پر حملہ، طالبان افراسیاب کی طرف پیچھے ہٹ گئے۔

13 مارچ:

ہزارہ لیڈر عبدالعلی مزاری گرفتار، طالبان اسے ہیلی کاپٹر پر قندھار لے جا رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر گر گیا، جس میں عبدالعلی مزاری ہلاک ہو گیا۔ طالبان کا فرح پر قبضہ ہو گیا۔

4 اپریل:

طالبان کا ہرات کے قریب شنڈ انڈ کے ہوائی اڈے پر قبضہ۔

29 اپریل:

سرکاری فوجوں نے طالبان کو شنڈ انڈ سے 80 میل پرے دھکیل دیا۔

12 مئی:

طالبان کو فرح سے نکال دیا گیا۔

31 مئی:

[2]gat سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ شہزادہ ترکی کا کابل اور قندھار کا دورہ۔

10 جولائی:

سعودی انٹیلی جینس کے نائب سربراہ کا امن مشن پر افغان شہروں کا دورہ، طالبان سے ملتے ہیں۔

2 ستمبر:

طالبان کا فرح پر دوبارہ قبضہ، شنڈ انڈ کے قریب گھمسان کی جنگ۔

3 ستمبر:

طالبان کا شنڈ انڈ پر قبضہ، کابل کی حکومت کی جانب سے فوجی کمان میں تبدیلی، اسماعیل خان کی تنزلی، فوج کو طیاروں کے ذریعے ہرات لے جایا گیا۔

5 ستمبر:

ہرات پر طالبان کا قبضہ، اسماعیل خان لڑے بغیر ایران بھاگ گیا۔

6 ستمبر:

کابل میں پاکستان کے سفارت خانے کو جلا ڈالا گیا۔ ایران کا طالبان کو انتباہ کہ ایرانی سرحد عبور نہ کریں۔

10 اکتوبر:

طالبان نے 400 ٹینک قندھار سے کابل پہنچا دیئے، شہر پر دھاوا بولنے کی تیاری۔

11 اکتوبر:

طالبان بڑا حملہ شروع کرتے ہیں اور چار اسیاب پر دوبارہ قبضہ کر لیتے ہیں۔

11 نومبر:

کابل پر طالبان کا راکٹوں سے حملہ، 36 افراد ہلاک، 52 زخمی ہو گئے۔

26 نومبر:

طالبان کی کابل پر شدید بمباری، 39 شہری ہلاک 140 زخمی ہو گئے۔ سرکاری فوج طالبان کو کابل سے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

1996ء

3 مارچ:

ربانی کا ایران، ترکمانستان اور ازبکستان کا دورہ۔

20 مارچ:

طالبان شوریٰ کا قندھار میں اجلاس، 1000 علماء اور قبائلی سرداروں کی شرکت، پالیسی

پرغور وخوض۔

4 اپریل:

طالبان کی شوریٰ ختم، ربانی کے خلاف جہاد کا اعلان، ملا عمر امیرالمومنین بنا دیئے گئے۔

19 اپریل:

سینیٹر امریکی سفارت کاروں کی کابل اور قندھار میں افغان لیڈروں سے ملاقات۔

23 مئی:

اقوام متحدہ کے سفیر مسطیری کا خرابی صحت کی بنا پر استعفیٰ

20 جون:

حکمت یار کا ربانی سے اتحاد، وزیراعظم کے عہدے پر تقرر، طالبان کا کابل پر راکٹوں سے حملہ، 52 افراد ہلاک۔

11 جولائی:

جرمن سفارت کار نورٹ ہال کا افغانستان کے لئے اقوام متحدہ کا سفیر کے طور پر تقرر۔

4 ستمبر:

کابل میں افغان عورتوں کا طالبان کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج۔

10 ستمبر:

طالبان کا ننگرہار کے دو اضلاع پر قبضہ، حاجی قدیر پاکستان بھاگ گئے۔ جلال آباد کے قریب شدید جنگ۔

11 ستمبر:

طالبان کا جلال آباد پر قبضہ۔

25 ستمبر:

طالبان کا سروبی اور اسد آباد پر قبضہ۔

26 ستمبر:

MashalBooks.org

سروبی سے ایک رات میں طالبان کی کابل کی طرف پیش قدمی، شہر کے باہر شدید لڑائی کے بعد کابل پر طالبان کا قبضہ۔

27 ستمبر:

طالبان نے نجیب اللہ کو پھانسی دے دی، مسعود کی شمال کی طرف پسپائی، ملا عمر کی طرف سے عام معافی کا اعلان، کابل کا نظم ونسق چلانے کے لئے ملا عمر ربانی کی سربراہی میں چھ رکنی کونسل کا قیام، ایران، روس، ہندوستان اور وسط ایشیائی ریاستوں کی طرف سے کابل پر طالبان کے قبضے کی مذمت، پاکستان نے ایک وفد کابل بھیجا۔

یکم اکتوبر:

طالبان نے مسعود سے کہا کہ پنج شیر میں ہتھیار ڈال دے یا پھر مرنے کے لئے تیار ہو جائے، طالبان نے شمال کی طرف پیش قدمی کی تو مسعود نے پنج شیر میں سڑکیں اڑا دیں۔ طالبان سالانگ کی سرنگ تک پہنچ گئے، دوستم کی فوج سے مڈبھیڑ۔

4 اکتوبر:

وسط ایشیائی ریاستوں کی سربراہ کانفرنس میں ہوئی، جس نے طالبان کو انتباہ کیا وہ وسط ایشیاء سے پرے رہے۔

8 اکتوبر:

پنج شیر پر قبضے کے لئے طالبان کی شدید جنگ پاکستان کی طرف سے فریقین کے درمیان سفارت کاری کا آغاز۔

10 اکتوبر:

دوستم مسعود اور خلیلی کا خین جان میں اجلاس، سپریم کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ مادر وطن کا دفاع اس کا مقصد قرار دیا گیا۔ مسعود کا بگرام پر 50 افراد کے ساتھ حملہ، سالانگ شاہراہ پر جوابی حملوں کا آغاز۔

12 اکتوبر:

MashalBooks.org

مسعود کا جبل سراج پر قبضہ۔

13 اکتوبر:

مسعود کا چار کہار پر دوبارہ قبضہ، کابل سے صرف 10 میل کے فاصلے پر طالبان کے حملے میں سینکڑوں افراد ہلاک۔

18 اکتوبر:

باگرام پر مسعود کا قبضہ، طالبان کی پسپائی، دوستم، مسعود کی مدد کے لئے اپنی بکتر بند فوج لے آیا۔

24 اکتوبر:

ملا عمر نے کہا کہ ہم کابل کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گے اور موت کے آنے تک جنگ جاری رکھیں گے۔ مسعود کا مطالبہ کہ کابل کو غیر فوجی علاقہ قرار دے دیا جائے۔ طالبان اور دوستم کی فوجوں سے شدید جنگ کے بعد باغدیس پر قابض ہو جاتا ہے۔

31 اکتوبر:

2[tag]اسماعیل خان کی فوج کو ہوائی جہازوں کے ذریعے میانا پہنچایا گیا تاکہ وہ طالبان کی مغرب کی طرف پیش قدمی روک سکیں۔

1997ء

یکم جنوری:

طالبان دوبارہ بگرام اور چاریکار پر قبضہ کر لیتے ہیں، مسعود کی بڑی ہزیمت۔

23 جنوری:

طالبان سالانگ کے دہانے پر گلبار پر قابض ہو جاتے ہیں۔

2 فروری:

ہزارے بامیان کے دفاع کو مضبوط بناتے ہیں، طالبان کی غور بند وادی کے راستے پیش

MashalBooks.org

قدمی کرتے ہیں، طالبان کا وفد امریکہ کا دورہ کرتا ہے۔
[1]gat12 مارچ:
ہرات کے گورنر ملا عبدالرزاق پر قاتلانہ حملے کی کوشش۔
19 مئی:
جنرل مالک پہلوان کی دوستم کے خلاف بغاوت اور فریاب پر قبضے کے بعد طالبان سے مل جانے کا اعلان۔
20 مئی:
باغدلیس، فریاب اور سرائے پل کے صوبوں پر مالک کا قبضہ، مالک 700 قیدی اور اسماعیل خان، طالبان کے حوالے کر دیتا ہے۔
24 مئی:
طالبان مزار شریف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ شرعی قانون کے نفاذ کا اعلان اور لڑکیوں کے سکول بند۔
26 مئی:
پاکستان نے طالبان کی حکومت کو تسلیم کر لیا، مزار شریف میں طالبان اور مالک کے مذاکرات ناکام رہنے کے بعد جنگ چھڑ جاتی ہے۔
28 مئی:
اٹھارہ گھنٹے کی لڑائی کے بعد طالبان کو مزار شریف سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ 300 طالبان ہلاک اور سینکڑوں گرفتار، مسعود کا جنوب کی طرف سے جوابی حملہ۔
2 جون:
طالبان کابل میں ایرانی سفارت خانہ بند کر دیتے ہیں، ہزاروں پاکستانی طلباء طالبان سے مل جاتے ہیں۔ اپوزیشن مزار شریف میں نیا اتحاد قائم کر لیتی ہے۔
12 جون:

بغلان میں 3000 طالبان سے ہتھیار لے لئے جاتے ہیں۔ مسعود چہل سراج پر دوبارہ قبضہ کر لیتا ہے۔ اپوزیشن، افغانستان کی نجات کے لئے متحدہ اسلامی وقومی محاذ قائم کر لیتی ہے۔

19 جولائی:

مسعود بگرام اور چار یکاؤ پر دوبارہ قبضہ کر لیتا ہے۔ طالبان بھاری اسلحہ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔

21 جولائی:

مالک ایران سے مذاکرات کے لئے پہنچتے ہیں۔

22 جولائی:

اقوام متحدہ افغانستان کے بارے میں رپورٹ مرتب کرنے کے لئے لخذار براہیمی کو مقرر کرتی ہے۔ کابل کے گرد سخت جنگ ہو رہی ہے۔

7 اگست:

[ga[t 2 آئی ایس آئی نے بتایا کہ گزشتہ تین مہینے میں 6800 افراد جنگ میں زخمی ہوئے، امدادی تنظیم کیئر نے کابل میں عورتوں کے لئے شروع کئے گئے تمام پروگرام معطل کر دیئے ہیں۔

12 اگست:

اپوزیشن کا اجلاس مزار شریف میں منعقد ہوا، جس میں ربانی دوبارہ افغانستان کے صدر بنا دیئے گئے۔

15 اگست:

لخذار براہیمی علاقے کے تفصیلی دورے کے سلسلے میں اسلام آباد پہنچے۔

19 اگست:

براہیمی قندھار کے دورے پر جاتے ہیں۔ طالبان نے غیر ملکی پریس کو خبردار کیا ہے کہ وہ

MashalBooks.org

صحیح رپورٹنگ کرے، ورنہ اسے ملک سے نکال دیا جائے گا۔
4 ستمبر:
صدر ربانی نے جدہ میں شاہ فہد سے ملاقات کی، انہیں یقین دلایا کہ سعودی عرب صحت اور تعلیم کے شعبوں میں مدد دے گا۔
8 ستمبر:
طالبان نے قندوز کی طرف سے حملہ کر کے مزار شریف کا ہوائی اڈہ دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ ازبک، مالک اور دوستم میں بٹ گئے ہیں۔
9 ستمبر:
حزب وحدت نے مالک کا گھر جلا ڈالا۔ مالک، مزار سے چلا گیا۔ اقوام متحدہ نے طالبان کو مزار شریف کے ہوائی اڈے سے پیچھے ہٹا دیا اور خود بھی ہرات چھوڑ دیا۔ اس کے بعد شہر میں لوٹ مار شروع ہوگئی۔
12 ستمبر:
دوستم ترکی سے واپس مزار شریف پہنچ گئے۔ طالبان نے قاضی آباد میں 70 ہزار سپاہی ہلاک کر دیئے۔ مزار شریف میں تین روزہ لوٹ مار کے بعد طالبان پیچھے ہٹ گئے اور امن بحال ہو گیا۔
18 ستمبر:
مزار شریف کے قریب پھر سے شدید جنگ چھڑ گئی۔ طالبان نے کہا کہ شاہ فیصل کے انہیں پوری مالی امداد اور سیاسی حمایت کا یقین دلایا ہے۔
23 ستمبر:
طالبان نے بامیان پر شدید گولہ باری کی، مزار شریف سے دس میل کے فاصلے پر شدید جنگ ہوئی۔
28 ستمبر:

ایما بوتینو کابل میں گرفتار، انہیں 19 دوسرے ای سی مندوبین کے ساتھ 19 گھنٹے حراست میں رکھا گیا۔

30 ستمبر:

طالبان نے اقوام متحدہ کے تین کارکنوں کو کابل سے نکال دیا۔

یکم اکتوبر:

براہیمی نے تیرہ ملکوں کا دورہ کر کے اپنا مشن مکمل کر لیا۔ مزار کے گرد شدید جنگ جاری رہی۔

8 اکتوبر:

دوستم نے طالبان کو قندوز تک پیچھے دھکیل دیا۔ کابل نے پاکستان کے ساتھ تجارتی راہداری کا معاہدہ مسترد کر دیا۔

21 اکتوبر:

مالک ایران بھاگ گیا اور طالبان نے شیرغان پر قبضہ کر لیا۔

16 نومبر:

دوستم نے شیرغان کے قریب 30 اجتماعی قبروں سے طالبان کی 2000 لاشیں نکالیں اور طالبان کے سپرد کرنے کی پیش کش کی، قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آیا۔

18 نومبر:

امریکی سیکرٹری خارجہ میڈیلین آلبرائٹ نے پاکستان میں طالبان کو انسانی حقوق پامال کرنے پر تنقید کا ہدف بنایا۔

26 نومبر:

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے افغانستان میں بیرونی مداخلت کے بارے میں بڑی سخت رپورٹ پیش کی۔

17 دسمبر:

MashalBooks.org

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے افغان دھڑوں کو اسلحے کی بیرون ملک سے فراہمی کی شدید مذمت کی اور افغان دھڑوں سے لڑائی بند کرنے کی اپیل کی۔

1998ء

6 جنوری:

صدر ربانی نے افغانستان پر اقوام متحدہ کے تحت علاقائی کانفرنس کے انعقاد کے لئے حمایت کے حصول کے لئے ایران، پاکستان اور تاجکستان کا دورہ کیا۔ طالبان پر صوبہ فریاب میں 600 ازبک شہریوں کو قتل کا الزام لگایا گیا۔ بامیان کے گرد طالبان کے محاصرے سے خوراک کی فراہمی رک گئی اور صورت حال خراب ہوگئی۔

7 جنوری:

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے طالبان سے اپیل کی کہ وہ بامیان میں خوراک کی فراہمی کی اجازت دے دیں۔

13 جنوری:

طالبان کا جہاز کوئٹہ کے قریب گر کر تباہ ہوگیا۔ 80 سپاہی ہلاک ہو گئے، قندھار کے قریب بھرتی دینے سے انکار کرنے والے دیہاتیوں اور طالبان کے درمیان مڈبھیڑ ہو گئی۔

27 جنوری:

عید پر دونوں طرف کے دوسو پچاس قیدی رہا کئے گئے۔

4 فروری:

شمال مشرقی افغانستان میں زلزلہ، چار ہزار افراد ہلاک، پندرہ ہزار بے گھر ہو گئے۔ برفباری کے باعث امدادی اداروں کو کام کرنے میں مشکل کا سامنا۔

20 فروری:

دوسری بار زلزلہ آیا۔

MashalBooks.org

8 مارچ:

افغان عورتوں سے ہمدردی کے اظہار کے طور پر دنیا بھر میں یوم خواتین منایا گیا۔

14 مارچ:

مزار شریف میں ہزارہ اور ازبک قبائیلیوں کے درمیان شدید جنگ۔

22 مارچ:

براہیمی طالبان اور اپوزیشن کے درمیان بات چیت کرانے آتے ہیں۔

یکم اپریل:

طالبان علما کمیشن کے قیام کے لئے اپوزیشن سے بات چیت کے لئے اپنے وفد کے ارکان کے ناموں کا اعلان کرتے ہیں۔

17 اپریل:

امریکی سفارت کار بل رچرڈسن کا کابل اور مزار شریف کا دورہ۔

26 اپریل:

اسلام آباد میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام علماء کمیشن کا انعقاد۔

4 مئی:

علماء کمیشن کے مذاکرات ناکام۔

17 مئی:

طالبان کے جیٹ طیاروں کی تعلقان پر بمباری، 31 افراد ہلاک، 100 زخمی، کابل اور شمال میں شدید جنگ۔

30 مئی:

شمال مشرقی افغانستان میں پھر سے شدید زلزلہ، 5000 افراد ہلاک۔

18 جون:

سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ شہزادہ ترکی کی قندھار میں آمد۔

MashalBooks.org

30 جون:

طالبان این جی اوز سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ پولی ٹیکنیک کی عمارت میں منتقل ہو جائیں، این جی اوز کا انکار۔

3 جولائی:

ایشیاء کی پانچ ریاستوں کی سربراہ کانفرنس نے جوالماس میں ہوئی، مطالبہ کیا کہ افغان کی جنگ بند کرائی جائے۔

9 جولائی:

اقوام متحدہ کے طیارے نے کابل ایئرپورٹ پر بم گرائے، ملا عمر کی طرف سے حکم کہ تمام ٹی وی ختم کر دیئے جائیں۔ تمام مسیحیوں کو ملک بدر کر دیا جائے، سابقہ کمیونسٹوں کو سزا دی جائے۔ سابق کمیونسٹ افغان وزیر دفاع کوئٹہ میں قتل کر دیئے گئے۔

12 جولائی:

طالبان نے میمان پر قبضہ کر لیا، 800 ازبک قیدی بنا لئے گئے۔ 100 ٹینک بھی ہاتھ لگے۔

18 جولائی:

یورپین یونین نے کابل کی طرف سے ناپسندیدہ پابندیاں لگائے جانے پر تمام انسانی امداد بند کر دی۔

20 جولائی:

این جی اوز کابل سے نکل گئیں، یورپی یونین نے اپنا دفتر بند کر دیا۔

21 جولائی:

دو افغان کارکن اغوا کر لئے گئے اور جلال آباد میں قتل کر دیئے گئے۔

31 جولائی:

طالبان لیڈروں نے اکوڑہ خٹک میں دارالعلوم حقانیہ کا دورہ کیا اور افرادی قوت کے لئے

اپیل کی، پانچ ہزار پاکستانی افغانستان میں لڑنے کے لئے روانہ ہوئے۔
یکم اگست :
طالبان شیرغان پر قابض ہو گئے۔ دوستم اپنے سپاہی لے کر ازبکستان کی سرحد پر ہیراتان چلا گیا۔
7 اگست :
کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں میں بموں کے دھماکے، جن کے لئے اسامہ بن لادن کو موردالزام ٹھہرایا گیا۔
8 اگست :
طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کر لیا۔ 11 ایرانی سفارت کار اور ایک صحافی ہلاک، طالبان نے ہزاروں کی تعداد میں ہزارے قتل کر دیئے، ہزاروں ہی مزار شریف سے فرار ہو گئے۔
10 اگست :
تعلقان پر طالبان کا قبضہ ہو گیا۔
11 اگست :
روس نے پاکستان کو انتباہ کیا کہ وہ طالبان کی مدد نہ کرے، وسط ایشیائی ریاستوں میں سخت حفاظتی انتظامات۔
12 اگست :
پل خمری اور ہیراتان پر طالبان کا قبضہ ہو گیا۔
18 اگست :
آیت اللہ خمینی نے امریکہ اور پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ طالبان کو ایران کے خلاف سازش کے لئے طالبان کو استعمال کر رہے ہیں۔ ایران اور طالبان کی کشیدگی میں اضافہ، ملا عمر نے کہا کہ طالبان اسامہ بن لادن کی حفاظت کریں گے۔

20 اگست:

امریکہ جلال آباد اور بن لادن کے خوست کیمپوں پر 75 کروز مزائیل داغے، حملے میں 21 افراد ہلاک اور 30 زخمی ہوئے۔

21 اگست:

طالبان نے امریکی حملے کی مذمت کی اور عہد کیا کہ وہ اسامہ بن لادن کی حفاظت کریں گے۔ کابل میں اقوام متحدہ کا ایک فوجی افسر ہلاک، تمام غیر ملکی افغانستان، پشاور اور کوئٹہ سے نکل گئے۔

26 اگست:

نیویارک کی گرینڈ جیوری نے بن لادن کے خلاف ایک سربمہر فیصلہ دیا، لادن کو دہشت گردی کا الزام دیا گیا۔

یکم ستمبر:

ایران نے 70 ہزار فوجیوں کے ساتھ افغان سرحد کے قریب جنگی مشقیں شروع کیں۔

6 ستمبر:

ایران کے اس اعلان کے بعد کہ بین الاقوامی قانون کے تحت اسے اپنے شہریوں کی حفاظت کرنے کا حق پہنچتا ہے، جنگ کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔

10 ستمبر:

طالبان نے کہا کہ انہیں مزار شریف میں نو ایرانی سفارت کاروں کی میتیں مل گئی ہیں۔

13 ستمبر:

بامیان پر جنگ کے بعد طالبان کا قبضہ، ملا عمر نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ ضبط سے کام لیں۔

20 ستمبر:

مسعود نے کابل پر راکٹوں سے بڑا حملہ کیا۔ 66 افراد ہلاک اور 215 زخمی ہو گئے۔

MashalBooks.org

22 ستمبر:

سعودی عرب نے طالبان کے سفیر کو ملک سے نکال دیا اور شہزادہ ترکی کے کابل کے دورے کے باوجود بن لادن کو سعودی عرب کے حوالے نہیں کیا۔

27 ستمبر:

طالبان نے ایرانی فوجی مشقوں کے خلاف مزاحمت کے لئے 30 ہزار فوج ایرانی سرحد پر پہنچا دی۔

1[tag]2 اکتوبر:

ایرانی گن شپ ہیلی کاپٹر اور طیاروں کی طرف سے ہرات کی فضا کی حدود کی خلاف ورزی ایرانی فوجی مشقوں میں دو لاکھ ایرانی فوجیوں کی شرکت۔

14 اکتوبر:

لخدار براہیمی کی قندھار میں ملا عمر سے ملاقات، ملا عمر کی طرف سے کسی غیر ملکی سفارت کار سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ طالبان تمام ایرانی قیدیوں کو رہا کرنے پر راضی ہو گئے۔

21 اکتوبر:

امریکہ میں عورتوں کی غالب اکثریت والی فاؤنڈیشن نے جو 129 تنظیموں کی نمائندہ ہے۔ طالبان پر اقتصادی اور سماجی دباؤ بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ ماؤس لیمو نے طالبان کی عورتوں سے متعلق پالیسی کے خلاف موثر مہم چلانے کے لئے ایک لاکھ ڈالر کا چندہ دیا۔

23 اکتوبر:

مسعود نے شمال مشرق میں کامیاب حملہ کیا اور صوبہ قندوز میں داخل ہو گیا۔ طالبان نے جلال آباد میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے پر جنرل تنائی کے ساتھ حامیوں کو پکڑ لیا۔

25 اکتوبر:

طالبان نے بارودی سرنگیں بچھانے پر پابندی لگا دی۔ مسعود نے تاجکستان کی سرحد پر

MashalBooks.org

امام صاحب پر قبضہ کرلیا۔

7 نومبر:

اقوام متحدہ نے کہا کہ طالبان مزار شریف میں 4000 افراد کی ہلاکت کے ذمہ دار ہیں۔ ملا عمر نے اقوام متحدہ پر متعصب ہونے کا الزام لگایا اور کہا کہ 3500 طالبان مارے گئے تھے۔ ملا عمر نے ایک بار پھر وسیع البنیاد حکومت بنانے کی تجویز مسترد کر دی۔

13 نومبر:

حزب وحدت کے ایک دھڑے کے لیڈر محمد اکبری نے بامیان میں طالبان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

23 نومبر:

یونیسکو کے سربراہ فریڈوریکو میئر نے دنیا سے کہا کہ وہ طالبان کو انسانی حقوق کی پامالی سے روکے۔

یکم دسمبر:

طالبان نے جلال آباد یونیورسٹی سے باہر طلباء پر گولی چلا دیا، چار طلبا ہلاک اور چھ زخمی ہو گئے۔

9 دسمبر:

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے افغانستان کے بارے میں ایک سخت قرارداد منظور کی۔

29 دسمبر:

یونیسف نے کہا کہ افغانستان میں تعلیم ختم ہوگئی ہے۔

1999ء

10 جنوری:

طالبان نے پشاور میں بننے والی پیس اینڈ نیشنل یونٹی پارٹی کو مسترد کر دیا اور کہا کہ صرف فوجی حل ہی قابل قبول ہے۔

MashalBooks.org

12 جنوری:

مجاہدین کے سابق سرکردہ کمانڈر عبدالحق کے خاندان کے افراد کو پشاور میں گولی مار دی گئی۔

19 جنوری:

کابل میں طالبان نے چھ رہزنوں کے اعضا کاٹ کر ان کے اعضا درختوں کی شاخوں سے لٹکا دیئے۔

21 جنوری:

لخذار براہیمی کی بریفنگ کے بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک بار پھر افغانستان میں جنگ بندی کا مطالبہ کیا۔

31 جنوری:

پہلا چینی وفد طالبان سے ملاقات کرنے کابل پہنچا۔

2 فروری:

ایرانی افسروں کی دبئی میں طالبان سے ملاقات، امریکہ کے نائب سیکرٹری خارجہ سٹروب ٹالبوٹ کی اسلام آباد میں طالبان سے ملاقات، انہوں نے طالبان کو ایک خط دیا، جس میں کہا گیا تھا کہ وہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں۔

9 فروری:

طالبان نے امریکی خط مسترد کر دیا اور کہا کہ بن لادن کو باہر جانے پر مجبور نہیں کریں گے، البتہ ان پر پابندیاں لگا دی جائیں گی۔

11 فروری:

لوگر میں لیدن شہر کے زلزلے میں 50 افراد ہلاک اور 200 زخمی ہو گئے۔

13 فروری:

بن لادن روپوش ہو گئے، طالبان نے کہا کہ وہ نہیں جانتے کہ لادن کہاں ہیں۔ مسعود

MashalBooks.org

مذاکرات کے لئے ایران گئے۔

15 فروری:

افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء کی دسویں سالگرہ۔

12 فروری:

اقوام متحدہ کے مصالحت کنندہ لخذار براہیمی ریاض میں شاہ فہد سے ملاقات کرنے کے بعد اسلام آباد پہنچے۔

28 فروری:

طالبان مخالف اتحاد نے کہا ہے کہ وہ ایک لیڈرشپ کونسل اور 150 رکنی پارلیمنٹ قائم کریں گے۔

3 مارچ:

ترکمانستان کے وزیر خارجہ شیخ مرادوف کی قندھار میں ملا عمر سے پہلی ملاقات۔

4 مارچ:

ہیلری کلنٹن کی طالبان کی عورتوں سے متعلق پالیسی پر نکتہ چینی۔

11 مارچ:

فریقین کے درمیان قیدیوں کی رہائی سے متعلق اتفاق رائے، بعد کے مذاکرات میں حکومتی ڈھانچے پر غور ہوگا۔

24 مارچ:

لخذار براہیمی کی قندھار میں ملا عمر سے ملاقات۔

30 مارچ:

اشک آباد میں مذاکرات کے دوسرے دور کے بارے میں تعطیل، دونوں فریقوں کی ایک دوسرے پر نکتہ چینی۔

7 اپریل:

MashalBooks.org

روسی وزیر دفاع ایگور سرجی نیف کی دوشنبے میں مسعود سے ملاقات، روس کی جانب سے تاجکستان میں فوجی اڈہ بنانے کا اعلان۔

[ta1]g10 اپریل:

ملا عمر کا اپوزیشن سے مزید مذاکرات کرنے سے انکار، بامیان کے گرد شدید جنگ۔

15 اپریل:

طالبان کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر صدر کلنٹن کی نکتہ چینی۔

21 اپریل:

بامیان پر حزب وحدت کا قبضہ، طالبان پیچھے ہٹ گئے۔ درجنوں افراد ہلاک، درجنوں پکڑے گئے۔

28 اپریل:

طالبان کا بامیان پر قبضے کے لئے دوبارہ حملہ، 30 شہری ہلاک۔

29 اپریل:

طالبان پاکستان اور ترکمانستان کے درمیان معاہدے پر دستخط، جس کی رو سے افغانستان میں گیس لائن بچھائی جائے گی، مالی امداد کے لئے نئے فریق کی تلاش ہیلری کلنٹن کی طرف سے طالبان کی عورتوں سے متعلق پالیسی پر پھر نکتہ چینی۔

5 مئی:

ایران اور ازبکستان نے مشترکہ بیان جاری کیا کہ وہ افغانستان پر طالبان کے قبضے کی مزاحمت کریں گے۔

9 مئی:

بامیان پر طالبان کا قبضہ، جس کے لئے شمال اور جنوب کی طرف سے حملہ کیا گیا۔

12 مئی:

طالبان کے وفد نے ترکمانستان سے گیس اور بجلی خریدنے کے لئے معاہدے کر لئے۔

14 مئی:

امریکہ نے پاکستان کو پہلی بار انتباہ کیا کہ وہ طالبان کی حمایت نہ کرے اور کہا کہ امریکہ، سابق شاہ ظاہر شاہ کے واپس آنے کی حمایت کرے گا۔

20 مئی:

شدید جنگ چھڑ جاتی ہے۔ مسعود کابل پر 12 راکٹ پھینکتا ہے۔ بگرام پر طالبان کا حملہ اور شمال میں لڑائی۔

22 مئی:

ہرات میں اٹھنے والی بغاوت کو طالبان نے کچل دیا، آٹھ افراد کو برسرعام پھانسی دے دی گئی اور 100 دوسرے افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ طالبان نے ایران پر الزام لگایا کہ وہ اسلحہ تقسیم کر رہا ہے۔

28 مئی:

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے طالبان پر الزام لگایا کہ بامیان پر قبضہ کرتے وقت شہریوں کو ہلاک کیا گیا۔ ملاعمر کئی ہزار طالبان کمانڈروں اور ملاؤں سے قندھار میں ملاقات کرتے ہیں۔ آئندہ تین دن تک طالبان کی تحریک کے مستقبل کے بارے میں غور کیا جاتا ہے۔

2 جون:

ازبکستان کے وزیر خارجہ عزیز کامیلوف قندھار میں پہلی بار ملاعمر سے ملتے ہیں۔ طالبان کا مطالبہ ہے کہ انہیں افغانستان کی جائز حکومت تسلیم کر لیا جائے تو اسی صورت میں تاشقند میں ہونے والی سکس پلس ٹو کانفرنس میں شرکت کریں گے۔

8 جون:

[tag2]امریکی ایف بی آئی بن لادن کو دس مفروروں میں سرفہرست رکھتی ہے، جن کی امریکہ کو تلاش ہے۔ بن لادن پر امریکہ کے حملے کا خوف بڑھتا جا رہا ہے۔

26 جون:

سابق شاہ ظاہر شاہ روم میں مشاورتی اجلاس کرتے ہیں، لیکن طالبان قیام امن کے تعلق میں انہیں کسی قسم کا کردار دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ امریکہ بن لادن کی دھمکیوں کے پیش نظر افریقہ میں اپنے سات سفارت خانے تین دن کے لئے بند کر دیتا ہے۔

6 جولائی:

امریکہ نے طالبان کے خلاف تجارتی اور اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں اور امریکہ میں ان کے اثاثے منجمد کر دیئے، طالبان موسم گرما میں مسعود کے خلاف بڑے حملے کی تیاری کرتے ہیں، ہزاروں پاکستانی اور سینکڑوں عرب رضا کار طالبان سے آ ملتے ہیں۔

15 جولائی:

سابق سینیٹر عبدالاحد کارزئی کوئٹہ میں قتل کر دیئے گئے۔ وہ ممتاز افغان نیشنلسٹ تھے۔ قتل سے کچھ ہی عرصہ پہلے انہوں نے شاہ ظاہر شاہ سے ملاقات کی تھی۔ امریکہ کے محکمہ خارجہ اور اقوام متحدہ نے اس قتل کی مذمت کی۔

16 جولائی:

روس، تاجکستان اور ازبکستان کے وزرائے خارجہ کی تاشقند میں ملاقات اور وسطی ایشیاء میں اسلامی انتہا پسندی کا مل جل کر مقابلہ کرنے کا عہد۔

19 جولائی:

تاشقند میں ''سکس پلس ٹو'' کے مذاکرات کا آغاز صدر اسلام کریموف افغانستان میں جنگ بندی اور اقوام متحدہ کا اجلاس طلب کرنے کے لئے کہتے ہیں۔

20 جولائی:

تاشقند کے مذاکرات کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو جاتے ہیں۔

23 جولائی:

مسعود کی تاشقند میں صدر کریموف سے ملاقات۔

27 جولائی:

مسعود کا راکٹ کابل ایئر پورٹ پر گرنے کے بعد اقوام متحدہ نے کابل کے لئے اپنے طیاروں کی پروازیں بند کر دی ہیں، طالبان کا حملہ یقینی ہے۔

28 جولائی:

طالبان کی بگرام کی طرف پیش قدمی، تین محاذوں پر طالبان کے حملے کا آغاز پہلے دن کی لڑائی میں دونوں طرف کے 130 افراد ہلاک ہو گئے۔

یکم اگست:

طالبان کا بگرام پر قبضہ، مسعود کی طرف سے بگرام پر دوبارہ قبضے کی کوشش کے نتیجے میں شدید جنگ۔

2 اگست:

مسعود پنج شیر کی طرف پسپا ہو جاتا ہے اور طالبان چار یکار پر قبضہ کر لیتے ہیں، دو لاکھ افراد شومالی وادی سے فرار ہو جاتے ہیں۔ جس کے باعث ہجرت کا نیا بحران پیدا ہو جاتا ہے۔

13 اگست:

طالبان قندوز سے شمال کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے امام صاحب اور شیر خان بندر پر قبضہ کر لیتے ہیں اور مسعود کا تاجکستان سے رابطہ ختم کر دیتے ہیں، اب تک 3000 افراد جنگ میں کام آ چکے ہیں۔

5 اگست:

مسعود جوابی حملہ کرتے ہیں، چار یکار پر دوبارہ قابض ہو جاتے ہیں اور طالبان کو کابل کے قریب ان کی پرانی پوزیشن کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ 400 طالبان مارے گئے اور 500 گرفتار کر لئے گئے۔

8 اگست:

مسعود شمال میں کھویا ہوا علاقہ دوبارہ قبضے میں لے لیتے ہیں۔

10 اگست:

امریکہ نے افغانستان کی ایئر لائنز آریانا کے اثاثے ضبط کر لئے، بن لادن سے اس کے رابطے جواز بنے۔

13 اگست:

طالبان کا بگرام پر دوبارہ قبضہ۔

15 اگست:

اقوام متحدہ کو طالبان نے اپیل کی کہ وہ زیادہ لوگوں کو مہاجر نہ بنائیں اور جنگ بند کر دیں۔ طالبان نے شومالی وادی میں مخالفوں کو تہس نہس کرنے کی پالیسی اپنا لی ہے۔ ہزاروں افراد کی کابل میں گرفتاری۔

17 اگست:

پاکستان کی طرف سے صلح کرانے کی کوششیں لیکن شمالی اتحاد نے مسترد کر دیں۔

24 اگست:

قندھار میں ملا عمر کے گھر کے باہر بم کا دھماکہ، جس میں ملا عمر کے دو سوتیلے بھائیوں اور ایک عرب باشندے سمیت چالیس افراد ہلاک ہوگئے۔

5 ستمبر:

دونوں فریقوں کی طرف سے کابل کے شمال اور شہر کے گرد، نئے حملوں کے بعد شدید جنگ چھڑ گئی۔

10 ستمبر:

اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ افغانستان میں افیون کی پیداوار 1999ء میں دگنی بڑھ کر 4600 ٹن تک پہنچ گئی ہے۔ پوست کی 97 فیصد کاشت طالبان کے کنٹرول میں ہے۔

20 ستمبر:

[tag 2]روس نے کہا ہے کہ افغانستان میں رہنے والے افغان، پاکستانی اور عرب

MashalBooks.org

داغستان اور چیچنیا میں لڑ رہے ہیں۔

25 ستمبر:

طالبان کی شمالی اتحاد کے صدر مقام تعلقات کی طرف پیش قدمی، شدید جنگ ہونے لگی۔

27 ستمبر:

اقوام متحدہ کی افغان دھڑوں کی بیرونی امداد پر نکتہ چینی، امام صاحب پر طالبان کا دوبارہ قبضہ۔

29 ستمبر:

شمالی اتحاد نے تالقان پر طالبان کا ایس یو 22 لڑاکا طیارہ مار گرایا۔

4اکتوبر:

پاکستان کی آئی ایس آئی کے سربراہ کا قندھار کا دوبارہ اور افغانستان سے پاکستانی دہشت گردوں کو نکال دینے کا مطالبہ، ملا عمر کی طرف سے تعاون پر رضامندی کا اظہار۔

12اکتوبر:

پاکستان میں فوج نے وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

15اکتوبر:

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا طالبان پر محدود پابندیاں عائد کرنے کا فیصلہ۔

MashalBooks.org

ضمیمہ 4

سازش کا نیا کھیل

جدول 1: ترکمانستان سے مجوزہ پائپ لائنیں 1996ء میں
فرم
راستہ
تفصیل

(1) این رون / ونگ میرل بوٹاس گاما گیورس
ترکمانستان، آذربائیجان، ترکی
بحیرہ کیسپین کے نیچے سے لاگت 6۔1 بلین ڈالر
(2) یونوکال، ڈیلٹا آئیل ترکمانروسگاز
ترکمانستان، پاکستان، افغانستان
937 میل لاگت 5۔2 بلین ڈالر
(3) بریداس، ٹی اے پی
ترکمانستان، پاکستان، افغانستان
750 میل لاگت 5۔2 بلین ڈالر
(4) رائل ڈچ، شیل، گازڈی فرانس، سنام پروگیٹی، ترکمانستان
ترکمانستان، ایران، ترکی
1875ء میں لاگت 2 بلین ڈالر
(5) متسوبیشی، ایکسون، چائنا، ترکمانستان
ترکمانستان، قازقستان، چین، جاپان

MashalBooks.org

5000 میل لاگت 2,5 بلین ڈالر

(6) چین، ایران، ترکمانستان

قازقستان، ترکمانستان، ایران، خلیج فارس

1500 میل لاگت 5۔2 بلین ڈالر

(7) 150 میل لمبی گیس پائپ لائن ایران اور ترکمانستان کو ملانے والی دسمبر 1997ء میں مکمل ہوئی۔

1999ء میں پائپ لائنوں کی حیثیت

(1) ترکمانستان، ترکی پائپ لائین جسے بحیرہ کیسپین کے نیچے سے گزارا جاتا تھا، اس سے متعلق معاہدہ ملچٹل گروپ اور امریکی جنرل الیکٹرک کے درمیان طے پایا۔ لاگت 5۔2 بلین ڈالر۔

(2) معطل۔

(3) معطل

(4) رک گئی

(5) رک گئی

(6) رک گئی ذریعہ : احمد رشید

جدول (2) ترکمانستان میں تیل کی پیداوار

بلین مکعب میٹر/ سال

MashalBooks.org

ٹریلین مکعب فیٹ / سال

1989

89۔6

3۔20

1990

55۔7

2۔00

1994

20۔6

0]1995[۔73

22۔0

0۔78

1996

26۔0

0۔91

1997

17۔0

0۔60

1998

13۔6

0۔48

MashalBooks.org

جدول 3 یونوکال اور بریداس میں افغانستان کی پائپ لائن کے لیے مقابلے کا جائزہ

1992ء

13 جنوری:

بریداس کو مشرقی ترکمانستان کے پشاور بلاک میں 50۔50 کے پیداواری منافع کی اساس پر تیل کی تلاش کا حق دیا گیا۔

g1993[ta shead]ء

فروری:

بریداس کو مغربی ترکمانستان کے کیمبر آئیل و گیس بلاک میں 75۔25 کی شرح منافع پر تیل اور گیس کی تلاش کا حق دیا گیا۔

مارچ:

صدر نیازدف نے امریکہ کا دورہ کیا، امریکہ کے سابق قومی سلامتی کے مشیر الگزینڈر ہیگ کی خدمات حاصل کیں اور انہیں ترکمانستان میں امریکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنے اور ایران کے راستے پائپ لائن بچھانے کے بارے میں امریکی رویے کو نرم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

1994ء

ستمبر:

بریداس کو کیمبر بلاک سے تیل برآمد کرنے سے روک دیا گیا۔

نومبر:

ترکمانستان نے گیس پائپ لائن کے راستے کا جائزہ لینے کے لئے ایک ورکنگ گروپ قائم کیا، اس میں ہیگ اور بریداس شامل ہیں۔ طالبان نے قندھار پر قبضہ کرلیا۔

MashalBooks.org

1995ء

جنوری:

کیمبر بلاک کا جائزہ لینے کے بعد بریداس نے اپنے حصے کا منافع کم کر کے 65 فیصد کر دیا۔ تیل برآمد کرنے کی اجازت مل گئی۔

16 مارچ:

صدر نیازدف اور وزیراعظم بےنظیر بھٹو نے ایک معاہدے پر دستخط کئے، جس کے تحت بریداس کو افغانستان میں پائپ لائن بچھانے کے قابل ہونے کے بارے میں جائزہ لینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

اپریل:

ترکمانستان اور ایران نے ایران سے ترکی کے راستے پائپ لائن بچھانے کیا بتدائی 180 میل کا حصہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

امریکہ نے نیشنل سیکیورٹی کونسل، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور سی آئی اے پر مشتمل ایک ورکنگ گروپ قائم کیا، جسے کیسپین کے خطے میں تیل اور گیس سے متعلق امریکی مفادات کا جائزہ لینا تھا۔ امریکہ نے ترکمانستان کو بتا دیا کہ وہ ایران میں سے پائپ لائن گزارنے کے لئے سرمایہ کاری کی مخالفت کرے گا، اس لئے وہ مغرب کی طرف توجہ کرے۔

ترکمانستان کے افسر ٹیکساس میں ہوسٹن کے دورے پر بریداس کے مدعو کرنے پر گئے اور پہلی مرتبہ یونوکال سے ملے۔

جون:

یونوکال کا وفد اشک آباد اور اسلام آباد گیا اور افغانستان پائپ لائین میں بریداس کی شرکت کے بارے میں بات چیت کی۔ بریداس نے ترکمانستان کی حکومت کو پائپ لائن کے قابل عمل ہونے کے بارے میں رپورٹ پیش کی۔

اگست:

MashalBooks.org

بریداس نے پشاور میں تیل اور گیس کے ذخائر کا پتہ چلایا، قندھار میں طالبان نے پہلی مرتبہ ملاقات کی، بریداس کے کرتا دھرتا کابل، ہرات اور مزار کے دورے پر گئے۔

21 اکتوبر:

صدر نیازدف نے نیویارک میں یونوکال اور ڈیلٹا سے افغان پائپ لائن سے متعلق معاہدے پر دستخط کیئے۔

دسمبر:

ترکمانستان نے بریداس کو کیمبر بلاک سے تیل برآمد کرنے سے دوسری بار منع کر دیا۔

1996ء

فروری:

بریداس نے افغان حکومت سے پائپ لائن بچھانے کے لئے معاہدہ کرلیا۔ بریداس نے ہوسٹن میں یونوکال اور ڈیلٹا کے خلاف ترکمانستان میں اس کے کاروبار میں دخل اندازی کے الزام میں مقدمہ درج کر دیا۔

مارچ:

امریکی سفیر ٹام سمنز، وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے کہتے ہیں کہ وہ یونوکال کو مکمل اختیارات دے دیں۔ بھٹو سمنز سے ان کی گستاخی پر معافی مانگنے کا تقاضا کرتی ہیں۔

اپریل:

بریداس ترکمانستان کے خلاف، معاہدے کی خلاف ورزی کی بنا پر کارروائی کا آغاز کرتی ہے۔ امریکہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری خارجہ رابن رافیل کابل دور قندھار کا دورہ کرتے ہیں۔

مئی:

ایران 100 میل لمبی ریلوے لائن کا، جو ترکمانستان اور ایران کو ملاتی ہے، افتتاح کرتا ہے۔ ترکمانستان، ازبکستان، پاکستان اور افغانستان ایک معاہدے پر دستخط کرتے ہیں،

MashalBooks.org

جس کے تحت ترکمانستان کو پائپ لائن بچھانے کے لئے کنسوریشم نامزد کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

اگست:

روس کی گازپروم یونوکال/ ڈیلٹا اور ترکمانستان کی ترکمان راس گاز سے پائپ لائن کے منصوبے کے بارے میں معاہدہ کرتی ہے۔ امریکہ کے نائب سیکرٹری خارجہ رابن رافیل افغانستان اور وسطی ایشیاء کا دورہ کرتی ہیں، وہ یونوکال پائپ لائن میں امریکہ کے مفاد کا ذکر کرتی ہیں۔

ستمبر:

یونوکال صدر نیازدف کو پائپ لائن سے متعلق تفصیلی رپورٹ پیش کرتی ہے۔ یونوکال کہتی ہے کہ وہ افغان جنگی سرداروں سے پراجیکٹ کی نگرانی کے لئے کونسل کے قیام پر رضامندی ظاہر کر دیں تو یونوکال انہیں انسانی بنیادوں پر امداد بھی دے گی۔

27 ستمبر:

طالبان نے کابل پر قبضہ کر لیا، امریکہ نے کہا کہ وہ جلد ہی افغانستان سے سفارتی تعلقات بحال کر لے گا۔

یکم ستمبر:

یونوکال نے کابل پر طالبان کے قبضے کی حمایت کا اظہار کیا اور کہا کہ اب پائپ لائن بچھانا آسان ہوگیا ہے۔ بعد میں اس نے انکار کر دیا کہ یہ بات اس نے نہیں کہی، اس سے غلط طور پر منسوب کی گئی ہے۔

26 اکتوبر:

صدر نیازدف اور یونوکال / ڈیلٹا معاہدے پر دستخط کرتے ہیں، جس کے تحت انہیں افغان پائپ لائین بچھانے کا حق مل جاتا ہے۔ پاکستان میں امریکہ کے سابق سفیر رابرٹ اوکلے یونوکال کی افغان ایڈوائزری کمیٹی کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے

ہیں۔

نومبر:

بریداس طالبان اور دوستم سے پائپ لائن تعمیر کرنے کے بارے میں معاہدہ کرتی ہے۔

9 دسمبر:

پاکستان کے سیکرٹری کارجہ نجم الدین شیخ قندھار میں طالبان سے پائپ لائن کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں۔

29 دسمبر:

ایران، ترکی، ترکمانستان، ایران کے راستے ترکی کے لئے ترکمان گیس کی فراہمی کے بارے میں معاہدہ کرتے ہیں۔ طے پاتا ہے کہ ترکی، ایران کے راستے آنے والی گیس خریدے گا۔

1997ء

20 جنوری:

ترکمانستان، موبل اور مانومنٹ آئیل سے تیل اور گیس کے ذخائر تلاش کرنے کا معاہدہ کرتا ہے۔

انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس عبوری حکم کے ذریعے بریداس کو کیمبرے سے تیل برآمد کرنے کا حق دے دیتا ہے۔ ترکمانستان اس حکم کو مسترد کر دیتا ہے۔ اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری جنرل یا سوشی اکاشی تیل کمپنیوں اور افغان جنگی سرداروں کو پائپ لائن کے منصوبوں کے تعلق میں ہدف تنقید بناتے ہیں۔

فروری:

طالبان کا ایک وفد واشنگٹن میں امریکہ سے طالبان کی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے کہتا ہے اور یونوکال سے ملاقات کرتا ہے۔ طالبان کا دوسرا وفد بریداس کے مہمان کے طور پر ارجن ٹائن کا دورہ کرتا ہے۔ واپسی پر طالبان، سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ شہزادہ ترکی

سے ملاقات کرتے ہیں۔

مارچ:

یونوکال قندھار میں اپنا دفتر اور افغانوں کی تربیت کے لئے مراکز قائم کرتی ہے۔ بریداس کابل میں دفتر قائم کرتی ہے۔ کارلوس بلگرونی کابل اور قندھار کا دورہ کرتے ہیں۔

8 اپریل:

طالبان کہتے ہیں کہ وہ اس کمپنی سے تیل کی پائپ لائن بچھانے کا معاہدہ کریں گے جو سب سے پہلے کام شروع کرے گی۔ یونوکال کے صدر جان ایملی کہتے ہیں کہ وہ طالبان کے بیان سے دنگ ہو کر رہ گئے ہیں۔

14 مئی:

ای سی او کی سربراہ کانفرنس اشک آباد میں ہوئی۔ پاکستان، ترکمانستان اور یونوکال تیل اور گیس پائپ لائنیں بچھانے کا معاہدہ کرتے ہیں اور طے پاتا ہے کہ کام اسی سال میں شروع ہو جائے گا۔

24 مئی:

طالبان نے مزارشریف پر قبضہ کر لیا لیکن چار روز بعد انہیں وہاں سے نکلنا پڑا، بھاری جانی نقصان الگ اٹھانا پڑا۔

4 جون:

پاکستان، ترکمانستان، یونوکال اور ڈیلٹا کے ورکنگ گروپ کا اسلام آباد میں پہلا اجلاس ہوا۔

8 جون:

یونوکال کے مارٹی ملر کا کہنا ہے کہ امن نہ ہوا تو پائپ لائن تعمیر کرنے میں برسوں لگ سکتے ہیں۔

MashalBooks.org

9 جون:

بریداس کے کارلوس بلگرونی طالبان کے لیڈروں سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بریداس سلامتی کی صورت حال میں کام کرنا شروع کرنے کے لئے تیار ہے۔ ساتھ ہی وعدہ کرتے ہیں کہ بریداس افغانستان میں سڑکوں کی تعمیر اور صنعتوں کے قیام میں مدد دے گی۔

22 جولائی:

ترکمان، امریکہ کاروبار کے مفادات کے فروغ کے لئے ایک نئی ایسوسی ایشن قائم کی جاتی ہے۔

23 جولائی:

پاکستان، ترکمانستان اور یونوکال ایک نئے معاہدے پر دستخط کرتے ہیں، جس کے تحت یونوکال کو منصوبے پر کام شروع کرنے کے لئے ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے اور طے پاتا ہے کہ کام دسمبر 1998ء میں شروع ہو جائے گا۔ یونوکال کے مارٹی ملر مزار، قندھار کا دورہ کرتے ہیں اور افغان گروپوں سے معیاد کی توسیع کے ضمن میں حمایت طلب کرتے ہیں۔

27 جولائی:

امریکہ کی پالیسی میں اہم تبدیلی آتی ہے، امریکہ کہتا ہے کہ وہ ترکمانستان سے ترکی تک ایران کے راستے پائپ لائن تعمیر کرنے پر اعتراض نہیں کرے گا، بعد میں امریکہ نے کہا کہ اس سے اس کے دوستوں کی مدد ہوگی۔ لیکن اس سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ امریکہ نے ایران کے بارے میں اپنا رویہ بدل لیا ہے۔

14 اگست:

شیل کے صدر ایلین پارسلے، نیازدف سے ملے اور ترکمانستان، ترکی پائپ لائن کے لئے امداد فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔

MashalBooks.org

28 اگست :

طالبان کہتے ہیں کہ بریداس نے یونوکال کے مقابلے میں پائپ لائن بچھانے کے لئے بہتر شرائط پیش کی ہیں۔ جلد ہی بریداس سے معاہدہ کر لیا جائے گا۔ یونوکال کا کہنا ہے کہ وہ کھیل میں بدستور شامل ہے۔

یکم ستمبر :

ترکمانستان کیسپئین کے ساتھ ساتھ پائپ لائن بچھانے کے لئے ٹینڈر کھولتا ہے۔ 57 سالہ نیازدف کا میونخ میں دل کا آپریشن ہوتا ہے۔ ان کی صحت اور ان کے جانشین کے بارے میں تشویش پائی جاتی ہے۔

5 ستمبر :

بریداس نے اپنی کمپنی کے لاطینی امریکہ میں 60 فیصد حصے آرامکو کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں، اب دونوں کمپنیاں مل کر کام کریں گی۔

12 ستمبر :

طالبان کا ایک پانچ رکنی وفد بریداس سے پائپ لائین کے سلسلے میں بات چیت کے لئے ارجن ٹائین گیا، پاکستانی حکام نے انہیں پانچ روز تک پشاور میں روکے رکھا اور انہیں جانے کی اجازت نہیں دی۔

15 ستمبر :

پاکستان نے یونوکال سے گیس کی قیمت کے بارے میں 30 سالہ معاہدہ کیا ہے۔ پاکستان 1000 مکعب فیٹ گیس کے ملتان پہنچنے پر 05۔2 ڈالر دے گا۔ 15 سینٹ طالبان کو رائیلٹی کے طور پر دینے کی پیشکش کی جو انہوں نے مسترد کر دی۔

16 ستمبر :

وزیراعظم نواز شریف صدر نیازدف سے پائپ لائن پراجیکٹ پر بات چیت کرنے کے لئے ایک دن کے لئے اشک آباد جاتے ہیں۔

MashalBooks.org

22 اکتوبر:

طالبان کا وفد اشک آباد جاتا ہے اور یونوکال کے گیس پائپ لائن پراجیکٹ کے بارے میں غور وفکر کے لئے پاکستان، ترکمانستان اور طالبان پر مشتمل سہ رکنی کمیشن کے قیام پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔

25 اکتوبر:

سنٹرل ایشیا گیس (سینٹ گیس) پائپ لائین لمیٹڈ اشک آباد میں قائم کی جاتی ہے۔ اس میں یونوکال کے 5۔46 فیصد، ڈیلٹا آئیل کے 15 فیصد اور ترکمانستان کے 7 فیصد، جاپان کی اٹوچو آئیل کے 5۔6 فیصد انڈونیشیا پٹرولیم (ان پیکس) 5۔6 فیصد، کریسنٹ گروپ 5۔3 فیصد، ہیونڈائی انجینئرنگ اینڈ کنسٹرکشن کمپنی 5 فیصد ہوں گے۔ گینزپروم بعد میں معاہدے پر دستخط کرے گی۔ یونوکال کے مارٹی ملر نے کہا کہ گیس کی ترسیل کی قیمت مقرر نہیں کی گئی ہے اور سینٹ گیس طالبان کے ساتھ معاہدے میں شریک نہیں ہوگی۔ طالبان نے بتایا کہ انہوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ کس کنسورشیم سے ملیں گے۔

28 نومبر:

طالبان کے وفد کی امریکہ کے لئے روانگی، جہاں وہ یونوکال سے شوگر لینڈ میں ملاقات کریں گے، بعد میں طالبان امریکہ کے محکمہ خارجہ کے افسروں سے ملیں گے۔

دسمبر:

یونوکال یونیورسٹی آف نبراسکا کو افغانستان میں ٹیکنیکل ٹرینگ پروگرام شروع کرنے کے لئے 9 لاکھ ڈالر کی امداد دیتا ہے۔ یہ پروگرام افغانستان میں شروع کیا جاتا ہے۔

29 دسمبر:

ترکمانستان اور ایران 120 میل لمبی گیس پائپ لائن کا افتتاح کرتے ہیں۔ یہ پائپ لائن ہر سال 3۔0 ٹریلین کیوبک فیٹ گیس کی ترسیل کا وسیلہ ہوگی۔

1998ء

6 جنوری:

پیرس میں بین الاقوامی مصالحتی عدالت بریداس کے حق میں مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے ترکمان حکومت کو کیمبر ریفائنری کے لئے مہیا کی جانے والی اشیاء کی قیمت کی ادائیگی کا حکم دیتی ہے۔ بریداس کو 47 ملین ڈالراور 3 ملین ڈالرمقدمے کے اخراجات کے طور پر دینے کا فیصلہ سناتی ہے۔

3 فروری:

گازیروم، یونوکال کنسوریشم سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے، اس کے دس فیصد کی ازسرنو تقسیم سے یونوکال کے حصے 45 فیصد ہو جاتے ہیں۔

3 مارچ:

آسٹریلیا کی بی ایچ پی کی سینٹریم نے وزیراعظم نوازشریف سے ملاقات کی اور ایران پاکستان گیس پائپ لائن کو تیزی سے بچھانے کے لئے زور دیا۔

11 مارچ:

اشک آباد میں یونوکال کے مارٹی ملر نے کہا کہ جب تک افغان جنگ جاری ہے، پائپ لائن پراجیکٹ کے لئے سرمایہ کاری ممکن نہیں ہوگی، چنانچہ اس پر عمل نہیں ہو سکے گا۔تعمیر کا کام اور مالی وسائل کی فراہمی اس سال ممکن نہیں۔ ترکمانستان کا اصرار ہے کہ کام جلد شروع کیا جانا چاہیے۔

30 مارچ:

2[tag] یونوکال کا پاکستان سے مطالبہ ہے کہ مالی وسائل کی فراہمی کے لئے اکتوبر 1998ء تک ایک سال کی مہلت دی جائے۔ افغانستان میں خانہ جنگی کے سب سے مقررہ وقت پر کام شروع اور ختم نہیں کیا جا سکتا۔

جون:

MashalBooks.org

یونوکال کے سالانہ اجلاس میں بعض حصہ دار افغان پائپ لائن کے لئے کمپنی کے منصوبوں کو اس بنا پر ہدف تنقید بناتے ہیں کہ طالبان نے انسانی حقوق کی پامالی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یونوکال کا موقف یہ ہے کہ اس نے 1995ء سے اس منصوبے پر دس سے پندرہ ملین ڈالر خرچ کئے ہیں اور وہ 1998ء کے دوران افغانستان میں مستحقین کی امداد کے لئے دس لاکھ ڈالر عطا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

21 اگست:

یونوکال پائپ لائین پراجیکٹ کو معطل کر دیتی ہے اور اسامہ بن لادن کے خلاف امریکہ کے مزائیلوں سے حملے کے بعد اسلام آباد اور قندھار سے اپنا عملہ واپس بلا لیں۔

10 ستمبر:

گرین تنظیم کے سرگرم کارکنوں نے مطالبہ کیا ہے کہ کیلیفورنیا کے اٹارنی جنرل انسانیت اور ماحول کے خلاف جرائم کرنے اور طالبان سے تعلق رکھنے کی بنا پر یونوکال کو ختم کر دیں۔ یونوکال نے ان الزامات کو مضحکہ خیز قرار دیا ہے۔

5 اکتوبر:

فورٹ بینڈ کاونٹی میں ٹیکساس ڈسٹرکٹ کورٹ نے یونوکال کے خلاف بریداس کا 15 بلین ڈالر کے ہرجانے کا مقدمہ خارج کر دیا ہے۔ بریداس نے یونوکال پر الزام لگایا تھا کہ اس نے بریداس کو ترکمانستان کی گیس فیلڈ کو ترقی دینے سے روک دیا تھا۔ مقدمہ اس بنا پر خارج کیا گیا کہ اس پر ٹیکساس کا قانون نہیں بلکہ ترکمانستان اور افغانستان کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔

23 ستمبر:

یونوکال نے 9۔2 بلین ڈالر کے پراجیکٹ سے علیحدگی اختیار کر لی، جو ترکمانستان سے قدرتی گیس ترکی پہنچانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ فیصلہ کمپنی نے مصارف میں کمی کرنے کی بنا پر کیا۔

4 دسمبر:

یونوکال نے تیل کی کم قیمتوں، افغانستان میں اسامہ بن لادن کے بارے میں تشویش اور امریکی خواتین کے گروپوں کے دباؤ کے پیش نظر افغان پائپ لائین کنسورشیم سے علیحدگی اختیار کر لی۔

22 دسمبر:

یونوکال نے تیل کی کم قیمتوں کی بنا پر 1999ء کے لئے اپنے مصارف میں 40 فیصد کمی کا اعلان کر دیا۔

1999ء

24 جنوری:

ترکمانستان کے وزیر خارجہ شیخ مرادوف پاکستان کا دورہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ پائپ لائن پراجیکٹ برقرار ہے۔

فروری:

کارلوس بل گہرونی، ترکمانستان، قازقستان اور روس کا دورہ اور ان ملکوں کے لیڈروں سے بات چیت کرتے ہیں۔

3 مارچ:

ترکمانستان کے وزیر خارجہ شیخ مرادوف ملا عمر سے پہلی مرتبہ قندھار میں ملتے ہیں اور ان سے گیس پائپ لائین کے سلسلے میں بات چیت کرتے ہیں۔

مارچ:

شمالی اپشرون آپریٹنگ کمپنی تیل کی قیمتوں میں کمی کی بنا پر آذربائیجان میں اپنا کاروبار بند کر دیتی ہے۔ یونوکال اور ڈیلٹا، جو اس کے پارٹنر تھے، علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔

29 اپریل:

پاکستان، ترکمانستان اور طالبان پائپ لائین پراجیکٹ کو پھر سے شروع کرنے کے لئے

اسلام آباد میں معاہدے پر دستخط کرتے ہیں۔
12 مئی:
طالبان کا وفد ترکمانستان سے گیس اور بجلی خریدنے کے لئے معاہدہ کرتا ہے۔

MashalBooks.org